سرورق پہلے والا ہے، بیک ٹائٹل پر دیا گیا میٹر ۲۰۱۴ء کا ہے

حیدر قریشی کی اب تک کی کتابیں

(یہ کتابیں مختلف شعری، نثری اور نثری و شعری مشترکہ کلیات کے کتابی اور انٹرنیٹ ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہیں)

تخلیقی ادب

سلگتے خواب (غزلیں) — **عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)

محبت کے پھول (ماہیے) — **دعائے دل** (غزلیں، نظمیں)

درد سمندر (غزلیں، نظمیں، ماہیے) — **زندگی** (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے) — **قصے کہانیاں** (افسانے)

میری محبتیں (خاکے) — **کھٹی میٹھی یادیں**

فاصلے قربتیں (انشائیے) — **سوئے حجاز** (عمرہ و حج کا سفرنامہ)

....

تنقید و تبصرے

حاصلِ مطالعہ — **تاثرات** — **مضامین اور تبصرے**

ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ما بعد جدیدیت

ستیہ پال آنند کی "......بودنی نابودنی"

....

اردو ماہیا تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری.....اردو ماہیے کی تحریک.....

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

اردو ماہیا...........اردو ماہیے کے مباحث

....

حالاتِ حاضرہ (انٹرنیٹ کالموں کے مجموعے)

منظر اور پس منظر — **خبر نامہ**

ادھر اُدھر سے — **چھوٹی سی دنیا** (صرف ای بک)
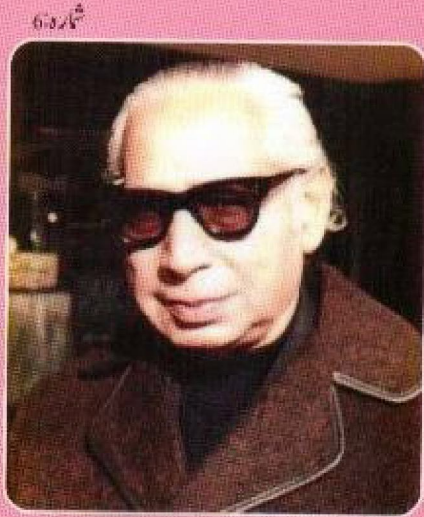
سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:6 (جنوری تا جون 2006ء)

سجّاد ظہیر نمبر

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

1-Haider Qureshi Rossertstr.6 , Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

2-Prof. Nazar Khaleeq H.No.99-B,Block Z, Satelite Town Khanpur-64100,(Pakistan)

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de اور khaleeqkhanpur@yahoo.com

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
گفتگو ۱	حیدر قریشی	۵
گفتگو ۲	علی احمد فاطمی	۹
آئینہ حیات		۱۱
بہ مرگ من یاد آر سجاد ظہیر	پروفیسر مجنوں گورکھپوری	۱۵
فکر وعمل کا مخلص رہنما	سید احتشام حسین	۲۰
ایک انسان جو نہیں مرا	خواجہ احمد عباس	۲۴
سجاد ظہیر۔ایک ادیب ایک تحریک	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۳۱
سجاد ظہیر۔ہمارے بنّے بھائی	حمایت علی شاعر	۳۹
سجاد ظہیر۔ایک نام،ایک عہد اور ایک تحریک	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۴۵
کچھ احوال سید سجاد ظہیر کا اور ان کے دو خط	سلطان جمیل نسیم	۵۱
سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک	پروفیسر قمر رئیس	۶۷
سجاد ظہیر ایک مثالی رہنما	ضیاء الحق	۷۳
نقش قدم تو زندہ ہیں	صدیق الرحمٰن قدوائی	۷۸
سجاد ظہیر: ایک تحریک،ایک تاریخ	پروفیسر علی احمد فاطمی	۸۰
سجّاد ظہیر	شاہد نقوی	۸۸
ترقی پسند تنقید اور سجاد ظہیر	سید محمود الحسن	۹۱
افکار کے سجاد ظہیر نمبر پر ایک نظر	پروفیسر نذر خلیق	۹۶
سجاد ظہیر کی تخلیقی جہات	جمال نقوی (پاکستان)	۱۰۰
لندن کی ایک رات ’ایک جائزہ‘	ڈاکٹر صالحہ زرین	۱۰۵
لندن کی ایک رات میں دن کا تصور	ممتاز انور	۱۱۰
میرے حصہ کی روشنائی	نور ظہیر	۱۱۵
’’ابّا کو غصّہ کیوں آنے لگا‘‘	ثروت خان	۱۲۲
سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک	عبدالقیوم شمسی	۱۲۷

دیگر

فراق سے انٹرویو	علی احمد فاطمی	۱۳۲
بنّے بھائی	جگن ناتھ آزاد	۱۳۵

سجاد ظہیر کی نگارشات سے انتخاب

نظمیں

آج رات	سجاد ظہیر	۱۳۷
ویتنام-----زخموں کا باغ	سجاد ظہیر	۱۴۰

مضامین

سر آمد روزگارے	سجاد ظہیر	۱۴۳
شعرِ محض	سجاد ظہیر	۱۴۶

کہانیاں

جنّت کی بشارت	سجاد ظہیر	۱۶۰
دُلاری	سجاد ظہیر	۱۶۴

خصوصی مطالعہ

جوگندر پال سے گفتگو	ڈاکٹر غضنفر اقبال	۱۶۸
مشفق خواجہ	ڈاکٹر انور سدید	۱۷۴

ماہیے:

خاور اعجاز کے ماہیے		۱۸۱
فراز حامدی کے ماہیے		۱۸۳
ناصر نظامی	اکمل شاکر	۱۸۵
سنجئے گوڑ بولے کے ماہیے		۱۸۶

کتاب گھر

کتاب گھر ۱۸۷

تبصرے: انگلستان، میرا انگلستان (یعقوب نظامی)، کھلا آسمان (فیاض ناروی)، شور بادبان (اکبر حمیدی)

کتاب میلہ: ماریشس میں دھنک (قمر علی عباسی)، سفید جنگلی کبوتر (منور رانا)، تین ترقی پسند شاعر (علی احمد فاطمی)، جب ایسا ہو (سید ظفر ہاشمی)، خواب خوش رنگ (سعید روشن)

آپ کے خطوط اور ای میلز

آپ کے خطوط اور ای میلز ۱۹۳

ناصر عباس نیر، احمد ہمیش، جوگندر پال، سیف اللہ سیفی، مصطفیٰ شہاب، پرویز مظفر، کاوش پرتاپ گڑھی، اکمل شاکر، اکبر حمیدی، فیصل عظیم، سہیل احمد صدیقی، سعید شباب، رئیس الدین رئیس، ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، ڈاکٹر لڈمیلا واسلویا، افضل عباس، محمد فیروز شاہ۔

''سجاد ظہیر نے عہد حاضر کی دانشورانہ اور ادبی زندگی میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان میں ان کی نگارشات سے زیادہ انکا اثر اور انکی وجدان آفرین صلاحیت کو اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ اثر اتنا گہرا اور اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ اسے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی دانشورانہ یا نظریاتی عظمت کا رعب نہیں جمایا دوسروں پر انھوں نے اپنی رائے مسلط نہیں کی۔'' (**فیض احمد فیضؔ**)

''وہ ایک ایسا سپاہی تھے جو توپ و تفنگ سے نہیں پھولوں کی چھڑیوں سے لڑے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے اصلی دشمن ہمارے تیج تیوہار نہیں۔ ہم پر حکومت کرنے والے انگریزوں نے ہی برسوں ہمیں یہی یقین دلایا کہ ہمارے دشمن ہمارے مذہبی تو ہم ہماری تہذیب کی تاریک اور جاہلانہ رسومات ہیں تا کہ ہم اپنی ساری روایات سے متنفر ہو کر ان کی پرچھائیں بن جائیں۔ اپنا ماضی ٹھکرا کر انکی پوجا کریں۔ بنّے بھائی جانتے تھے کہ ہمارے اصل دشمن کون ہیں۔ وہ اقتصادی اور سیاسی مجبوریاں جو ہمارا مقدر بنی ہوئی تھیں۔'' (**عصمت چغتائی**)

گفتگو(۱)!

اردو میں جدیدیت اور ترقی پسندی کی تحریکیں لگ بھگ نصف صدی سے ایک دوسرے کی ضد سمجھی گئی ہیں اوران کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کے کئی واقعات ادب کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ پھر کیا بات ہوئی کہ جدید ادبی رویوں سے منسوب ایک ادبی رسالہ ترقی پسند تحریک کے بانی کا خاص نمبر شائع کرنے جا رہا ہے؟اس کی کئی وجوہات اور جواز ہیں۔ان میں سے ایک جواز علامہ اقبال کے حوالے سے عمومی طور پر جانا تو جاتا ہے لیکن اسے مناسب طور پر نمایاں نہیں کیا جاسکا اور دو جواز جو کسی حد تک چونکانے والے ہیں۔ایک ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے ہے اور ایک صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف کے حوالے سے لیکن پہلے اپنے حوالے سے ایک عرض۔

میری ذاتی زندگی ایک مزدور کی زندگی ہے اور اس طبقہ کی سب سے موثر نمائندگی ادب میں ترقی پسند ہی کرتے ہیں،سواس لحاظ سے میں خود ساری زندگی عملی طور پر ایک ترقی پسند کی زندگی جیا ہوں۔ بہت سارے ایسے ترقی پسندوں کے برعکس جو ائیر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر غریبوں،مزدوروں،کسانوں کے دکھوں کا حل ڈھونڈتے رہے، میں نے ایک مزدور کی زندگی بسر کر کے براہِ راست زندگی کے بھوگ اور تخلیق کے روگ کو سمجھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب کے روایتی،ترقی پسند اور جدید ادوار میں ادب کی مقبولیت کا زمانہ طے کیا جائے تو یقیناً ترقی پسند تحریک کا دور اس لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے کہ اس دور میں اردو ادب کے جتنے بڑے اور اہم شاعر و ادیب پیدا ہوئے بعد میں اتنی کثرت سے اتنے اہم اور بڑے شاعر و ادیب سامنے نہیں آ سکے۔تب ادب کے عام قارئین کثرت سے موجود تھے۔ادب فہمی صرف ادیبوں کا مسئلہ نہیں تھا۔اس میں قارئین بھر پور طور پر شریک ہوتے تھے۔ادب کا معمولی سا قاری بھی آج کے کئی شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ ادبی تربیت کا حامل ہوتا تھا۔اس لحاظ سے یقیناً ادب کا زندگی سے براہِ راست تعلق تھا۔جدید ادب کی بہت سی خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے بہت سارے تخلیق کار داخلیت کے نام پر اپنے اندر اس حد تک چلے گئے کہ باہر کی دنیا سے بالکل ہی لاتعلق ہو گئے۔ان کے اس رویے سے دو بڑے نقصان ہوئے ایک تو یہ کہ ادب کے ساتھ قاری کا رشتہ ترقی پسندوں نے جتنا مضبوط بنا دیا تھا وہ بالکل ہی کمزور ہو کر رہ گیا۔نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔دوسرا یہ کہ ادب میں داخلیت کے نام پر جعلی لکھنے والوں کی یلغار ہوگئی۔کسی بھی اول فول لکھنے والے کی کسی تحریر میں جدید نقاد نے فلسفیانہ معانی کے دریا بہا دیے۔چنانچہ پھر ایسے ناقدین میں سے بعض نے سوچا کہ اگر ہم جسے چاہیں میرا جی کا یا کسی اور بڑے شاعر اور ادیب کا ہم پلّہ بنا سکتے ہیں تو پھر اصل کمال تو ہماری تنقید کا ہوا۔سو اصل فنکار تو ہم ہوئے۔اس سوچ نے مابعد جدیدیت کے ان ناقدین کی دوکان کھول دی جنھوں نے صاف کہہ دیا کہ مصنف کی موت ہوگئی ہے اور اب قاری تخلیق کا جو مطلب سمجھے گا وہی اصل مطلب ہوگا۔''بدقسمت مصنف'' کو اتنی وضاحت

کا حق بھی نہیں ہوگا کہ وہ بتا سکے کہ بھائی! آپ جو معانی اخذ کر رہے ہیں بجا سہی۔۔لیکن میرے پیش نظر اس کا یہ معنی تھا۔ مجھے یہ حق ادیب کے طور پر نہ سہی چلو اپنی تخلیق کا سب سے پہلا قاری ہونے کی حیثیت ہی سے عنایت فرما دو۔لیکن مابعد جدید نقاد نے تخلیق کار کا اپنی تخلیق کا پہلا قاری ہونے کا حق بھی سلب کر لیا کہ اس کے بغیر اس کی تنقید کی دوکان کیسے چل سکتی۔سو مابعد جدید تنقید نے ساری اہمیت اپنی مرضی کے قاری کو عطا کر دی اور تخلیق کے مطالعہ کے اس کھیل کا یہ قاری کون ہے؟ صرف وہی مابعد جدید نقاد جو پہلے جدیدیت کے نام پر جعلی شاعروں اور ادیبوں کو تمغے بانٹ چکا تھا اور اب ادب کا قاری بن کر شاعر اور ادیب کو ادب سے بے دخل کر کے کلی طور پر سلطنت ادب پر قابض ہونا چاہتا ہے۔سو یوں جدید اور ترقی پسندی کی کشمکش ادب کو اس مضحکہ خیز عملی صورتحال تک لے آئی۔آج یہ حال ہے کہ جعلی شاعروں اور ادیبوں کی بھر مار ایک طرف ہے تو دوسری طرف نقاد کو پیسے دے کر انتہائی کمزور یا جعلی لوگوں پر مضامین لکھوانے کی حیران کن خبریں بھی سننے میں آنے لگی ہیں۔ بے شک ادب میں اس قسم کی تھوڑی بہت کرپشن ایک عرصہ سے کسی نہ کسی رنگ میں چل رہی ہے لیکن تخلیق کار کے مقابلہ میں نقاد کو پیسے دے کر لکھوانا ادب میں نقاد کی بالا دستی کے مابعد جدید تصور پر مبنی محض ''تماشائے اہلِ قلم'' ہے۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے،اب دوسری طرف دیکھتے ہیں۔ترقی پسند تحریک زندگی کے مسائل پر بات کرتے ہوئے عملاً اتنی زیادہ خارجیت پسند ہوئی جا رہی تھی کہ انسان کے باطن سے اور روح کے اسرار سے اسے جیسے کوئی غرض نہ رہی تھی۔ پھر ایک مخصوص نظریہ کی پیروی پر اصرار سے کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔تخلیق کار کی آزادی نظریے کی اطاعت گزاری پر مجبور کر دی گئی،نظریے کی پیروی کرنے والے تھرڈ کلاس سے بھی گئے گزرے تخلیق کاروں کو بانس پر چڑھایا جانے لگا اور پارٹی لائن کی پابندی سے انکار کرنے والوں لیکن کھرے اور سچے تخلیق کاروں کو نہ صرف نظر انداز کیا جانے لگا بلکہ ان کے ادبی سطح پر سوشل بائیکاٹ کے فیصلے بھی کیے گئے۔ یہ المیے ہمارے ادب کی تاریخ کا افسوسناک حصہ ہیں۔ بہت سارے ایسے لکھنے والے تھے جو ذہنی طور پر،اپنے طبعی میلان کے لحاظ سے اور فکری طور پر ترقی پسند تحریک کے اصل الاصول سے اتفاق رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ تخلیقی لمحہ میں اپنے اندر کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔لیکن نظریے اور تنظیم سے مکمل فرمانبرداری کے بے جا مطالبہ نے اپنے دوستوں کو بھی خود سے دور کیا اور یہ رویہ خود تحریک کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کو عام طور پر ترقی پسند تحریک کا مخالف شمار کیا جاتا ہے،قطع نظر اس سے کہ ان کے نزدیک وسیع تر زندگی اور اس سے بھی وسیع تر کائنات کے اسرار پر غور و فکر کرنا زیادہ اہم رہا ہے اور ترقی پسند رویہ زندگی کی صرف ایک قاش کو سامنے لاتا ہے۔۔۔تاہم ترقی پسند اہلِ علم کے لیے ایک حقیقت کو ذرا واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ترقی پسندی کی بنیاد جس مارکسزم پر تھی،اس کی بنیاد ہیگل کی جدلیات پر تھی۔کارل مارکس نے ہیگل کی جدلیات کو جس طرح اقتصادی حوالے سے ایک فعال اور متحرک روپ دیا (جس سے کل تک امریکہ لرزاں رہا ہے) ریاض

صدیقی کی ایک تحریر کے مطابق ہیگل کی اسی جدلیات کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر وزیر آغا نے ثقافتی سطح پر اسے اردو شاعری پر منطبق کیا ہے۔ان کے اس اہم کام کا ثبوت ان کی تصنیف ''اردو شاعری کا مزاج'' ہے۔اگر ہمارے پڑھے لکھے ترقی پسند نقادوں نے (ذاتی دشمنی کی سطح سے بلند ہو کر) اس کام کی اہمیت کو جانچا ہوتا تو شاید وزیر آغا کو اس طرح ترقی پسندوں کا دشمن ثابت نہ کیا ہوتا۔ترقی پسندوں کے تنظیمی سطح کے فرقہ پرستانہ رویے نے ہی دراصل اس تحریک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔اگر اب نو ترقی پسندی کی لہر توانا ہونے لگی ہے تو اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے تھیسس کو اس کے اصل ماخذ کے حوالے سے از سر نو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ریاض صدیقی اور رشید امجد جیسے معتبر ترقی پسند لوگ تفہیم کے اس کام کو زیادہ بہتر طور پر آگے بڑھا سکتے ہیں۔یہ ترقی پسندوں کا انتہائی قیمتی ادبی اور ثقافتی اثاثہ ہے جسے انہیں خود مزید دریافت کرنا ہوگا۔ڈاکٹر وزیر آغا اپنی بعض تحریروں میں ترقی پسند تحریک کو خود جدیدیت کی تحریک کی ایک ثانوی تحریک قرار دے چکے ہیں،ان کی امتزاجی تنقید بھی مارکسی تنقید،ارضی ثقافتی تحریک کی تنقید اور ترقی پسند روایت سے منسلک دوسرے تنقیدی رویوں سے بھی اتنا ہی استفادہ کر سکتی ہے جتنا دوسرے داخلی رویوں والی تنقیدوں سے۔سو یوں دیکھا جائے تو جنہیں مخالف کہا جا رہا ہے دراصل وہ مخالف نہیں ہیں،بس ان کے بات کرنے کا،سمجھنے کا اور سمجھانے کا اپنا انداز ہے۔

صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف نے حالیہ دنوں میں کثرت کے ساتھ روشن خیالی اور ترقی پسندی پر زور دیا ہے۔یقیناً جنرل پرویز مشرف نے ان الفاظ کو ان کے پورے فکری تناظر میں جانتے ہوئے کہا ہوگا جو خوشکن بات ہے۔ہمارے ایک فوجی حکمران میں ادب فہمی کی اتنی سوجھ بوجھ ہے کہ وہ لگ بھگ اٹھارویں صدی کی Enlightenment کی مغربی تحریک (جو ہمارے ہاں انیسویں صدی میں آئی) کو بھی جانتے ہیں اور اردو ادب میں اور برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے نصف میں نمایاں ہونے والی ترقی پسند تحریک کو بھی جانتے ہیں۔یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ابتدائی جمہوری زمانہ میں پاکستان میں ترقی پسندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ہمارے کئی شاندار شاعر اور ادیب حکومت کے خوف سے پاکستان چھوڑ کر انڈیا میں جا بسے اور وہاں ان کے فن کو نہ صرف انڈیا بھر میں تسلیم کیا گیا بلکہ پاکستان میں بھی ان کی ادبی قدر و منزلت ہوئی۔جو لوگ انڈیا نہیں جا سکے ان میں سے کئی ایک نے جیل کی ہوا کھائی۔خفیہ والوں نے ان کا جینا حرام کر دیا۔یہ سب کچھ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ہماری تاریخ میں یہ عجیب سی بات بھی ہے کہ پاکستان میں وقتاً فوقتاً فوج جس طرح اقتدار میں آتی رہی ہے،اس کی ابتدا کا داغ بھی ترقی پسندوں پر لگتا ہے۔۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس کے ملزمان میں جنرل اکبر کے ساتھ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر جیسے معتبر ترقی پسند شامل تھے۔اب یہ ترقی پسند تحریک کی بدقسمتی تھی کہ انقلاب ناکام ہوا اور بغاوت و سازش قرار پایا۔اس کیس میں اپنی قید بھگتنے کے بعد سجاد ظہیر انڈیا چلے گئے۔حالانکہ برصغیر میں ترقی پسندوں کا رویہ کبھی بھی اس انداز کا نہ تھا لیکن شاید تب کی پاکستان کی جمہوری حکومتوں کی افسوسناک

پابندیوں اور سختیوں سے نالاں ہو کر ہی ہمارے ان معتبر ترقی پسندوں نے جنرل اکبر کا ساتھ دینا گوارا کر لیا۔

اور اب وطنِ عزیز کی تاریخ اس موڑ پر ہے کہ جنرل پرویز مشرف خود ترقی پسندی کی تلقین کر رہے ہیں۔انڈیا میں پنڈت جواہر لال نہرو ترقی پسندوں کے بڑے حامی تھے اور وہی دور انڈیا میں عمومی طور مذہبی رواداری کا دور تھا۔ان کے بعد اب جنرل پرویز مشرف نے ترقی پسندی کی بات کی ہے تو خوشگوار حیرت کا احساس ہوا ہے۔جواہر لال نہرو کے مقابلہ میں جنرل پرویز مشرف کس حد تک ترقی پسند ثابت ہوتے ہیں؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔تاہم یہ سارے عوامل میرے ذہن میں تھے جب برادرم علی احمد فاطمی نے سجاد ظہیر نمبر کی اشاعت کا مشورہ دیا۔اور اب سجاد ظہیر نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس نمبر کو مرتب کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لی تھی۔تاہم میں نے اپنے طور پر بھی چند ادیبوں سے براہِ راست مضامین حاصل کیے۔فاطمی صاحب کے فراہم کردہ مضامین میں سے کون سے مضامین تازہ ہیں اور کون سے مطبوعہ،اس کی نشاندہی نہیں ہو سکی تاہم اتنی وضاحت ہو گئی ہے کہ مطبوعہ مضامین کراچی میں مقیم ترقی پسند نقاد پروفیسر عتیق احمد صاحب کی کتاب ''سجاد ظہیر ۔تخلیقی اور تنقیدی جہات'' سے لیے گئے ہیں۔سو ادارہ جدید ادب پروفیسر عتیق احمد صاحب کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے کہ ان سے کوئی رابطہ ہوئے بغیر انڈیا کے ایک دوست کے توسط سے ہم نے ان کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔پورے حوالہ جات یہاں دستیاب ہوتے تو میں ہر ماخذ کا حوالہ درج کرتا۔بہر حال دوست احباب اور بالخصوص ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے تعاون سے جو کچھ ممکن ہو سکا اس نمبر میں پیش خدمت ہے۔کینڈا کے ڈاکٹر بلند اقبال اور سردار علی صاحب کا بھی شکریہ کہ اس نمبر کی تکمیل میں ان کا بھی تعاون حاصل رہا۔

میں نے اس نمبر کی اشاعت کے جواز میں شروع میں علامہ اقبال کا بھی حوالہ دیا تھا۔اس جواز کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے۔اور وہ ہے ترقی پسند تحریک سے چند برس پہلے علامہ اقبال کے ہاں کیمونسٹ روس کی فکر کے اثرات اور ان کا برملا اظہار۔علامہ اقبال کی نظمیں 'فرشتوں کا گیت' 'خدا کا خطاب' اور 'لینن خدا کے حضور میں' اس کی روشن مثال ہیں۔داخلی سطح پر دیکھا جائے تو اقبال کے ہاں اس فکر کے ڈانڈے اسلام میں انقلابی اور ترقی پسند سوچ کی 'بوذریؓ فکر' سے جا ملتے ہیں،یوں اسلام اور ترقی پسندی کے مشترکہ رویوں کو با آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ترقی پسند تحریک سے مخلصانہ وابستگی رکھنے والوں کو ایک طرف تحریک کی خامیوں کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے،دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا کی نشان زد کی گئی فکر کے حوالے سے از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔تو علامہ اقبال کے ہاں ترقی پسند تحریک سے پہلے کی ترقی پسند اپروچ کے فکری و روحانی ماخذ تک پہنچنے اور اس پر مزید کام کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔امید ہے سجاد ظہیر نمبر اہلِ ادب کی سوچ کو متحرک کرنے کا باعث بنے گا۔

جدید ادب کا اگلا شمارہ حسبِ معمول ہوگا۔ **حیدر قریشی**

گفتگو (۲)!

جدید ادب کا یہ شمارہ ترقی پسند تحریک کے بانی، ادیب، ناقد، شاعر، دانشور سجاد ظہیر (۱۹۰۵-۲۰۰۵) کے نام معنون ہے۔ یہ سال (۲۰۰۵) ہی ان کے نام سے منسوب ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ امسال سجاد ظہیر کی صدی تقریبات اہتمام سے منائی گئیں اور منائی جا رہی ہیں۔ ہندو پاک ہی نہیں پوری اردو دنیا لندن، کینڈا میں بھی سجاد ظہیر سے متعلق سیمینار کئے گئے اور مختلف انداز سے انھیں یاد کیا گیا۔ جدید ادب بھی اپنے آپ کو اس صف میں کھڑا پا کر مسرت اور افتخار محسوس کر رہا ہے۔

گذشتہ بڑے ادیبوں اور فنکاروں کو یاد کرنا ہماری روایت رہی ہے، ہماری تہذیب اور کبھی کبھی ہماری ضرورت بھی۔ لیکن یاد کرنے کے طریقے الگ الگ ہوا کرتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی خاص موقع پر ان کی تصویر پر گلہائے عقیدت پیش کر دیں شمع روشن کر دیں دعائے مغفرت کریں اور بس۔۔۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم باقاعدہ سیمینار جلسے وغیرہ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ ان کے کاموں کا از سر نو جائزہ لیں اور آج کے تناظر میں ان کی ضرورت معنویت اور اہمیت کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ یہ سچ ہے کہ سجاد ظہیر کی شخصیت اس قدر پرکشش اور مقناطیسی کیفیت رکھتی تھی کہ اکثر ہم عصر ان کی دلنواز شخصیت کے ہی گن گاتے نظر آتے ہیں۔ جسکی وجہ سے ان کے تخلیقی و تنقیدی ادب کو اس طرح نہیں جانچا پرکھا گیا جس کی بڑی ضرورت تھی۔ لیکن حال کے کئی سیمناروں میں مقالوں اور کتابوں میں ان کی شخصیت پر کم ادب پر باتیں زیادہ ہوئیں۔ نئے لوگ جنھوں نے سجاد ظہیر کو نہیں دیکھا یا کم دیکھا ان کے سامنے تو ان کا سرمایۂ ادب ہی ہے۔ یہ اچھی بات ہے اور اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہوئی کہ دوسری زبانوں کے بالخصوص ہندی کے ادیب و ناقد اپنے ڈھنگ سے اور آج کے حوالے سے ان کے کاموں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا رویہ راست و معروضی ہے وہ جذباتی کم ہوتے ہیں اور اب ہمیں بھی جذباتی ہوئے بغیر یہ سوچنا چاہئے کہ شعر و شاعری میں ڈوبے ہوئے اردو ادب میں سجاد ظہیر اپنے تخلیقی سفر کا آغاز فکشن سے کیوں کرتے ہیں؟ کیا انگارے کے افسانوں کو فنی اعتبار سے کمزور کہہ کر نظر انداز کر دینا چاہئے؟ یا مخصوص اصلاحی روایت سے منحرف ہو کر اسے ایک باقاعدہ احتجاجی ادب کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہئے۔ کم سے کم اردو افسانے کے حوالے سے۔ اسی طرح لندن کی ایک رات کو محض شعور کی رو کے حوالے سے اس کے فن کی تعریف کر کے آگے بڑھ جانا چاہئے یا اس کی تاریکی میں چھپی روشنی اور خاموشی میں زندگی کی ہلچل کو بھی محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ قدامت اور کلاسیکیت کے بہت حامی نہ ہونے کے باوجود سجاد ظہیر ذکر حافظ جیسی کتاب کیوں لکھتے ہیں؟ تمام تر صوفیانہ روایات کا احترام کرنے کے باوجود یہ ترقی پسند ادیب حالی، شبلی، آزاد وغیرہ کی احیا پسندی سے کہاں الگ ہوتا ہے۔

اس کے باوجود وہ اپنی کانفرنس کی صدارت پریم چند جیسے مصلح اور آدرش وادی سے کرواتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادب کو سیاست، جمہوریت، فسطائیت وغیرہ سے دور رکھنے والے ادیبوں کو یہ تحریک کیا پیغام دیتی ہے۔ عالمی ادیبوں کی مثالوں سے ہمیں کیا درس ملتا ہے۔ کس طرح رومان حقیقت اور حقیقت رومان میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اور حقیقت کی یہ معرفت کس طرح ہمیں آج کی پیچیدہ اور بے رحم حقیقتوں سے جوڑتی ہے۔

آج ہم ایک بار پھر بدلی ہوئی شکل میں فسطائیت، صارفیت اور عالم کاری کے نظام میں داخل ہو چکے ہیں۔ تشدد اور فرقہ واریت کے مکڑ جال میں ہم بری طرح الجھ چکے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ادیب اور دانشور اپنا ادیبانہ اور دانشورانہ رول بھی فراموش کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں وہ ادیب و شاعر یاد آئیں گے جنھوں نے اپنا عیش و آرام قربان کر کے انسانیت و جمہوریت کی بقاء کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ سجاد ظہیر انھیں لوگوں میں سے ایک ہیں۔ وہ چاہتے تو کیا سے کیا ہو سکتے تھے۔ مغرب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مشرق کے عام انسانوں۔ مزدوروں اور مفلسوں کے لئے نہ صرف کام کرنا بلکہ قلم اور قدم کے ذریعہ پوری ایک تحریک و تاریخ ترتیب دے دینا ایک یادگار اور ناقابل فراموش عمل تو ہے ہی۔ اس لئے سجاد ظہیر کو یاد کرنا اس پوری دانشورانہ تہذیب اور تاریخ کو یاد کرنا ہے جو صدیوں سے ہمارے صوفیوں، درویشوں اور دانشوروں کا کردار رہا ہے۔ ہمیں اس کردار اور جرأت کو پھر سے زندہ کرتے ہوئے اس آرٹ کلچر اور انسانیت کو بچانا ہے جس کے لئے ہمارے یہ بزرگ اپنا سب کچھ قربان کر گئے۔ جدید ادب کا یہ مختصر سا شمارہ اسی بڑی حقیقت کا چھوٹا سا اظہار ہے لیکن یہ احساس ضرور ہے کہ ہم بھی اس صف میں کھڑے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے خوشی ہے کہ جدید ادب کے مدیر اور ممتاز شاعر و دانشور جناب حیدر قریشی نے میری تجویز پر غور کیا اور یہ ذمہ داری مجھ پر سونپ دی۔ ہر چند کہ یہ شمارہ سجاد ظہیر کے شایان شان نہیں تاہم ایک قدم ضرور ہے جو ترقی پسند قلم کو مضبوط بنانے کے لئے اٹھایا گیا ہے۔

علی احمد فاطمی (مہمان مدیر)

''ضروری نہیں کہ آپ ہر شعر میں انقلاب زندہ باد کہیں۔ اگر آپ جمالیاتی طور پر کسی ایک شخص کو ہیلدی بناتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب سے دس ہزار گنا اچھی بات ہے۔ اس طرح آپ کچھ ایسا کریں کہ انسان جو آپ کے آس پاس ہے وہ صحت مند بنے۔ حسن کے اعتبار سے، جذبے کے اعتبار سے، انسانیت کے اعتبار سے وہ مریض نہ بنے۔'' **مجروح سلطانپوری**

عصری ادب ص ۴۷، بحوالہ کتاب

تین ترقی پسند شاعر از پروفیسر علی احمد فاطمی

آئینہ حیات

نام : سید سجاد ظہیر

ادبی نام : سجاد ظہیر (بنے بھائی)

والد کا نام : سر سید وزیر حسن (۱۸۷۴ء-۱۹۴۷ء)

والدہ کا نام : سکینہ الفاطمہ عرف سکن بی بی

تاریخ ولادت : ۵ نومبر ۱۹۰۵ء

بھائی بہنوں کے نام:
سید علی ظہیر
نور فاطمہ (مسز سید عبدالحسن ولد پروفیسر نورالحسن)
سید حسن ظہیر
سید حسن ظہیر
نور زہرہ (مسز نظیر حسن)
سید سجاد ظہیر
سید باقر ظہیر

شادی : ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو خان بہادر سید رضا حسین کی بڑی بیٹی رضیہ دلشاد سے اجمیر میں ہوئی۔

اولاد :
نجمہ ظہیر باقر
نسیم بھاٹیہ
نادرہ ظہیر ببر
نور ظہیر گپتا

تعلیم :
میٹرک ۔۔ گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ ۱۹۲۱ء
بی ۔اے ۔لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۲۶ء
ایم ۔اے ۔آکسفورڈ یونیورسٹی

بار ایٹ لا ۔ لندن
ڈپلوما ان جرنلزم] ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۵

سیاسی اور سماجی سرگرمیاں

۱۹۱۹ء تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔

۱۹۲۷ء انڈین نیشنل کانگریس (لندن برانچ) میں شرکت کی اور لندن میں زیر تعلیم طلبا کو جمع کیا اور مظاہرے کئے۔

۱۹۲۹ء انگلستان میں مقیم ہندوستانی طلبا کا پہلا کمیونسٹ گروپ قائم کیا۔

۱۹۳۰ لندن میں کمیونسٹ پارٹی رکنیت حاصل کی۔

۱۹۳۵ء لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی اور اس کا پہلا منی فسٹو تیار کیا۔ اسی سال ہندوستانی مارکسسٹ طلبا کا ایک گروپ بنا کر برٹش کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ قائم کر کے فاشزم کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی رکنیت اختیار کی اور الہ آباد شہر کی کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہو کر جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کرنے لگے۔ بعد ازاں آل انڈیا شعبوں خاص طور پر فارن ایفئرس اور مسلم ماس کنٹکٹ سے وابستہ رہے۔ ساتھ ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور آل انڈیا کسان سبھا جیسی تنظیموں کو تشکیل دے کر کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبور کے لئے کام کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں وہ ماہنامہ ''چنگاری'' (سہارنپور) کے مدیر بھی رہے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کرنے کے جرم میں تین بار جیل گئے۔ سنٹرل جیل لکھنؤ میں دو سال قید کاٹی۔ قید کے دوران مختلف ناموں سے اخباروں کے لیے لکھتے رہے۔

۱۹۴۲ء جیل سے رہائی کے بعد پارٹی کے لیے آزادی اور مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پارٹی کے ترجمان ''قومی جنگ'' اور ''نیا زمانہ'' نامی اخباروں کے مدیر اعلیٰ رہے۔

۱۹۴۳ء انجمن ترقی پسند مصنفین کو مستحکم اور منظم کرنے میں لگے رہے۔ ملک کی ساری زبانوں کے ادیبوں،

شاعروں، دانشوروں اور فن کاروں کو انجمن سے وابستہ کیا۔

۱۹۴۸ء — تقسیم ہند کے بعد پارٹی ہائی کمان کے فیصلہ کے مطابق پاکستان گئے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ پاکستان میں طلبا، مزدوروں اور ٹریڈ یونین کے ممبروں کی تنظیم کی۔

۱۹۵۱ء — حکومت پاکستان نے راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا۔ تقریباً ساڑھے تین سال انڈر گراؤنڈ اور چار سال جیل میں گزارا۔ اسی دوران ''ذکر حافظ'' اور ''روشنائی'' تحریر کی۔

۱۹۵۵ء — میں جواہر لال نہرو کی خصوصی توجہ سے ہندوستان واپس آئے اور پھر اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ازسرنو تنظیم کی اور پارٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۵۸ء — میں تاشقند میں منعقد پہلی ایفرو ایشین رائٹرس ایسوی ایشن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۵۹ء — ہفتہ وار ترقی پسند رسالہ ''عوامی دور'' کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔ بعد میں اسی اخبار کا نام بدل کر ''حیات'' رکھا گیا۔

۱۹۶۲ء — ملک کے مختلف ریاستوں مثلاً بنگال، اتر پردیش، آندھر پردیش، پنجاب، راجستھان، گسے انتقال ہوا۔ تدفین جامعہ اسلامیہ اوکھلائی دہلی کے قبرستان میں ہوئی۔

تخلیقات

۱۹۳۲ء	''انگارے''	(افسانوں کا مجموعہ)
۱۹۳۵ء	''بیمار''	(ڈراما)
۱۹۳۸ء	''لندن کی ایک رات''	(ناول)
۱۹۴۷ء	''اردو ہندی ہندوستان''	(لسانی مسئلہ)
۱۹۵۱ء	''نقوش زنداں''	(خطوط کا مجموعہ)
۱۹۵۴ء	''ذکر حافظ''	(تنقید)
۱۹۵۹ء	''روشنائی''	(ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور تذکرہ)
۱۹۶۴ء	''پگھلا نیلم''	(نثری نظموں کا مجموعہ)

ترجمے

''آتھیلو''	(شیکسپیر)
''کنیڈ ڈ''	(وولٹیر)
''کاندیر''	(والٹیئر)
''گورا''	(رابندر ناتھ ٹیگور)
''پیغمبر''	(خلیل جبران)

ان کے علاوہ سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر کم و بیش چالیس برس تک مضامی لکھتے رہے جو ہندوستانی اور بیرون ممالک کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے اور ریڈیو پر نشر کئے گئے۔

اسفار: ۱۹۲۷ء سے ۱۹۷۳ء تک مندرجہ ذیل ممالک کا سفر کیا :۔
برطانیہ، فرنس، بیلجیم، جرمنی، ڈنمارک، آسٹریا، اٹلی، سوئیٹزرلینڈ، روس، پولینڈ، چیکوسلاواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، مصر، الجیریا، لبنان، شام، عراق، افغانستان، کیوبا، ویت نام، سری لنکا، اور پاکستان۔

☆☆☆

''شاید ابھی پچاس سال تک ہمارا بنیادی مسئلہ عادلانہ معاشی زندگی ہی رہے گا۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر ادب بھی اسی فکر کے تحت لکھا جاتا رہے گا لیکن ادب کے ساتھ محاسن و معائب کے ساتھ لزوم سے اس سوال کا جواب ملتا رہے گا کہ ہر نظریاتی ادب، ادب نہیں ہوسکتا اور ہر غیر نظریاتی ادب لازمی طور پر ادب ہوسکتا ہے۔ کسی تخلیق کے ادبی اور غیر ادبی ہونے کا نظریہ سے زیادہ فنّی Perfectionism کو دخل ہے اور دخل رہے گا۔ میں پوسٹ ماڈرن ازم کو مغربی دنیا کی حد تک ایک سامراجی ضرورت خیال کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ معاملہ اس قدر گھمبیر ہے تو پھر اس کے ثقافتی اور ادبی متعلقات بھی ہیں۔ ہمارے منطقہ نے مغرب کی منڈی بنے رہنے کا پروگرام بنا رکھا ہے تو پھر ہم مغربی Intellectualism کی منڈی بھی بنے رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔

سماجی، معاشی اور سیاسی تناظر میں ادب پاروں کی تفہیم جو ایک طرح Inter-discipilinary فریضہ ہے، سب سے اہم اور موزوں مکتبِ فکر ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں سماجی، معاشی اور سیاسی فکر سے کام لیں اور صرف فنونِ لطیفہ کو اس تناظر سے محروم کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑی حد تک نامناسب فیصلہ ہوگا۔ البتہ یہ شرط کہ ادبی تخلیقات بنیادی طور پر ادب کی کسوٹی پر پورا اتریں، صحیح خیال ہے۔ خواہ یہ کسی بھی مکتبِ فکر کی طرف سے پیش کی جائیں۔'' **ڈاکٹر محمد علی صدیقی**

(بحوالہ ادبی کتابی سلسلہ حریمِ ادب، بوریوالا۔ شمارہ ۳۔ صفحہ نمبر ۲۲۱)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

بہ مرگ من یاد آر سجاد ظہیر

گذشتہ دس بارہ سال کے عرصے میں چند ایسے لوگ دنیا سے اٹھ گئے ہیں جن کے ساتھ میری نہایت جان دار اور مضبوط یادیں وابستہ ہیں اور جن کا نہ ہونا میرے لئے زندگی میں ناقابل تلافی کمی ہے۔ میں شدت کے ساتھ خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہوں۔ یہ سب لوگ عمر میں چھوٹے یا بڑے میرے رفیق تھے۔ اس وقت سجاد ظہیر کے ذکر کے سلسلے میں چار اور شخصیتیں اس طرح یاد آ رہی ہیں کہ دھیان ٹالے نہیں ٹلتا۔ یہ ہیں نیاز فتحپوری، حکیم احمد شجاع، احتشام حسین اور ڈاکٹر تارا چند۔ احتشام حسین اور سجاد ظہیر پر تو تعزیتی تقریبوں میں زبانی کچھ نہ کچھ کہہ چکا ہوں لیکن باقی بچھڑے ہوئے دوستوں کا حق ابھی ادا نہیں کر سکا ہوں۔ ذہنی فراغت میسر رہی تو سبھی کی یاد تازہ کرنے کا جذبہ رکھتا ہوں۔ اس وقت سجاد ظہیر یاد آ رہے ہیں اور انھیں کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

سجاد ظہیر کو پہلی بار میں نے کب دیکھا۔ مجھے ٹھیک سن یاد نہیں آ رہا ہے۔ لیکن ان کے والد سر وزیر حسن سے اور میرے خاندان کے کئی افراد بالخصوص میرے والد مولوی محمد فاروق اور میرے بڑے سالے خان بہادر محمد ذکی ایڈوکیٹ سے دیرینہ اور پائدار مراسم تھے۔ پیشہ کی بنا پر بھی اور نجی طور پر بھی۔ سر وزیر حسن سال میں دو ایک بار گورکھ پور آیا کرتے تھے اور میرے والد یا خان بہادر محمد ذکی لکھنؤ یا الہ آباد جاتے تھے اور سر وزیر حسن سے ملاقات ضرور کرتے تھے۔ کبھی کاروباری مشورے کی غرض سے کبھی صرف دوستانہ تعلقات کے ناطے۔ میں بھی کبھی کبھی ایسے موقعوں پر ساتھ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں میں اتنا ہی اندازہ کر سکتا تھا کہ سجاد ظہیر اپنے خاندان میں سب سے مختلف ہیں۔ ان کا مزاج وہ نہیں تھا جو ان کے بھائیوں کا تھا۔ وہ خاموش رہتے تھے اور سنجیدگی کے ساتھ ہر وقت کچھ سوچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دوسرا تاثر یہ تھا کہ وہ سر وزیر حسن کے دلارے تھے اور انھیں سے زیادہ مانوس اور بے تکلف تھے۔ میرا یہ تاثر بعد کو یقینی ہو گیا۔

سجاد ظہیر کے نام نے چونکا کر اس وقت مجھے اپنی طرف متوجہ کیا جب ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی اور اس پر ہر طرف سے شور مچایا جانے لگا، یہاں تک کہ حکومت نے اس کو ضبط کر کے اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ ''انگارے'' چند افسانوں کا مختصر مجموعہ تھا جن میں ہمارے معاشرے اور اخلاق کی مروجہ میکانکی اور بے

جان قدروں کا پیش قدم، بے باک اور پر شباب لہجے میں پردہ فاش کیا گیا تھا۔ ''انگارے'' میں ڈاکٹر رشید جہاں، سجاد ظہیر اور احمد علی (پروفیسر) کے افسانے بڑے توانا اور موثر تھے۔ ان کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا تھا کہ زندگی ایک ''جہانِ دگر'' کی تعمیر کا مطالبہ کر رہی ہے اور سوچنے والے صالح اور حق شناس نوجواں کو اس کا تیز شعور ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر ایسی لے دے مچائی جاتی، لیکن شرع و آئین، اخلاق و معاشرت کے اجارہ داروں کو تو گیر و دار کا ہنگامہ برپا کرنے کے لیے کوئی بہانہ چاہئے۔ ہنگامہ برپا کرنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اپنی پر اضطراب جوانی کے زمانے میں بزرگان علم و دانش اور ہادیانِ دین و ایمان کی شان میں ایسی بے ادبیاں کر چکے تھے جو کسی شرع یا قانون کی رو سے روا نہیں تھیں۔ یہ لوگ اب تائب ہو کر مذہب و اخلاق اور رشد و ہدایت کے قائد بن گئے تھے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ تک برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم عبوری دور رہا ہے۔ ایک طرف ملکی آزادی اور خود مختاری کے جاں باز اپنی اب تک کی کوششوں کا جائزہ لے رہے تھے اور نئے لائحہ عمل کے بارے میں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کر رہے تھے۔ دوسری طرف برطانوی سامراج برصغیر میں اپنے قیام و استحکام کی غرض سے اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ اس صورت حال سے جو نتیجے نکلے ان میں دو بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ایک تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء جس کی بنیاد پر برصغیر میں پہلی بار ملکی وزارتیں قائم ہوئیں۔ دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے قانونی طور پر تسلیم کر لیا اور انڈین کمیونسٹ پارٹی ایک منظّم اور موثر جماعت کی شکل میں وجود میں آئی۔ ورنہ پہلے کمیونزم یا کمیونسٹ کا نام لینا ایک سنگین خطرہ تھا۔ جو لوگ اپنے مطالعہ اور فکر کی بنا پر اشتراکیت کے فلسفہ یا اشتراکی ہیئت اجتماعی کے خلوص نیت اور صدق دل سے قائل تھے وہ یا تو مبہم طور پر اپنے کو یساری یعنی Leftist کہتے تھے یا کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا سہارا لیتے تھے۔ اس پر بھی حکومت ان پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ الہ آباد میں ڈاکٹر زیڈ احمد اور ان کی بیگم ہاجرہ، لکھنؤ میں ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے شوہر ڈاکٹر محمود الظفر اور علی گڑھ میں ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر عبد العلیم کیسے خطروں کے سائے میں بسر کر رہے تھے اس سے میں واقف ہوں، یہ سب لوگ وسیع مطالعہ رکھنے والے، فکر و بصیرت سے بہرہ مند اور مخلص تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سجاد ظہیر بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۳۴ء میں وطن واپس آئے اور الہ آباد میں قیام کیا۔ الہ آباد چند سال قبل خود میرا دوسرا وطن رہ چکا تھا اور میرے اصل وطن بستی اور گورکھپور، دونوں جگہوں سے زیادہ میرے مزاج داں اور ادا شناس الہ آباد میں پیدا ہو گئے تھے جن میں بیشتر ارباب دانش اور اہل ذوق و نظر تھے۔ جب الہ آباد چھوٹا تو پرانی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ۱۹۴۶ء تک سال میں کم سے کم تین مرتبہ میں الہ آباد ضرور جاتا تھا اور ہفتہ عشرہ قیام کرتا تھا۔ اس طرح مجھے سجاد ظہیر کو بہت قریب سے جاننے اور پہچاننے کا موقع ملا اور سجاد ظہیر بھی میری طبیعت اور فکر و احساس کے میلانات کو بہت جلد سمجھ گئے۔ پھر ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح کھل

گئے اور کسی قسم کا تکلف یا پس وپیش درمیان میں باقی نہیں رہا۔

انگلستان کے قیام نے سجاد ظہیر کو خود اپنے مزاج اور میلان طبع کو سمجھنے اور اپنے لئے ایک نصب العین اور راہ عمل متعین کرنے میں بڑی مدد کی۔ ان کو انگلستان کے اور خود اپنے وطن کے بعض حوصلہ منداور پر جوش پیش قدم جوان ذہنوں سے ندا کرنے کے مواقع مسلسل ملتے رہے۔ ان میں ملک راج آنند کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ جو برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے اور ایک مفکر اور فنکار کی حیثیت سے شہرت پا چکے تھے۔ سجاد ظہیر جب وطن واپس آئے تو انھوں نے زمین ہموار پائی اور ان کو فکر ہوئی کہ برصغیر میں بھی کمیونسٹ پارٹی کا باضابطہ قیام ہو اور لوگوں کو اشتراکی فکریات سے آگاہ اور مانوس کیا جائے۔ ان کے ہم خیال وہم نظر ملک میں پہلے سے موجود تھے جن کے نام گنائے جا چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر زیڈ احمد اور ان کی بیگم ہاجرہ، ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے شوہر ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم جیسے سوچنے سمجھنے والے مخلص ساتھیوں نے سجاد ظہیر کی لگن اور دھن کا خیر مقدم کیا اور برصغیر کے ہر علاقے اور ہر بڑے ضلع میں بہت جلد کمیونسٹ پارٹی وجود میں آ گئی۔ ملک راج آنند ایک مشیر رہنما کی حیثیت سے برابر ساتھ دیتے رہے۔ جن کے نام گنائے گئے ہیں وہ صاف مزاج اور قابلیت کے لوگ تھے۔ ڈاکٹر زیڈ احمد اور ہاجرہ خالص سیاسی اور عملی لوگ تھے اور تنظیم کا قابل رشک ملکہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمود الظفر خاموش انہماک کے ساتھ کام کرنے والے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اپنے نقطۂ نظر میں نہ صرف سخت اور اٹل تھیں بلکہ اس کے اظہار میں نہایت بے باک، طرار اور شعلہ زبان تھیں۔ وہ فطرت کی طرف سے ادبی ذوق وصلاحیت بھی لائی تھیں اور ادب میں بھی جدید اور پیش قدم خیالات کی حامی تھیں۔ اس کا ثبوت ''انگارے'' کے بعد ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''عورت'' میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف صاحب فکرو تحقیق تھے اور ان کا مطالعہ نہ صرف بے انتہا وسیع تھا بلکہ منظّم اور منضبط بھی تھا۔ وہ انگریزی اور اردو زبانوں میں بولنے اور لکھنے کی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر علیم بھی مفکر اور صاحب فکر تھے اور انسانی زندگی اور تہذیب کی اقتصادی تعبیر میں درک رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے وہ ٹھوس اور اٹل ہوتا تھا۔

سجاد ظہیر مارکسی نظام فکر اور زندگی کی جدلیاتی ماہیت کے شدت کے ساتھ قائل تھے۔ وہ عوام الناس کی زندگی کی ہمہ جہتی فلاح وترقی پر ایمان رکھتے تھے اور اس کے لئے خلوص نیت کے ساتھ خواہاں اور کوشاں رہنا ہر دیانت دار آدمی کا فرض سمجھتے تھے۔ مگر وہ صرف سیاست کے آدمی نہیں تھے۔ وہ جمالیاتی ذوق اور ادبی شعور بھی رکھتے تھے، اور ثقافت اور فن کاری کو جدلیاتی شعور سے معمور دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت وہ اردو میں بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ جیسی دوسری زبانوں میں قائم کرنے کی تجویز ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی سے سجاد ظہیر کو ایسے ہمدردوں اور ہم کاروں کا ایک گروہ مل گیا جو یا تو ادیب اور شاعر تھے یا شعر وادب کا کھرا ذوق رکھتے تھے اور جماعتی غلو کے بغیر ان کے منصوبوں سے پورا اتفاق تھا۔ ان میں ڈاکٹر تاراچند، فراق گورکھپوری،

ڈاکٹر سید اعجاز حسین، قاضی عبدالغفار، لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکر جی اور پروفیسر کالی پرشاد جیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ پروفیسر احمد علی نظریاتی طور پر کمیونزم کے قائل تھے اور ادبی حیثیت سے ترقی پسند تحریک میں شریک رہے۔ ادبی محاذ پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری تحریک کے ایک موثر حامی تھے۔ اور ان کا تنقیدی مضمون ''زندگی اور ادب'' ادبی تاریخ میں ایک نئے موڑ کا حکم رکھتا ہے۔ بہر حال ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہو گئی اور دس سال تک بڑی یکجہتی اور واضح مقصد کے ساتھ کام کرتی رہی۔ اس کا سہرا دراصل سجاد ظہیر کے سر ہے۔ وہ صرف محرک یا بانی نہیں تھے، بلکہ ایک سرگرم کارکن تھے۔ انھوں نے اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے پورے برصغیر کا دورہ کیا اور دیکھتے دیکھتے ہر صوبہ میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ایک نسل تیار ہو گئی جو اردو ادب کے لئے اب تک باعث فخر ہے۔ روز اول سے ہر انتخاب میں غائبانہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی مجلس عاملہ اور اس کی اردو کمیٹی کا رکن چنا جاتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس کی کسی کانفرنس میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کا سبب صرف میری اپنی کاہلی اور بے توفیقی تھی۔ مگر میں اپنی تحریروں سے برابر اس کا ساتھ دیتا رہا۔

سجاد ظہیر سیاسی سے زیادہ ادیب اور انشا پرداز تھے اور وہ متقدمین سے لے کر معاصرین تک اکابر شعر وادب کے کارناموں کے قدر شناس تھے۔ وہ صحافی بھی اچھے تھے مگر ادب کو صحافت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ نہ زود نویس تھے، نہ بسیار نویس۔ وہ جب تک اچھی طرح مطالعہ نہیں کر لیتے تھے اور دیر تک سوچ سمجھ نہیں لیتے تھے، کسی موضوع یا مسئلہ پر قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ ''ذکر حافظ'' اور ''روشنائی'' ان کی ایسی تحریریں ہیں جو میرے قول کی تائید کرتی ہیں۔ وہ اور بہت سے منصوبے رکھتے تھے۔ ان میں امیر خسرو پر ایک کتاب لکھنا بھی تھا۔ اس کی وہ تیاری کر رہے تھے مگر ''دریغا عمر نے کی بیوفائی''۔ آخر میں انھوں نے ''شعر منثور'' کی قسم کے جدید فکر سے مملو کچھ نثر پارے بھی لکھے جن کا مجموعہ ''پگھلا نیلم'' شائع ہو چکا ہے۔ میں ان پاروں کی ان کے مقام پر قدر کرتا ہوں۔ لیکن سجاد ظہیر کو اصرار تھا کہ وہ شعر ہیں۔ اس باب میں مجھے ان سے شدید اختلاف تھا۔ علی گڑھ اور دہلی میں اکثر بحثیں بھی رہیں۔ وہ خاموش تو ہو جاتے تھے مگر ان کے بشرہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ قائل نہیں ہوئے۔

سجاد ظہیر بڑے شریف النفس اور سچے انسان تھے۔ ترقی پسند گروہ میں ان سے زیادہ مہذب، شائستہ اور سلیم الطبع شخص مجھے آج تک نہیں ملا۔ بحث میں ان کا لہجہ ہمیشہ مدھم اور ملائم ہوتا تھا۔ ان کی گفتگو میں انانیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ کہتے یا کرتے تھے اس میں ایک بے نفس لگن ہوتی تھی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی ایک قربانی تھی۔ وہ ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے جس کی بنا پر حال میں بعض لوگوں نے ان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ کم ظرفی اور کم نظری کا ثبوت ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹیے۔ کتنے اولیاء اور صلحاء ایسے ملیں گے جو امیر گھرانوں میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ لیکن جنھوں نے سب کچھ تج کر خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا اور اسی میں اپنی ساری عمر گزار دی۔ سجاد ظہیر کو اپنی خاندانی امارت پر کوئی فخر نہیں تھا بلکہ وہ اس خیال سے شرم محسوس

کرتے تھے کہ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ماں کے سوا سارے کنبے والے ان سے مایوس اور ناخوش تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے بھائیوں کی طرح وہ بھی کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہوں لیکن وہ اپنے لئے سب سے الگ زندگی کا ایک راستہ منتخب کر چکے تھے اور اس راستے کو مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔

آج میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور دل میں ایک کسک محسوس کر رہا ہوں۔ ۱۹۳۴ سے اپریل ۱۹۶۸ء تک سجاد ظہیر سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ ملاقاتیں رسمی یا مجلسی نہیں ہوتی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے سچے رفیق و ندیم تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے لیکن میرا لحاظ اس طرح کرتے تھے جیسے میں ان سے بہت بڑا ہوں۔ میری سخت سے سخت بات کا نہ تو انھوں نے کبھی برا مانا اور نہ تیز لہجہ میں جواب دیا۔ انکی موت نے میرے احساس تنہائی کو تیز کر دیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں مجھ پر رباعیات کہنے کا ایک دورہ پڑا تھا اور میں نے تیس چالیس رباعیاں ایک ساتھ کہہ ڈالیں تھیں۔ ایک رباعی یہ بھی ہے:

احباب سے ہو رہی ہے خالی دنیا
یہ لحظہ بہ لحظہ مٹنے والی دنیا
ہم ہیں اور یاد رفتگاں ہے یعنی
اپنے لئے رہ گئی خیالی دنیا

کیا خبر تھی کسی زمانے کا تخیل آج ایک پر آزار تجربہ ہو کر سامنے آئے گا!

☆☆☆

''جب ہم مختلف اصناف کو جانچیں اور پرکھیں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک صنف کا دوسری صنف سے فرق بھی دیکھیں۔ مثلاً ہمیں اس کا تو اختیار ہے کہ جب ہم دو پھولوں کا مقابلہ کریں تو گلاب کو چمیلی پر مجموعی حیثیت سے ترجیح دیں، لیکن اگر ہم فطرت کے ان دو بہشتی تحفوں کی علیحدہ اور منفرد خوبیوں کو بھی نہیں سمجھتے تو پھر ہماری تنقید یک طرفہ اور نامکمل اور اس لئے گمراہ کن ہوگی۔ شعر و ادب زندگی کے ہر پہلو کی ہزاروں نئے اور دل فریب انداز میں تنقید اور تصویر کشی کرتے ہیں۔ انھیں نمایاں کرتے ہیں اور بے شمار طریقوں سے ہمارے دل و دماغ کر متاثر اور محظوظ کرتے ہیں۔ ایک وقت اور ایک موقع پر زندگی کا ایک خاص پہلو زیادہ لائق توجہ ہوسکتا ہے۔''

(سجاد ظہیر ''روشنائی'' سے ماخوذ)

سید احتشام حسین

فکر و عمل کا مخلص رہنما

آج مجھے بیس سال پہلے کی کچھ باتیں یاد آ رہی رہیں۔ سجاد ظہیر کو میں نے پہلے ''بنّے بھائی'' ہی کی حیثیت سے جانا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی تھی کہ میرے دُور کے لیکن بنّے بھائی کے بعض قریبی رشتہ داروں کے یہاں نہ صرف ان کا بلکہ ان کے دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کا ذکر آیا۔ دیہات کی کسی قدر بجھی بجھی اور سست رفتار فضا میں لکھنؤ میں رہنے والے پڑھے لکھے عزیزوں کا ذکر ہوا کے خوش گوار جھونکوں کی طرح فرحت پیدا کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد یہ ذکر صحیح غلط نئ معلومات کے ساتھ برابر آتا رہتا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ بھائیوں میں سے کوئی ولایت سے پڑھ کر آیا ہے، کوئی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا ہے، کسی کو بڑی ملازمت مل گئی ہے، کوئی بیرسٹری میں نام پیدا کر رہا ہے۔ کسی کی شادی ہوئی ہے۔ پھر ایک بڑا وقفہ گزرا، اوروں کے ساتھ بنّے بھائی کا ذکر کم ہوتا، تعلیم کی وجہ سے میرا رابطہ بھی دیہات سے کم رہ گیا تھا، اس لئے میں شاید وہاں کے تذکروں سے بے خبر بھی رہنے لگا تھا۔ لیکن پھر جو اُن کا ذکر سنا تو ایک دوسرے ہی انداز میں۔ وہی عزیز جو ''بنّے میاں'' کا ذکر محبت اور فخر سے کرتے تھے۔ ناگواری اور نفرت سے کرنے لگے، نئ تعلیم پر جا و بے جا اعتراضوں کے ساتھ اپنے بچوں اور قرابت داروں کو لا مذہبیت اور آزاد خیالی سے محفوظ رہنے اور شریف خاندانوں کی عزّت و غیرت برقرار رہنے کی دعائیں مانگنے لگے۔ معلوم ہوا ہے کہ افسانوں کا کوئی مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا ہے جس کے روحِ رواں سجّاد ظہیر ہیں اور جس میں مذہب اور اخلاق کی بیخ کنی کی گئی ہے۔

اس وقت میں الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور اپنے بہت ہی قدامت پسند ماحول کے باوجود تحریک آزادی سے متاثر اور زندگی کے سمجھنے کا متمنی۔ میرے لئے اس خبر میں گھبراہٹ، خوف اور ایک طرح کے چھپے ہوئے فخر کے جذبات کی آمیزش تھی۔ اس وقت تو یہ کتاب پڑھنے کو نہیں ملی لیکن یہ خیال آزادی کی جدوجہد کے پس منظر میں ذہن میں جم گیا کہ یقیناً یہ کوئی ایسی کتاب ہوگی جس سے برطانوی سامراج کے مفاد کو بھی نقصان پہنچتا ہوگا۔ پوشیدہ خوشی اس بات کی تھی کہ کتاب کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہے جسے میں نہ جاننے کے باوجود اپنا

عزیز کہہ سکتا ہوں، پڑھنے کی فکر یوں تھی کہ افسانوں میں ایسی باتیں کس طرح لکھی جاتی ہیں جن کے ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ غرض کہ شوقِ مطالعہ اور جذبہ آزادی کی اُمنگ نے انگارے اور سجاد ظہیر کے لئے ذہن میں ایک جگہ پیدا کر دی۔

یونیورسٹی میں دو سال گزارنے اور ذہنوں کی وسیع تر دنیا میں داخل ہونے کے بعد ایسی کتابیں پڑھنے اور ایسے لوگوں سے ملنے کی خواہش اور تیز ہو گئی جن سے خاص طرح کے لوگ متنفر یا خوفزدہ تھے۔ چنانچہ بہت سا وقت سیاسی جلسوں، جلوسوں، لائبریریوں اور کتب خانوں میں صرف ہونے لگا اور جب جنگ آزادی شباب پر تھی، معلوم ہوا کہ جو لوگ پنڈت نہرو کے مشیر خاص ہیں وہ سب کے سب اسی الہ آباد میں موجود ہیں، اس میں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر لوہیا اور سجاد ظہیر کے نام خصوصیت سے لئے گئے۔ اپنی کم آمیزی کی وجہ سے میں فوراً تو نہ مل سکا۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں، جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو ڈاکٹر اعجاز حسین اور پروفیسر رگھو پتی سہائے فراقؔ کے وسیلے سے ان سب سے ملنے کی راہیں کھل گئیں۔

پہلے پہل میں نے بنّے بھائی کو ان کے والد سر وزیر حسن مرحوم (چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد) کے ساتھ ہائی کورٹ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھے اور ہائی کورٹ کے ایک وکیل معلوم ہوتے تھے۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد ایک سیاسی جلسے میں وہ کھدّر پوش کانگریسی نظر آئے اور پھر میں نے انہیں کبھی وکیل کے روپ میں نہیں دیکھا۔ ادبی جلسوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں، گھر پر ان کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو کی بڑی اہم کتابیں نظر آئیں اور باتیں کر کے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور ذوق ادب بے حد لطیف ہے، انہیں ہندوستان ہی نہیں عالمی ادب، تہذیب اور تاریخ سے بھی گہری دلچسپی ہے اور اپنے ادب کا سر اونچا کرنے کی زبردست لگن انہیں بے چین رکھتی ہے۔ ان دنوں کے دو ادبی جلسوں کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ ایک جلسے میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے عوامی تیوہاروں اور لوک گیتوں پر ایک بڑی دلچسپ تقریر کی اور اپنی کتاب کویتا کومودی کے لئے نظمیں فراہم کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا ہوا تھا ان کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا تھا۔ دوسرا جلسہ وہ جس میں سجاد ظہیر نے اپنا ڈرامہ ''بیمار'' پڑھا تھا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم زندگی کے کسی طلسمی دور میں داخل ہو رہے ہیں، ایک ایسے دَور میں جو سیاسی جد و جہد اور خواب آزادی سے ہم آہنگ ہے اور اس نئی دنیا میں بنے بھائی کی ذات ایک روشنی کے مینار کی سی نظر آتی تھی۔ ۱۹۳۶ء کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو فیض پور کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے انہیں اس کا وقت نہیں ملا تھا کہ وہ اپنا خطبۂ صدارت لکھیں۔ صرف چند دن رہ گئے تھے۔ قریب قریب سطروں کے سترہ فل اسکیپ سائز پر ٹائپ کیا ہوا خطبۂ صدارت انگریزی میں چھپنے کے لئے دے دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ دو (۲) دن

کے اندر اس کا اردو اور ہندی ترجمہ بھی ہو اور چھپ کر مل بھی جائے تاکہ کوئی شخص اسے وقت پر فیض پور پہنچا دے۔ اردو ترجمے کے لئے ڈاکٹر اشرف مرحوم اور ہندی کے لئے ہمارے موجودہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا انتخاب ہوا جو اس وقت غالباً لکھنؤ سٹی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے قرعہ فال سجاد ظہیر کے نام پڑا۔ صرف رات بھر کا وقت تھا، صبح کو ترجمہ چھپنے کے لئے دینا تھا۔ بنّے بھائی کو کسی طرح خیال ہوا کہ مجھے بھی مدد کے لئے ساتھ لیں۔ چنانچہ وہ یونیورسٹی آئے، مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تو یہ پیغام چھوڑ کر چلے گئے کہ میں جلد سے جلد ان کے یہاں پہنچ جاؤں، چنانچہ میں شام کو جب ان کے یہاں پہنچا تو صورت حال کا علم ہوا اور یہ طے ہوا کہ رات بھر میں ترجمہ ختم کر لیا جائے۔ بنّے بھائی، میں اور نور الحسن (صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے) صفحات تقسیم کر کے جم گئے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب صبح کا دھندلکا چھا رہا تھا اس وقت ہم نے ترجمے کی آخری سطریں پوری کر لی تھیں۔ اس سلسلے کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے شاستری جی قریب ہی دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے اور چونکہ وہ اردو سے بھی اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہمارے ترجمے کے اوراق سامنے رکھ رکھ کر ہندی میں لکھتے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ چند دنوں بعد بنّے بھائی نے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو ہم لوگوں کا ترجمہ بہت پسند آیا۔

ان دنوں بنّے بھائی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے سلسلے میں بار بار الہ آباد سے باہر سفر کئے۔ لکھنؤ میں پہلی کانفرنس کی جس میں مرحوم پریم چند نے صدارت کی تھی، میں امتحان کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکا۔ کچھ ہی دن بعد ۱۹۳۷ء میں شمالی ہند کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس الہ آباد میں ہوئی جس میں پنڈت جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو، جوش ملیح آبادی، نرالا جی، جے پرکاش نرائن اور بہت سے اہم رہنماؤں نے شرکت کی۔ یہ سب کچھ وہ ایسی لگن اور ایسے تنظیمی انہماک سے کرتے تھے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ میں طبعاً کم آمیز ہوں اس لئے میں ایسے مواقع اکثر کھو دیتا تھا، جب ان کے توسط سے ہندی، اردو، انگریزی، بنگلہ اور دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ملنے میں آسانیاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ بنے بھائی آہستہ آہستہ اس جدید ادبی تحریک میں ایک مرکزی جگہ کے مالک ہو گئے، اور وہ تمام لکھنے والے جنھیں تھوڑا بہت بھی ادب اور زندگی کے تعلق کا شعور تھا، ان کے قریب آتے گئے، ان تمام باتوں کی تفصیلی روداد ان کی تصنیف ''روشنائی'' میں بڑے دل کش انداز میں بیان کی گئی ہے، انہیں دہرانا مقصود بھی نہیں ہے، صرف یہ کہنا کہ ان کی ادبی صلاحیتیں، ان کا سنجیدگی سے سوچ سوچ کر مسائل پر اظہار خیال کرنے کا انداز ان کا دلکش اسلوب نگارش، ان کا ادب اور سیاست کے رشتے پر زور دینے کے باوجود ادبی نقطۂ نظر، یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن سے ان کے وسیع مطالعہ اور بیدار ذہن کا پتہ چلتا تھا جس سے ہم سب کا متاثر ہونا فطری تھا۔

۱۹۳۸ء میں، میں لکھنؤ پہنچ گیا بنّے بھائی کبھی کبھی وہاں آتے تھے اور وہاں کی ادبی محفلوں میں جان

ڈال دیتے تھے۔ ان دنوں وہاں سبھی تھے، ڈاکٹر علیم، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، مجاز، سردار جعفری، سبطِ حسن، حیات اللہ، سلمان احمد علی۔ اس سے لکھنؤ کی ادبی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد بنّے بھائی کی شادی ہوئی اور کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور ہم نے سنا کہ بنّے بھائی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل بھیج دیئے گئے۔ جس کی یادگار ان کے خطوط ''نقوشِ زنداں'' اور چند وہ مضامین ہیں جو انھوں نے ''نیا ادب'' کے لئے جیل میں سے لکھے۔

اس کے بعد سے کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ کہیں جم کر ایک جگہ رہتے اور جہاں بھی رہے میں ہمیشہ ان جگہوں سے دور رہا، کبھی بھولی بھٹکی ملاقاتیں، کبھی بھولے بھٹکے خط، یہی وہ رشتہ رہ گیا، لیکن اس زمانے کے علاوہ جب وہ پاکستان میں تھے کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ ان سے دوری محسوس ہوئی ہو، یہ رابطہ کچھ تو رضیہ آپا کی وجہ سے قائم تھا، اور کچھ ان علمی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جن میں ان کی عدم موجودگی کے باوجود ان کی روح جھلکتی نظر آتی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے ادبی ارتقاء میں اپنی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں سے جو روح پھونکی ہے، اسے ادب اور خاص کر اردو ادب کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ پندرہ سال پہلے میں نے ان پر ایک مضمون لکھتے ہوئے حسب ذیل جملے لکھے تھے، آج بھی ان یادوں کو انہیں جملوں پر ختم کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ ان کی صداقت آج بھی ماند نہیں ہوئی ہے۔ میں نے لکھا تھا:

> ''ہندوستان اور پاکستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک کو جس فردِ واحد کی تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی تحریکوں اور اداروں کو بھی افراد کی رہنمائی اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے (حالانکہ افراد کو طاقت جماعت ہی سے حاصل ہوتی ہے) اس لئے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے، اس پر مضبوط عمارت کھڑی کرنے، عمارت کو آراستہ کرنے، اس کے بسنے والوں میں اس کی محبت اور حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے اور اس کے حدود میں اضافہ کرنے کا کام زبردست تعمیری صلاحیت چاہتا ہے۔ جب اس میں سجاد ظہیر کے دوسرے سیاسی اور علمی کارناموں کو جوڑ لیا جائے تو ان کی شخصیت کا وہ خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس سے فکر و عمل کے ایک مخلص رہنما کے خدوخال بنتے ہیں۔''

☆☆☆

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

فیض احمد فیض

خواجہ احمد عباس

ایک انسان جو نہیں مرا

ہمارے یہاں دستور یہ ہے کہ جب تک کوئی انسان زندہ رہتا ہے اس میں ہر کوئی ہزار کیڑے نکالتا ہے، اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے، اس کو گالیاں تک دی جاتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ مرجاتا ہے ہر طرف سے اس پر تحسین و توصیف کی بارش شروع ہوجاتی ہے۔ تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں۔ اس کی شان میں قصیدے لکھے جاتے ہیں۔ اس کی موت کو اس سال کا، یا پچھلے دس سال کا یا ایک صدی کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا جاتا ہے۔ شاید ایسا ہونا قدرتی بھی ہے اور لازمی بھی۔ موت کی جھاڑو سب اختلافات کو، سب اعتراضات کو، سب نفرتوں اور کدورتوں کو سمیٹ کر لے جاتی ہے۔ کم سے کم ہم مرے ہوئے ساتھیوں کو بخش دیتے ہیں۔

سید سجاد ظہیر جن کو ہم میں سے بیشتر ''بنے بھائی'' کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے، شاید اُن گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی کسی نے برا نہیں کہا۔ میں سوچتا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

شاید اس لئے کہ وہ خود دوسروں کی اچھائیوں ہی کو دیکھتے تھے۔ برائیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ شاید اس لئے کہ سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے کمیونسٹ ہونے کے باوجود ان میں ''کٹرپن'' اور کسی قسم کا بھی تعصب نہیں تھا۔ ان کی کمیونزم پر شک کیا جا سکتا تھا۔ جیسے کٹر نکسل وادی اور مارکسسٹ کمیونسٹ کرتے تھے، لیکن ان کی انسان دوستی پر آج تک کسی نے شک و شبہ نہیں کیا۔ بلکہ ان کا تو کہنا تھا کہ سچا کمیونسٹ انسان دوست ہی ہوتا ہے۔

شاید اس لئے کہ وہ طبیعتاً امن پسند اور صلح کُل انسان تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا منفی پہلو نہیں تھا۔ ان کی صلح پسندی نظریاتی یا طبقاتی ''غیر جانب داری'' نہیں تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر شدت کے ساتھ قائم تھے لیکن اس شدت کا اظہار نہایت مہذب اور ملائم انداز سے کرتے تھے۔

شاید اس لیے کہ تہذیب، نفاست، شائستگی، اخلاق، یہ سب خوبیاں، یہ سب انسانی قدریں (جنھیں غلطی سے پرانے فیوڈل سماج سے وابستہ سمجھا جاتا ہے) جواہر لال نہرو کے بعد سجاد ظہیر کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور ہر ملنے والا چاہے وہ ان کا کتنا ہی سیاسی یا نظریاتی مخالف کیوں نہ ہو، سجاد ظہیر سے ملنے کے بعد ان کا

گرویدہ ہوجاتا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ ان کی زبان سے کبھی کسی کی بابت کوئی سخت درشت یا ناروا جملہ میں نے یا شاید کسی نے بھی نہیں سنا۔ ایک بدتہذیب، بدزباں اور لیچڑ قسم کے شاعر کے لئے زیادہ سے زیادہ سجاد ظہیر کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''بھئی عباس یہ تو بڑا بور ہے!''

شاید اس لئے بھی کہ سجاد ظہیر ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے اصولوں اور آدرشوں کے لئے تن من، دھن سب قربان کردیا تھا۔ یورپین اور امریکن ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ہندوستان میں انسانوں کی کامیابی ناپنے کے الگ پیمانے ہیں۔ امریکہ میں اس آدمی کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنی زندگی میں ایک کروڑ ڈالر کمائے ہوں، برخلاف اس کے ہندوستان میں اس کی عزت ہوتی ہے جس نے لاکھوں کروڑوں روپے یا جائداد خدمتِ خلق کے لئے قربان کردیئے ہوں۔ یہ روایت ہزاروں برس سے چلی آرہی ہے۔ مہاتما بدھ اس کے پیش رو تھے۔ محلوں کی شاہی زندگی چھوڑ کر فقیری اختیار کرلی۔

بیسویں صدی میں اس روایت کو مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے اور کتنے ہی کانگریسی، کمیونسٹ اور سوشلسٹ رہنماؤں نے اپنایا۔ عیش و آرام تیاگ کر خدمت، محنت، قربانی کا راستہ اختیار کیا۔ ان ہی میں سے ایک سجاد ظہیر بھی تھے۔ لیکن بنے بھائی کی فقیری میں بھی ایک شاہانہ شان تھی۔ وہ کھدّر کا معمولی کرتا، پاجامہ اور جواہر جیکٹ اس اہتمام سے پہنتے تھے جیسے کوئی لندن کا سلا ہوا ہزاروں روپے کا سوٹ۔ ان کی سادگی میں کسی قسم کا تصنع و بناوٹ یا دکھاوا نہیں تھا ''شہیدانہ'' پوز نہیں تھا۔ خودنمائی تھی نہ خودستائی۔ ایک بار جب انھوں نے عوام کی سی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تو انھوں نے اس شان بے نیازی کے ساتھ فقیری کا چولا پہن لیا جیسے بچپن سے انھوں نے اس طرز زندگی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

بنے بھائی اپنے باپ سر وزیر حسن کے محل جیسے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ جب سر وزیر حسن کا انتقال ہوگیا اور ان کے سب بیٹے مع سجاد ظہیر کے، سب بھائی ہندوستان بھر میں بکھر گئے اور یہ چالیس پچاس جہازی کمروں کی کوٹھی کرایہ پر چڑھادی گئی تو کئی برس تک سجاد ظہیر اپنی بیوی رضیہ اور اپنی چھوٹی بچیوں کے ساتھ اسی وزیر منزل کے شاگرد پیشہ کی تین کوٹھریوں میں رہتے تھے، جو گرمی میں بھٹی کی طرح جلتی تھیں اور جہاں کے ٹوٹے دروازوں، کھڑکیوں میں سے جاڑے بھر برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کرتی تھیں۔ کئی برس ہوئے جب لکھنؤ میں سیلاب آیا تو یہ کوٹھریاں اور ان میں بھرا ہوا سب سامان کئی کئی فٹ پانی میں ڈوب گیا۔ بنے بھائی کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ افسوس کیا تو صرف اس بات کا کہ ان کی ذاتی لائبریری کی ہزاروں کتابیں سیل سے خراب ہوگئیں اور ان میں بعض نایاب قلمی نسخے بھی تھے۔

عصمت چغتائی ہفتوں وزیر منزل کی ان کوٹھریوں میں بنے بھائی اور رضیہ کی مہمان رہی تھیں۔ ایک ٹیلی وژن انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ جب وہ وہاں گئیں تو جاڑے کا موسم تھا اور رات کو سجاد ظہیر دروازوں اور

کھڑکیوں کے درازوں کو اخبار کے کاغذوں سے بند کرتے پھرتے تھے کہ برفیلی ہوا کے جھونکے اندر نہ آسکیں۔ کھانا سب باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھاتے تھے۔ گرم گرم روٹیاں توے سے اترتی جاتی تھیں اور ایک ایک نوالہ کرکے دال سالن کے ساتھ سب کھاتے جاتے تھے۔ رات کو سب لحافوں میں جب دبک جاتے تو دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ کبھی روس کی، کبھی چین کی، کبھی ہندوستان کی، کبھی سیاست کی، کبھی ادب کی۔ کبھی نئی شاعری کی، کبھی آرٹ کے نئے تجربوں کی۔ بیچ بیچ میں سجاد ظہیر اپنی بچّیوں کو جو اس وقت بہت چھوٹی عمر کی تھیں قصے کہانیاں سناتے رہتے اور جنوں پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے بچیاں باپ کی گود میں سوجاتیں اور تب سجاد ظہیر اپنی بیوی رضیہ اور عصمت کی طرف مخاطب ہوتے اور کہتے 'ہاں بھئی تم نے کرشن چندر کی نئی کہانی پڑھی ہے۔۔۔ یا فیض احمد فیض کی نئی غزل یا سردار جعفری کی نئی نظم یا ملک راج آنند کا نیا ناول یا حسین کی نئی پینٹنگ اور پھر گھنٹوں ادبی یا فنی موضوع پر گفتگو ہوتی اور باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بار بار سجاد ظہیر کا دروازہ کھٹ کھٹاتے۔ کھڑکیوں کو جھنجھوڑتے۔ یہاں تک کسی دراز میں ٹھونسا ہوا کاغذ یا کپڑا اپنی جگہ چھوڑ دیتا اور پھر فراٹے بھرتی ہوئی ہوا اندر آجاتی اور لحاف کو اپنی ٹھوڑی تک ڈھکتے ہوئے بنے بھائی کہتے ''اچھا بھئی اب سوجاؤ۔''

عصمت آپا ہی کی زبانی یہ بھی سنا کہ ان دنوں بنے بھائی بڑی تنگی کی زندگی گذار رہے تھے۔ رضیہ شاید کسی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ سجاد ظہیر انگریزی یا فرانسیسی کی کتابوں کے ترجمے کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔ لیکن مہمان داری اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ صبر وقناعت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی رضیہ جھنجھلا جاتیں اور اپنے شوہر کو برا بھلا کہہ ڈالتیں جو عصمت آپا کو نہایت ناگوار گذرتا۔ بچیاں بھی باپ کی طرفداری کرتیں لیکن بنے بھائی خود مسکرا کر بڑی معصومیت سے کہتے۔ ''ارے بھئی عصمت، رضیہ جو کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے۔ ہم ہیں ہی نکھٹو۔ دیکھو نا ہم نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ بیوی بچوں کے لئے نہ گھر بنایا، نہ کوئی آرام دیا۔۔۔ اور اس وقت رضیہ سب شکایتیں بھول کر اس حیرت انگیز شخص کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتیں جو اس کا شوہر تھا۔ اس کا محبوب تھا۔ اس کا آئیڈیل اور آدرش تھا۔''

کبھی کبھی عظیم انسانی شخصیتیں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پہچانی اور پرکھی جاتی ہیں۔

جب سجاد ظہیر آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ان کے سامنے دنیا کھلی پڑی تھی۔ دولت، عزت، شہرت، مکان جائداد۔۔۔ سب کچھ حاصل ہوسکتا تھا۔ چاہتے تو گھر کی اتنی بڑی جاگیر تھی کہ عمر بھر صرف شکار کھیلتے، تاش کھیلتے اور عیش و آرام کی بیکار زندگی بسر کرتے۔ چاہتے تو آئی سی ایس میں آکر ڈپٹی کمشنر سے کمشنر یہاں تک کہ گورنر ہوجاتے، اپنے والد کی طرح ''سر'' کا خطاب حاصل کرتے۔ برطانوی سامراج کا ایک ستون بن جاتے۔ چاہتے تو اپنے بڑے بھائیوں کی طرح بیرسٹری کرتے۔ ہزاروں روپئے روز کے مقدمے لڑا کرتے۔ لاکھوں روپئے کماتے۔۔۔ کوٹھی بنگلہ جائداد بناتے۔ مگر بنے بھائی نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان کو زندگی

میں کچھ اور ہی کرنا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ان کو ایک محسوس کرنے والا دل مل گیا تھا۔ ایک سوچنے والا دماغ مل گیا تھا۔ شاید ان کے اپنے مشاہدے سے اپنے تجربے سے یہ احساس پیدا ہوا تھا۔

لکھنؤ کے پاس ہی ان کی زمینداری تھی۔ کھیت تھے۔ زمینیں تھیں۔ باغ تھے۔ بچپن میں جب کبھی وہاں جاتے تو پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے کسانوں کو چلچلاتی دھوپ میں ہل چلاتے دیکھتے، ان کے ٹوٹے پھوٹے کچے جھونپڑوں کی طرف نظر کرتے تو ان کا دل اداس ہو جاتا اور ان کا دماغ سوال کرتا یہ کیوں ہے؟ کچھ لوگ امیر کیوں ہیں؟ اتنے بہت سے لوگ غریب، مفلس اور نادار کیوں ہیں؟ کیا اس امیری اور اس غریبی میں کوئی رشتہ ہے؟

یہی سوال کرتے کرتے وہ سوشلزم کی منزل تک پہنچ گئے۔ کمیونسٹ ہو گئے۔ مزدور تحریک کے رہنما ہو گئے۔ جیل چلے گئے۔ ایک بار دو بار اور پھر بار بار۔ مگر دراصل بنے بھائی سیاست کے لئے نہیں تخلیق کئے گئے تھے۔ ان کا دل ایک شاعر کا دل تھا۔ ایک ادیب کا، ایک آرٹسٹ کا دل تھا۔ اگر حالات اس کی اجازت دیتے تو وہ ساری عمر کتابیں پڑھا کرتے، کتابیں لکھا کرتے۔ ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، فن کاروں کی محفلوں میں بیٹھتے۔ ادبی اور فنی مسئلوں پر مباحثے کیا کرتے۔ لیکن ابھی انھوں نے جوانی میں قدم دھرا تھا۔ دو تین افسانے ہی تصنیف کئے تھے اور یہ افسانے بھی بڑے تیکھے اور چونکا دینے والے تھے۔ کہ ان کو معلوم ہو گیا کہ غلامی اور کس مپرسی کی حالت میں نہ کوئی قوم اچھے شاعر پیدا کر سکتی ہے نہ ادیب۔ شعر کہنے کے لئے، اچھے ناول لکھنے کے لئے عوام کا ادبی، فنی شعور جگانے کی ضرورت تھی جو بغیر آزادی اور انقلاب کے ناممکن تھا۔ اور سو یہ حساس، شاعرانہ، فن کارانہ دل اور تخلیق کی صلاحیت رکھنے والا دماغ انقلابی سیاست کی بھٹی میں کود پڑا۔ لیکن سیاست کے ہنگاموں میں بھی جیل کی کال کوٹھریوں میں بھی بنے بھائی کی تخلیقی کاوشیں جاری رہیں۔

سب سے پہلے انھوں نے احمد علی اور محمود الظفر مرحوم کے ساتھ مل کر ''انگارے'' نامی کتاب کے چونکا دینے والے نفسیاتی افسانے لکھے، جنھوں نے اردو افسانہ نگاری کے سوتے ہوئے تالاب میں ایک بہت بڑا پتھر پھینک کر ہلچل مچا دی۔ پھر ولایت کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ''لندن کی ایک رات'' نامی ناول میں ہندوستانی جوانوں کے باغیانہ اور فرار پسند دونوں قسم کے کرداروں کا خاکہ کھینچا۔ مدت کے بعد پاکستان میں نظر بندی کے دوران میں انہیں ایک ضخیم کتاب لکھنے کا موقع ملا۔ بغیر اخباروں، رسالوں کی فائلوں کے، بغیر کتابوں کے صرف اپنی یاد کے سہارے انھوں نے ہندوستان کی اور خاص کر اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک مستند تاریخ مرتب کر دی جو برسوں بعد ''روشنائی'' کے نام سے شائع ہوئی۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تھے لیکن ان کے دل میں قدیم اور کلاسیکل ادب کی تخلیق کرنے والوں کے لئے بڑا احترام تھا۔ بڑی محبت تھی۔ چاہے وہ جوش ہوں یا جگر ہوں یا فراق گورکھپوری۔ لیکن ساتھ ہی وہ سمجھتے تھے کہ زندگی کی نئی ذہنی الجھنوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے شاعری کے سانچوں کو بدلنے کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے وہ

مانتے تھے کہ ترقی پسندی کی انقلابی روایتوں کو چھوڑے بغیر بھی جدید شاعری کے تجربے کرنے کی ضرورت ہے اور انھوں نے اپنی کتنی ہی جدید انداز کی نظموں میں ایسے تجربے کئے جو ''پگھلا نیلم'' کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ چالیس سال کی تخلیقی زندگی اور نتیجہ صرف تین کتابیں اور چند افسانے؟

سجاد ظہیر نے انقلابی تحریک میں شامل ہو کر نہ صرف دولت شہرت، آرام، پیسہ روپیہ، جائیداد کو تیاگ دیا، بلکہ ان کی سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ انھوں نے عوام کی خاطر اپنی قدرتی ادبی صلاحیتوں کو اپنے فن کارانہ رجحانات کو پس پشت ڈال دیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے انھوں نے مزدوروں کی تنظیم کی، کسانوں کی تنظیم کی، طالب علموں اور نوجوانوں کی تنظیم کی۔ برسوں پارٹی کے ہفتہ وار اخباروں ''قومی جنگ''، ''قومی آواز'' اور ''حیات'' کی ایڈیٹری کی۔ ہندوستان اور پاکستان میں بار بار قید کی صعوبتیں کاٹیں۔ سختی تنگی کی زندگی بسر کی لیکن سب سے بڑا تنظیمی کام جو انھوں نے کیا وہ سارے ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا جس کے لئے سجاد ظہیر کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ اس تحریک نے ہندوستان کے کتنے ہی ادیبوں کو ترقی پسندی کا رستہ دکھایا۔ مقصدی ادب کے فن کارانہ امکانات سے روشناس کر دیا۔ کتنے ہی نوجوان ادیبوں کی تخلیقی قوتوں کو جگایا، اُجاگر کیا، ان کی تخلیقوں کو عوام میں مقبولیت بخشی۔ اور جتنا کام تحریک نے کیا اس کا بیشتر حصہ سجاد ظہیر کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہ حیثیت ادیب اور شاعر اپنی ذات کے تخلیقی امکانات کو محدود کر کے سجاد ظہیر نے پورے ترقی پسند ادب کی تحریک کو توانائی اور زندگی بخشی اور اس طرح عوام کے ادبی شعور کی ترقی کے امکانات کو لامحدود کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی قربانی کسی تخلیقی ادیب یا فن کار کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے بنے بھائی بمبئی کی والکیشور روڈ پر سیکری بھون نامی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اردو، ہندی کے زیادہ تر ادیبوں شاعروں کا گروہ بمبئی ہی میں رہتا تھا اور ہر اتوار کی شام کو بنے بھائی کے ہاں یہ سب جمع ہوتے تھے:

کرشن چندر	جوش ملیح آبادی
ملک راج آنند	سردار جعفری
راجندر سنگھ بیدی	سعادت حسن منٹو
اسرار الحق مجاز	اپندر ناتھ اشک
ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری	اندر راج آنند
راما نند ساگر	مہندر ناتھ
رضیہ سجاد ظہیر	امرت لال

عصمت چغتائی　　　　شاہد لطیف

اور نہ جانے کون کون؟

افسانے سنائے جاتے، مضمون پڑھے جاتے شعر سنائے جاتے۔ادبی بحثیں ہوتیں۔کبھی کبھی گرما گرمی بھی ہوجاتی۔مگر بنے بھائی جیسے مرنجاں مرنج مہمان نواز کے ہاں سب جھگڑے آخر چائے کی پیالی میں گھول کر ہم پی جاتے۔اور جب ہم لوگ رخصت ہوتے تو بنے بھائی کہتے ''اچھا عباس'' اگلے اتوار کو آنا نہ بھولنا۔تمہارا ڈرامہ سنیں گے ہم!

پھر یہ سیکری بھون کا ماحول پاکستان چلا گیا۔ایسی ہی ادبی محفلیں وہاں کراچی اور لاہور میں ہونے لگیں۔یہاں تک کہ جن جیلوں میں بنے بھائی رکھے جاتے ان کی کال کوٹھریاں بھی سیکری بھون بن گئیں اور قید و بند کے اس ماحول میں بھی ادب اور شاعری کی شگفتہ پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔پھر رہا ہونے کے بعد بنے بھائی ہندوستان آ گئے۔اب دہلی کے حوض خاص میں سیکری بھون کی روایات قائم ہوگئیں۔بنے بھائی جہاں جاتے تھے اپنا سیکری بھون کندھے پر اٹھالے جاتے تھے۔

یہ سیکری بھون ان کے ساتھ سات سمندر پار بھی گیا۔کبھی لندن میں ادبی محفلیں ہوئیں،کبھی تاشقند میں، جہاں بنے بھائی اور فیض احمد فیضؔ مل جاتے وہیں ایک بارونق ادبی محفل قائم ہوجاتی۔لیکن ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ان کی باغ و بہار شخصیت تھی جو ہر ایک نقطۂ خیال کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ بنے بھائی آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کی فکر کیوں کرتے ہیں۔آپ بذات خود ایک چلتی پھرتی انجمن ہیں۔جہاں آپ ہیں وہاں سب ترقی پسند ادیب اکٹھے ہوجاتے ہیں۔چاہے آپ بمبئی میں ہوں دہلی میں ہوں، لندن میں ہوں یا ماسکو میں' اور وہ ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔بھئی عباس جب ہم نہیں ہوں گے تب کیا ہوگا؟

میں کہتا ''ایسا دن کبھی نہیں آئے گا بنے بھائی'' مگر وہ دن آ ہی گیا۔کہتے ہیں بنے بھائی کا وہ مشہور شیر دل، انسانیت کی لے پر دھڑکنے والا دل محبت اور رفاقت سے بھرپور دل، چلتے چلتے تھک کر سو گیا۔ہندوستان سے دور۔سوویت یونین کی وسط ایشیائی پہاڑیوں کے درمیان، قزاقستان کی راجدھانی الما آتا کے شہر میں جہاں وہ افریقی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

مگر نہیں، بنے مرے نہیں۔ان جیسا زندہ دل کبھی نہیں مرسکتا۔آؤ ہندوستان کے ادیبوں کو اکٹھا کرو۔

اردو ادیبوں کو، ہندی ادیبوں کو، بنگالی ادیبوں کو، مرہٹی، گجراتی ادیبوں کو۔

ادیبوں کو دانشوروں کو شاعروں کو، افسانہ نگاروں کو جدیدیوں کو قدیمیوں کو۔ان سب کو جو عوام سے اور عوامی ادب اور شاعری سے محبت کرتے ہیں۔جن کے ادب میں عوام کی زندگی جھلکتی ہے، جن کی شاعری میں

عوام کا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

اور ان سب کے درمیان آپ سید سجاد ظہیر کو، ہمارے اپنے بنے بھائی کو ہمیشہ کی طرح بیٹھا پائیں گے۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی، اور ایک عجیب اطمینان۔۔۔اور ان کی زبان پر ہمیشہ کی طرح یہی جملہ ہوگا۔''بھائی عباس، بھائی ملک، بھئی کرشن، بھئی سردار، بھئی کیفی، بھئی بیدی۔

اگلے اتوار کو آنا اس بار بڑی اہم میٹنگ ہوگی۔''

''ہم ضرور آئیں گے بنے بھائی۔''

☆☆☆

۔جو لوگ فیشن کے طور پر خود کو ملحد یا دہریہ کہلوا کر خوش ہوتے ہیں اور اسی الحاد کو اپنی دانشوری سمجھتے ہیں جبکہ یہ سب کچھ بے حد مصنوعی ہوتا ہے مجھے ایسے دانشوروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا لیکن وہ لوگ جو کسی فیشن کے طور پر نہیں بلکہ فکری اعتبار سے اس سطح پر ہیں کہ مذہب سے بیزاری محسوس کرتے ہیں ان کے حوالے سے مجھے چند باتیں ضرور کرنی ہیں۔ایسے دانشوروں کا خیال ہے کہ مقاماتِ مقدسہ پر جا کر ہمیں اپنے اندر جو تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں وہ ان مقامات سے وابستہ ہماری گہری عقیدت کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔بجا ارشاد.....اگر ایسے مقامات پر جا کر کسی کو ذہنی، قلبی اور روحانی بالیدگی نصیب ہوتی ہے، اس کی حالت میں بہتر تبدیلی آتی ہے تو خود جدید نفسیاتی علم کی رو سے بھی یہ ایک بہترین علاج ہے۔بعض نفسیاتی امراض کا اگر اس طریقے سے علاج ہوجاتا ہے تو اس سے مذہب سے لاتعلق، جدید علوم سے بہرہ ور ہمارے دانشوروں کو خوشی ہونی چاہیے۔۔۔۔حضرت ابراہیم کے دور میں دو قبیح رسمیں معاشرتی سطح پر فروغ پانے لگی تھیں۔بہت سے لوگ رہبانیت کے زیر اثر تجرد پسندی کی طرف مائل ہونے لگے تھے، بعض انتہا پسند اپنی مجردانہ زندگی کو ہر شبہ سے بالا رکھنے کے لئے عضوِ مخصوصہ کو ہی کٹوانے لگے تھے۔نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری.....ایسے ماحول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس راہبانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لئے اس کی تہذیبی و ثقافتی علامت کے طور پر رسم ختنہ شروع کرادی۔

۔۔۔۔اُسی دور میں ایک اور بے رحمانہ رسم یہ تھی کہ کسی قربانی کے حوالے سے بڑے بیٹے کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔سو میرے دانشور دوست اگر اس تناظر میں ہی غور کریں تو حضرت ابراہیم کے ذریعے حضرت اسماعیل کا قربان ہوجانے کے لئے راضی ہونا اور پھر آخری مرحلہ میں بیٹے کو ذبح ہونے سے بچانے کے لئے خدا کی طرف سے دنبہ آ جانا اور پھر انسانی قربانی کی جگہ جانوروں کی قربانی کا رائج ہوجانا یہ بھی انسانی قربانی کے خلاف ایک انقلابی قدم بنتا ہے۔سو ہمارے دانشور احباب اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ دو اقدامات کو غور سے دیکھیں تو انہیں احساس ہوگا کہ اُس زمانے کی محدود دنیا میں نسلِ انسانی خود ہی اپنے خاتمہ کی طرف جارہی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مذکورہ انقلابی اقدامات سے نسلِ انسانی کے پھلنے پھولنے کے امکانات کو نمایاں کردیا۔

(سفرنامہ **سوئے حجاز** از حیدر قریشی سے اقتباس)

ڈاکٹر سید محمد عقیل

سجاد ظہیر۔ ایک ادیب ایک تحریک

سجاد ظہیر کی پیدائش کو ۱۰۰ سال گزر چکے اور ان کی وفات کو تقریباً ۳۲ سال۔ ایک ادیب کی حیثیت سے انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ ایک ڈرامہ ''بیمار'' ایک ناول ''لندن کی ایک رات''، خطوط کا ایک مجموعہ ''نقوش زنداں'' کے نام سے چھپا، ترقی پسند ادب کی ایک تاریخ ''روشنائی''، ایک شعری مجموعہ ''پگھلا نیلم'' اور کچھ ادبی مضامین، کچھ غیر ملکی کتابوں کے ترجمے، ''ذکر حافظ'' کے نام سے کلام حافظ کا ایک انتخاب۔ ایک ایسے ادیب کے لئے جس نے عمر کے اڑسٹھ سال طے کئے ہوں، یہ کام بہت بڑا کارنامہ نہیں۔ لیکن جس نے سجاد ظہیر کی ہنگامہ خیز زندگی دیکھی ہے، جو ان کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں، دونوں سے واقف ہے، اس کے لئے یہ کام بھی حیرت انگیز ہے۔ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا (جس سے مشکل کام دنیا میں کوئی دوسرا نہیں) کمیونسٹ پارٹی کا کام کرنا، جس میں اخبار بیچنے سے لے کر دوسرے مسائل بھی شامل ہیں۔ ملک کی سیاست پر بھی نظر رکھنا، ادب اور سیاست کا ہر وقت جائزہ لیتے رہنا، ان ترقی پسند اصولوں کا احصا کرنا جو ملک کی سیاست اور ادب کے ارتقا میں مددگار ثابت ہوں، سیمینار اور کانفرنسوں کا ان مسائل کی افہام و تفہیم کے لئے منعقد کرنا، یہ ساری ذمہ داریاں انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔

ایک ادیب کی حیثیت سے ۱۹۳۱ء کے قریب وہ ادبی افق پر نمودار ہوئے۔ اور افسانوں کا مجموعہ جو انھوں نے ''انگارے'' کے نام سے شائع کیا، اس نے ہندوستانی ادب اور خصوصاً اردو ادب کے ٹھہرے ہوئے ماحول میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور یہیں سے ترقی پسندی کی باقاعدہ فضا، اردو میں بطور خاص بننا شروع ہوئی۔ ''انگارے'' ایک ایسے ذہنی انقلاب لانے کی کوشش تھی، جو روایت پسندی کی بنیادوں کو ڈھا دے، فرسودہ عقیدوں سے تعقل پسندی کی طرف ذہن کو رجوع کر کے مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں مادیت کی عملی زندگی کا ساتھ دے سکے۔ اور اس طرح عوام الناس کو اس DOGMA سے نکال سکے جس میں مدتوں سے روایتی اخلاق پرستوں نے اسے اسیر کر رکھا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہر تحریک کی ابتدا میں ہوتا ہے، ''انگارے'' نے کچھ انتہا پسندی سے بھی کام لیا جسے مشرق کی روحانیت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ سجاد ظہیر ہی کے پانچ افسانے، ''نیند نہیں آتی''، ''جنت کی بشارت''،

''گرمیوں کی رات''، ''دلاری''، اور پھر یہ ہنگامہ، سب سے زیادہ لعن طعن کا نشانہ بنے (اگر چہ انگارے میں احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے بھی پانچ افسانے شامل تھے) اور ترقی پسندی پر ہر طرف سے حملے شروع ہو گئے۔ گو کہ اس وقت تک ترقی پسندی کی باقاعدہ بنیاد نہیں رکھی گئی تھی۔ لیکن انگارے کی اشاعت نے ایک ہلچل مچا دی۔ اردو افسانوں کی ایسی دنیا جہاں سلطان حیدر جوش، پریم چند، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کا چلن تھا، انگارے کی اشاعت، ایک نئی سمت تھی جس میں نئے سماجی انسان کی تلاش چھپی ہوئی تھی۔ نئے مسائل کی طرف اشارہ تھا اور افسانہ نگاری کی ایک نئی دنیا مضمر تھی۔ فن کے اعتبار سے ان افسانوں کا نقص نمایاں ہے۔ مگر ان کے PIONEER ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ کرشن چندر، عصمت، منٹو اور بیدی کے افسانوں کے لئے انگارے کی روایت ہی مشعل راہ بنی۔ شاید پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں کی روایت ان نئے افسانہ نگاروں کی اتنی مدد نہیں کر سکی جتنی کہ انگارے کی فکری جہت سے یہ نئے افسانہ نگار متاثر ہوئے۔ یہاں انگارے پر تبصرہ مقصود نہیں مگر ان اثرات کی طرف اشارہ کرنا ضرور ہے جو پھیل کر ہتک، کیڈل کورٹ، خونی ناچ، تائی ایسری، پان شاپ، منھن اور اپنے دکھ مجھے دیدو بنتے ہیں۔ اسی طرح سجاد ظہیر اچھے افسانہ نگار نہ سہی مگر نئے افسانے کو ایک ایسا نیا راستہ دکھانے میں وہ ضرور کامیاب ہوئے جہاں حسرت زدہ انسانوں کی تقدیریں، محرومیوں کا شکار تھیں اور اپنا اظہار چاہتی تھیں۔ جہاں عقل و ذہن پر روایت پرستی کا احتساب تھا۔ جہاں جنس ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور جسے چاہے کتنے ہی گھناؤنے طریقے سے عملی زندگی میں کیوں نہ برتا جائے۔ لیکن اس کا اظہار ممنوع تھا۔ انگارے کی اشاعت نہ ہوتی تو شاید نئے افسانوں کی بارآوری اس طرح سے نہ ہوتی جیسی کہ ہوئی اور جس کی روایت آج بھی جاری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اپنی لندن کی زندگی میں سجاد ظہیر نے سب سے پہلے بیمار نام کا ایک ڈرامہ لکھا اور اسے ایک ادبی انجمن میں پیش کیا جسے اس وقت ڈاکٹر تاثیر اور ملک راج آنند نے بہت پسند کیا تھا۔ یہ ہو بھی سکتا ہے، اس لئے کہ مغربی ادب اور زندگی میں جو اہمیت ڈرامے کو حاصل ہے، اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ مغرب میں رہ کر ہندوستانی ادب کو فروغ دینے کی تمنا کرنے والا طالب علم ڈرامے کی روایت میں ادب کی ترقی کو سوچے، خصوصاً اس وقت جب کہ اردو میں خاص طور پر ڈرامے کی روایت بہت کمزور بھی تھی۔ لیکن بیمار کوئی اچھا ادبی نمونہ نہیں بن سکا۔ ہاں موضوع کے اعتبار سے بیمار کا موضوع انارکلی کی رومان انگیز فضا سے الگ تھا اور اس طرح اردو ڈراموں کی جیسی بھی روایت تھی اس سے بیمار کا موضوع بالکل الگ تھا۔ ایک غریب بیمار عزیز ایک متمول عزیز کے یہاں مہمان ہوتا ہے اور تپ دق کے مرض میں گرفتار ہے۔ متمول عزیز، اس کی بیمار کا خیال نہ کر کے اسے اسپتال میں پھنکوا دیتا ہے تو اس کی بیوی اس کی تیمارداری کو انسانیت کا فرض سمجھ کر اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے تا کہ بیمار کی اچھی طرح خبر گیری ہو سکے۔ یہیں سے کشمکش شروع ہوتی ہے اور میاں بیوی میں ایک طرح کا ذہنی اختلاف بھی۔ یہ

ڈرامہ ایک طرح کے ذہنی رویے کا دوسرے ذہنی رویے سے ٹکراؤ ہے۔ ڈرامہ میں سواڈائیلاگ کے اور کچھ نہیں اور نہ یہ اچھی طرح اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بھی کہ سجاد ظہیر کے سامنے شاید اس کی STABILITY کا مسئلہ اتنا اہم نہ تھا جتنا کہ اس ذہنی رویے کے اظہار کا جو ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔ جس آگ میں ہندوستان اس وقت جل رہا تھا، اس میں یہ ذہنی انقلاب ہی اہم چیز تھا۔ اور یہی کوشش سجاد ظہیر کی ہر تخلیق میں جھانکتی نظر آتی ہے۔ وہ ہر شعبۂ ادب اور فکر میں ایک تبدیلی کے خواہاں تھے۔ شاید فنی اہمیت ان کی نظر میں اتنی وقیع نہ تھی جتنی کہ وہ تبدیلی جو وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دے سکے اور نت نئی کروٹیں لیتی ہوئی زندگی کے پیچ و خم کا ادراک کر سکے۔ ایسے پیچ و خم جن سے اس دور کے انسان گزر رہے تھے۔ سجاد ظہیر کی یہ کوشش اور خواہش انکی تحریروں میں بار بار ابھرتی رہتی ہے۔ روشنائی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''ہم چاہتے ہیں کہ ترقی پسند دانشور، مزدوروں اور کسانوں، غریب اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں، ان کے جلسے اور جلوسوں میں جائیں، انھیں اپنے جلسوں اور کانفرنسوں میں بلائیں۔ اس لئے ہم اپنی تنظیم میں اس پر زور دینا چاہتے تھے کہ دانشوروں کے لئے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قرب ضروری ہے۔ بلکہ نیا ادب بغیر اس کے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہماری انجمن کی شاخیں گوشہ نشین علماء کی ٹولیاں نہ ہوں بلکہ ان میں حرکت بھی ہو---- ادیب اور شاعر، عام لوگوں سے ملتے جلتے رہیں۔ ان میں پیوست رہیں، ان سے سیکھیں اور انھیں سکھائیں----- یہ ایک ایسا جاندار ادبی ادارہ ہو جس کا عوام سے براہ راست اور مستقل تعلق رہے۔'' (روشنائی ۹۱)

یہ صحیح ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قلم کی روشنائی خشک نہ ہو۔ ہمارے موضوعات ادب میں باسی پن نہ آئے، ہمارے ذہن اور فکر کو روز نئی غذا ملتی رہے تو ہمیں اپنا رابطہ، عوام سے جوڑے رکھنا چاہئے۔ محنت اور متوسط طبقے کی سماجی زندگی سے بہتر اور کوئی موضوع ادب کے لئے ممکن نہیں۔ گورکی نے ایک موقع پر بہت اچھی بات کہی تھی:۔

"The Richest Treasure House of Language is to be found in the speech of simple people, among the folklore and storeis of the people there is to be found the greatest enrichment of language and literature."

لیکن ہم نے بہ حیثیت ترقی پسند ادیب بھی، ابھی تک اس سادگی کو گرفت میں نہیں لیا جو محنت کش طبقے کی سادگی ہے، جو متوسط طبقے کی پیچیدہ سوسائٹی یا سماجی زندگی کی تہوں میں چھپی ہے۔ ہماری ساری کوشش ''سوسائٹی'' کی چمک دمک اور گاہے ماہے اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرنے ہی میں صرف ہوتی ہے اور اس طرح ہم جیسے بہت سے لوگ، جو متوسط طبقے سے خود بھی آتے ہیں۔ ''سوسائٹی'' کا ایک پرزہ بن جاتے ہیں۔ اور اپنی وہ سطح چھوڑ دیتے ہیں جس کے وہ بہترین نباض ہو سکتے تھے۔

جب ہم اپنی سطح کو چھوڑ کر تہذیب کی اس چمک دمک کے اسیر ہونے لگتے ہیں جو ہمیں اسٹیبلشمنٹ کی

طرف لے جاتی ہے تو ہم اپنی سطح کے گرد و پیش سے دور ہو جاتے ہیں اور پوشیدہ طور پر اپنا ذہن اپنی صلاحیتیں بیچنے لگتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' کے بہت سے کرداروں سے لے کر ہندوستان اور بیرون ہند بھی بہت سے ترقی پسند ادیبوں کی طرح۔ اور یہ بات کوئی حیرت خیز بات نہیں۔ انگریزی ادب میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور ایچ۔ جی۔ ویلس محنت کش طبقے سے آئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی سطح چھوڑ کر ''سوسائٹی'' حاصل کرنے کے شوق میں مصلحت پسندی سے کام لیا۔ اور اس تہذیب کے کل پرزے بن گئے جو تمام ذہنوں کو تھوڑی سی چمک دمک دکھا کر کھینچ لیا کرتی ہے۔

''لندن کی ایک رات'' کے کردار ہندوستان کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے لندن تعلیم کی غرض سے جاتے ہیں۔ انھیں اپنے ملک میں بیروزگاری اور مفلسی کا پورا احساس رہتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ہندوستان واپس جا کر خود ان کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن ان تمام تلخ حقیقتوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی، بھول جانے کے لئے وہ اس چمک دمک والی تہذیب سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں وہ وقتی طور پر انھیں سکون بخش سکتی ہے۔ لیکن وہ کردار جن کا شعور بیدار احسان، راؤ اور نعیم کی طرح وہ زندگی اور تاریخ کی صحیح نبض کو گرفت میں لیتے ہیں اور یہی لندن کی ایک رات کا تاریخی اور عمرانی شعور ہے۔

''تم سب رئیس، بنئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے۔ بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔ احسان نے اپنے کرخت پنجابی لہجے میں کہا۔''

راؤ، اعظم سے کہتا ہے:۔

''خیال تو کرو، ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی جس میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ، بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کریں اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سوئیز کے اس پار تو ہم سب کالا لوگ ''نیٹوز'' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینئر مگر ہندوستان میں وہی نیٹو کے نیٹو رہو گے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود اس کے پھر الٹ کر انھیں 'سرکار سلام' 'خداوند' 'ماں باپ' کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے

ناپید ہوجانا ہی بہتر ہے۔''

رالف فاکس نے اپنی کتاب ناول انڈ دی پیوپل (NOVEL AND THE PEOPLE) میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ ان کی مشہور میگزین اسپکٹیٹر س میں کوئی ای۔ ایچ کار تھے جنھوں نے گوری کے متعلق لکھا کہ گوری کے نے اپنی کیپری کی زندگی میں بدقسمتی سے سیاسی ناول لکھنا شروع کیا۔ یہی ناول اس کی ناکامیابی کا سبب بنے۔ آج کوئی ان کے نام تک نہیں جانتا۔ اس پر رالف فاکس نے سامعین سے دریافت کیا کہ کیا گورکی کا ناول ''ماں''، ایسا ہی ناول ہے جس کا کوئی نام نہیں جانتا۔ یا ماں ایسا ناول ہے جس نے ناول کی دنیا میں سیاست کے موضوع کو ایک اہم موضوع بنا دیا؟ شاید دنیا کے بہت سے لوگوں نے ماں کو پڑھ کر پہلی دفعہ سمجھا کہ سیاست ناول کے لئے کتنا کارآمد موضوع ہوسکتا ہے۔ یہاں اس مقالے میں رالف فاکس کی یہ بات پیش کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ لندن کی ایک رات پر بحث کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار نے ایک جگہ لکھا کہ ''یہ ناول مقصدیت سے عاری ہے۔ اس میں ٹھوس واقعیت اور تبلیغی ذہنیت نہیں ملتی۔ نہ اس میں طبقاتی کشمکش ہے اور نہ اس کے کردار کسان مزدور ہیں اس کے مسائل روزی روٹی سے وابستہ نہیں اور نہ اس کا مقصد سماج کے استحصالی مزاج و افراد کو بے نقاب کرنا ہے۔'' اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ چوں کہ اس ناول میں ایسا کچھ نہیں ہے، اس لئے یہ ناول اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم ناول ہے۔ جو اقتباسات 'لندن کی ایک رات' سے اوپر پیش کئے گئے ہیں وہ خود اس مفروضے کا جواب ہیں کہ اس ناول کا اصل موضوع کیا ہے اس میں شک نہیں کہ شعور کی رو کا استعمال 'لندن کی ایک رات' سے پہلے شعوری طور پر اردو ناول کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ لیکن یہ سوچنا درست نہیں کہ سجاد ظہیر کی یہ تخلیق، محض ایک مغربی ٹیکنیک کے استعمال کے لئے پیش کی گئی تھی جس کا موضوع سے کوئی خاص علاقہ نہیں تھا۔ 'لندن کی ایک رات' ہندوستان کے ایسے ذہنوں کی تصویر ہے جو امید و بیم، مایوسی اور خوف کے جذباتی ہیجان سے ۱۹۳۰ء کے گرد و پیش گزر رہے تھے۔ زندگی کی معلومات کے لئے فن سے اس کا وابستہ ہونا لازمی بات ہے۔ کوئی ذہنی تخلیق اپنے دور کی زندگی سے الگ ہوکر، نہ خوبصورت ہوسکتی ہے، نہ تخلیقی اور نہ زندگی کی معلومات کو بے جان طریقے سے پیش کر کے یا مبہم انداز میں ان کا اظہار کر کے کوئی ادیب زندہ رہ سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات لینن نے ایک بار ادیبوں کے لئے کہی تھی۔ کوئی دور حیات تحریکات اور تضادات سے خالی نہیں ہوتا۔ اور 'لندن کی ایک رات' میں ایسے دور حیات کے فکری نقوش ملتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ سوچنا کہ یہ محض لندن میں ہندوستانی طالب علموں کی عیش کوشی کی داستان ہے جو ایک خاص اسٹائل میں پیش کی گئی ہے اور اسی لئے اس ناول کو قبولیت کی سند ملی ہے، ایک گمراہ کن محاسبہ ہے۔ ہاں اس ناول میں بھی افسانوں کی طرح سجاد ظہیر نے نئے طرز کی ناول نگاری کے امکانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک طرف آگے بڑھ کر 'ٹیڑھی لکیر اور شکست' بنتے ہیں اور دوسری طرح اسی میں سے وہ مزاج بھی پیدا ہوتا ہے جو عزیز احمد کے گریز، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی اور شبنم کا مزار بنتا ہے۔

بلکہ لندن کی ایک رات، آگ کا دریا، اور آخر شب کے ہم سفر پر بھی سایہ فگن ہے، موضوع کے اعتبار سے بھی اور شعور کی رو والی ٹیکنیک کے لحاظ سے بھی۔

سیاست کی عملی زندگی نے سجاد ظہیر کی تخلیقی صلاحیتوں کو وہ موقع نہ دیا جو انھیں ملنا چاہئے تھا۔ اگر انھوں نے اپنا میدان عمل صرف تخلیقات تک محدود رکھا ہوتا تو اردو ادب کو ایک عظیم فنکار ان معنوں میں بھی ملتا۔ نہ معلوم کتنی تخلیقات اور حسرت تخلیق ان کے ذہن میں دفن رہ گئیں۔ ان کے خطوط 'نقوش زنداں' کا مطالعہ کیجئے تو کتنی ہی کتابوں کے خاکے اور تصنیفی خواہشات ملتی ہیں۔ ان خطوط سے اس کرب تخلیق کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس سے سجاد ظہیر گزر رہے تھے یا جن کو کاغذ پر پیش کرنے کی انھوں نے کوشش کی۔ کچھ مضامین بھی جیل کی زندگی میں رجعت پرستوں کے جواب میں لکھے۔ ان میں سے ایک مقالہ 'غلط رجحان' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں چھپا۔ جب وہ پاکستان میں قید تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۷ء میں 'شعر محض' کے نام سے، فرانس کی انحطاطی شاعری پر ایک قابل قدر مقالہ پیش کیا۔ سید احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جو کتاب انھوں (سجاد ظہیر) نے جیل میں لکھی وہ شائع نہ ہوسکی۔'' یہ بات احتشام حسین نے اپنے ایک مقالہ میں لکھی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ ہوسکتا ہے کہ 'روشنائی' کے علاوہ وہ بھی کوئی ایسی ہی تخلیق رہی ہو جو شائع نہ ہوسکی۔ ان کا ایک بہت ہی اہم مقالہ 'یادیں' کے نام سے ۴۰-۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ میں نے وہ مقالہ نہیں دیکھا۔ مگر جو تفصیلات اور حوالے اس مقالے کے کہیں کہیں ملے ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالبا وہ مقالہ 'روشنائی' میں شامل کرلیا گیا ہے۔ غالباً یادیں ہی روشنائی کا ابتدائی حصہ ہے۔

بہر حال 'روشنائی' میرے نظر میں سجاد ظہیر کی سب سے اہم کتاب ہے۔ اہم ان معنوں میں کہ روشنائی کے ذریعہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسندی جو ہندوستانی ادب کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ اس کی کما حقہ، تاریخ خود اس انجمن کی داغ بیل رکھنے والے کے قلم سے پیش کی گئی ہے۔ 'روشنائی' تحریک کی تاریخ ہے۔ رپورتاژ ہے، ترقی پسند ادب کا دستور العمل ہے۔ اور ایک ایسی دستاویز ہے جس کے بغیر ترقی پسند ادب کے ذہنی اور فکری ارتقا کو سمجھنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کے اس دور کے نثری ادب کا دلنشیں نمونہ بھی۔ سجاد ظہیر کا قلم ایک مصور کے موقلم کی طرح ہر ہر موقع کی ایسی تصویریں پیش کرتا ہے جس میں سماجی حقیقت نگاریاں بھی ہیں، ادبی چاشنی بھی اور ایک مورخ کا محتاط قلم بھی۔ جہاں تحریک کے مخالفین پر نکتہ چینی کی گئی ہے وہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا جذبہ بھی کارفرما ہے جس سے بوئے عناد دور رہتی ہے۔ ان کی شخصیت کا ہالہ، تمام ایسی کیفیتوں کے گرد گھیرا ڈالے ہے جو دوسری صورت میں مخالفت کا ایک تناور درخت ہوسکتی تھیں۔ اس کے باوجود ترقی پسند ادب کے مخالفوں کی تعداد کم نہیں ہوسکی۔ نیاز فتح پوری کی ایک تصویر یوں پیش کی گئی ہے۔

''ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز

صاحب کے یہاں بیٹھے تھے اور نیازؔ صاحب اس کے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی ان کے واسطے سواری لے کران کے مکان پر پہنچے تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد ساغرؔ تو تانگے پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس تک آ گئے۔لیکن مولانا نیازؔ اس لئے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انھیں لانے کے لئے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ساغرؔ صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ مولانا نے کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ایک مقالہ بھی سپردقلم فرمایا تھا۔ان باتوں کو سن کر ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ادباء پریم چندؔ اور حسرتؔ موہانی بالکل دوسری طرح ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے سفر کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجے میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگھوں پر ٹھہرے تھے۔ یقیناً ان لوگوں میں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا۔ جو اپنے لکھنؤ کے مکان سے جو رفاہ عام سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر تھا، کانفرنس کے ہال تک سواری نہ پہنچنے کی وجہ سے نہیں آسکتے تھے۔''

اس کے برعکس پریم چندؔ جس طرح اچانک سجاد ظہیرؔ کے گھر پہنچتے ہیں، اس سے ان کا انکساران کی بھلمنساہٹ اور ان کی ادب دوستی نمایاں ہے۔ وہ لوگ یقیناً انسانیت کی منزل میں چھوٹے ہیں جو کسی ادبی محفل میں ایسے شتر غمزے دکھاتے ہیں جس طرح نیازؔ فتحپوری کے واقعے سے عیاں ہے۔ یہ بات اس متوسط طبقے کی ذہنیت کی غماز ہے جو اردو کے مشاعروں کی فضا میں بارآور ہوئی ہے روشنائی میں ایسی بہت سے خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔حسرت موہانیؔ کی تصویر، پریم چند کی تصویر اور جینندر کمار کی تصویر۔سب اپنی جگہ عہد آفریں۔

روشنائی اپنے دور کی ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی اور فکری زندگی کا جیسا احاطہ کرتی ہے آزادی حیات'' کے علاوہ شاید ہی کوئی اور دوسری مثال ملے۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو نہ صرف ادب کا نباض ہو بلکہ تاریخ کے قدموں کے دھمکوں اور وقت کی آواز کو بھی پہچانتا ہو۔ساتھ ہی ساتھ اپنی بے لاگ قوتِ اظہار پر بھی قدرت رکھتا ہو۔سجاد ظہیرؔ یہ باتیں روشنائی میں اکیڈمک ڈھنگ سے نہیں بلکہ اسی بے لاگ قوت اظہار اور تاریخی پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ پریم چندؔ، ٹیگورؔ، حسرت موہانیؔ، احمد علیؔ اور خود ترقی پسند تحریک کے ارتقا اور تنزل، سب کا تجزیہ اسی قوت اظہار کے ساتھ ملتا ہے۔ٹیگور کے متعلق جو ایک طبقہ میں دیومالائیت کا جذبہ ملتا ہے، روشنائی میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہاں سجاد ظہیرؔ کی نظر میں ٹیگورؔ کا فن عوامی زندگی سے الگ ہوتا ہے جہاں وہ سامراج کی چالوں کو سمجھتے ہوئے بھی ان پر کھل کر تنقید نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسے مسائل سے شاید ادب کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ایک عام بورژوا فنکار کی طرح ٹیگورؔ بھی ادب کو صرف ملکوتی صفات کا حامل سمجھتے تھے۔ادب کی دنیا میں ایسی صورتیں اکثر پیش آتی رہی ہیں۔اچھے سے اچھے فنکار بھی اپنے دور کے ماقبل کے معیاروں سے جب گرد و پیش میں ایسی تبدیلی پاتے جو انھیں کسی وجہ سے پسند نہ ہوتی تھیں تو اس تبدیلی سے کتراتے تھے۔اگرچہ وہ تبدیلیاں ان

کے گرد و پیش کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب لا رہی ہوتیں جن سے سارا سماجی ڈھانچہ بدلتا ہوتا۔ گوئٹےؔ، اپنی فکر و نظر کی دنیا میں خود کو ایسا محصور کئے ہوئے تھا کہ انقلابِ فرانس کو اس نے پہلے پہل کوئی اچھی چیز نہ سمجھا لیکن جب رفتہ رفتہ انقلاب فرانس کا چمتکار اس پر منکشف ہونے لگا اور اس نے بہت غور سے ان تبدیلیوں کو محسوس کیا جو انقلاب فرانس کی وجہ سے سماجی حالات، جمالیاتی مذاق اور سیاسی رجحانات میں رونما ہو رہی تھیں تو اس کی تخلیقات سے تمام ایسی فرضی اور خیالی باتیں دور ہونے لگیں جن کا اس انقلاب سے پہلے اس نے کوئی تصور نہیں کیا تھا۔ کچھ ایسا ہی ٹیگورؔ کے ساتھ بھی ہوا۔ اپنی آخری عمر میں ان کا نقطۂ نظر بھی بدلنے لگا تھا اور انھیں اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے یہ بات بہت دیر میں محسوس کی۔ ہندوستان کی عام زندگی سے الگ رہ کر انھوں نے اپنا بڑا نقصان کیا۔ روشنائیؔ میں اس مسئلے پر بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور ٹیگورؔ کے اس پیغام کے کچھ حصے پیش کئے گئے ہیں جو انھوں نے کلکتہ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر بھیجا تھا۔ یہاں اس کے دو ایک جملے پیش ہیں:۔

''ادیبوں کو انسانوں میں مل جل کر انہیں بھی پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے بڑی غلطی کی۔ اب میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوگا تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔'' (روشنائی ۲۲۷)

اپنی آخری عمر میں سجاد ظہیرؔ نے شاعری کی طرف بھی بالقصد توجہ کی اور ایک مجموعہ '' پگھلا نیلم'' کے نام سے مرتب کیا۔ اگرچہ اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں بھی وقتاً فوقتاً وہ نظمیں لکھتے تھے مگر باقاعدہ شاعری کی مثال ان کا یہی مجموعہ پگھلا نیلمؔ ہے۔ یہ بات ابتدا ہی میں کہی گئی ہے کہ سجاد ظہیرؔ کو ہر صنف ادب میں جسے انھوں نے برتا، ایک ہراول کی حیثیت حاصل رہی۔ '' پگھلا نیلم'' ترقی پسند شاعری میں نئی جہت کی طرف ایک پانیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پابند نظمیں بھی ہیں اور نثری نظمیں بھی۔ یہ مجموعہ نومبر ۱۹۶۴ء میں دلی سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچے میں بہت دلچسپ بحث نظموں میں پابندی اور عدم پابندی پر کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے:۔

''میرا خیال ہے کہ اصلی اور اچھی شاعری، بحر، وزن یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جاسکتی اور ان کے بغیر بھی۔''

☆☆☆

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، ملّا سے نہ پوچھ
ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
(علّامہ اقبال)

حمایت علی شاعر (کراچی)

سجاد ظہیر۔ ہمارے بنے بھائی

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی کا نام زباں پر آتے ہی تصور میں ترقی پسند ادب کی تاریخ جاگ اٹھتی ہے اور ساتھ ہی وہ الزامات بھی جو مخالف حضرات ان اہل ادب کو عطا کرتے رہے۔ پاکستان میں مذہبی اور سیاسی لوگوں کے علاوہ کچھ نام نہاد ادیب وشاعر بھی ترقی پسند اہل قلم کو مختلف ''اعزازات'' سے نواز چکے ہیں پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی ادبی انجمن، کو سیاسی انجمن قرار دے دیا گیا۔ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے اور تمام ذرائع ابلاغ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سجاد ظہیر تو اس انجمن کے سرخیل تھے۔ انہیں کیا کچھ نہیں کہا گیا ہوگا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں نئی نسل کی معلومات کے لیے عرض کروں گا کہ جس ادبی انجمن کو اتنا مطعون کیا گیا اس کے انداز فکر کا آغاز علامہ اقبال کی شاعری سے ہوتا ہے۔ (علامہ اقبال ۔۔جن سے پاکستان کا وجود منسوب ہے)

اک ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیے۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1917ء) کے بعد دنیا کن مسائل کی شکار تھی۔ کیسے کیسے تغیرات رونما ہوئے۔ ''انقلاب روس'' (1917ء) کو دنیا میں فکری انقلاب کا عظیم محرک سمجھا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں غالبؔ اور حالیؔ کے بعد ''آفتاب آمد۔ دلیل آفتاب'' کے مصداق۔۔۔ادب کو نیا شعور عطا کرنے والے شاعر علامہ اقبال کی معرکتہ الآرا نظم ''خضر راہ'' اسی انقلاب کی ترجمان ہے اور پہلی بار ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ ؎ افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

اس کے بعد ''بالِ جبریل'' کی نظمیں۔ ''خدا کا فرمان، فرشتوں کے نام''

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور پھر۔۔''لینن۔۔خدا کے حضور میں'' ایسی فکر انگیز نظم، جس میں علامہ اقبال نے اپنی خدا پرستی سے لینن کو نواز کر اس کے خیالات کو اپنایا اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ؎ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اردو شاعری میرؔ، نظیرؔ، اور غالبؔ کے فکری اور جذباتی ہیجانات سے بخوبی آگاہ تھی اور غالبؔ کے الفاظ میں

کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب آگاہِ رقیب

کے حوالے سے عشق میں بھی فرہاد کی طبقاتی حیثیت کو سمجھ چکی تھی۔ اقبال کے کلام کی روشنی میں اس کی اگلی منزل سے بھی باخبر ہو گئی۔ ؎ گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا

اور جب انہوں نے کارل مارکس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ

آں کلیمِ بے تجلی، آں مسیحِ بے صلیب — نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور کارل مارکس کی کتاب ''داس کیپٹال'' کو الہامی کتابوں کی صف میں شامل کر دیا۔ تب اردو شاعری کو ایک نیا زاویہ فکر ملا۔ اسی زاویہ فکر نے ادب کی نئی نسل کو وہ روشنی عطا کی جس کے سرخیل کا نام سجاد ظہیر ہے۔ سرسید نے بھی مغرب سے ابھرنے والے سورج سے روشنی لی تھی۔ سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء نے بھی اسی سورج کو نصف النہار پر دیکھا اور اس کی کرنوں سے نیا ادب تحریر کیا۔

ترقی پسند مصنفین کی نظریاتی بنیاد انگلستان میں رکھی گئی۔ سجاد ظہیر، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''انگارے'' وہیں مرتب ہوا اور 1942ء میں ہندوستان سے شائع ہوا۔

علامہ اقبال نے اسلام کی نئی تعبیر کرتے ہوئے اپنے اشعار میں ملّا اور مولوی کی جو مضحکہ خیز شکل دکھائی تھی ''انگارے'' میں سجاد ظہیر کی کہانیاں جنت کی بشارت' پھر یہ بنگلہ اور نیند نہیں آتی وغیرہ بھی اسی ملائیت کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ''انگارے'' کے مصنفین نے مسلم معاشرے کے اور پہلوؤں کو بھی نشانہ بنایا اور ان حقیقتوں کو طشت از بام کیا جو طبقات کے نشیب وفراز میں آنکھ اوجھل تھیں۔

سجاد ظہیر نے انہیں دنوں ایک ناولٹ بھی لکھا تھا۔ ''لندن کی ایک رات'' جو ۸۳۹۱ء میں لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ اس ناولٹ میں تکنیک بھی قدرے نئی استعمال کی گئی یعنی شعور کی رو۔ ''آزاد تلازمہ خیال'' جو پہلے فرانسیسی مصنفین نے اختیار کی تھی۔ فرانسیسی ماہرین نفسیات کے نقطہ نظر سے شعور کی یہ رو حقیقتاً انسان کی باطنی زندگی کی رو ہے جو ''خارج'' سے بے نیاز ہوتی ہے لیکن سجاد ظہیر نے مارکس کے جدلیاتی فلسفے کی روشنی میں اسے خارجی زندگی سے بالکل بے نیاز نہیں رکھا۔ وہ ناول کے کرداروں میں آئینہ وعکس کے مانند جاری رہتی ہے۔ علی عباس حسینی نے اس ناولٹ کو جیمس جوائس کے یولی سس سے ہم رشتہ کیا ہے۔ ''وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا۔ یہاں لندن کی ایک رات ہے۔ وہ تحت الشعور کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ جیمس کی تمثیلات۔''

بہر حال یہ تجزیہ غور طلب ہے۔

سجاد ظہیر ۵۱۹۱ء سے افسانے لکھ رہے تھے۔ ان کے ابتدائی افسانے ماہنامہ ''زمانہ'' (کانپور) اور رسالہ ''جامعہ'' (دہلی) میں شائع ہوئے۔ ''لندن کی ایک رات'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران

لکھی گئی تھی۔ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام۶۳۹۱ء میں عمل میں آیا۔''انگارے'' کی ضبطی اور ترقی پسند مصنفین پر مختلف الزامات کی تفصیلات ہم سب کے ذہن میں ہیں۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے اہل قلم سے کس طرح رابطہ قائم کر کے ہر بڑے شہر میں انجمن کی شاخیں قائم کیں۔

پریم چند سے لے کر مولوی عبدالحق، حتیٰ کہ سید سلیمان ندوی تک کی سرپرستی اس انجمن کو حاصل رہی۔مولانا حسرت موہانی تو سرعام خود کو''اشتراکی مسلم'' کہتے تھے(اس سلسلے میں ان کے اشعار بھی موجود ہیں) سجاد ظہیر خود بھی کمیونسٹ پارٹی کے''ہول ٹائم ورکر'' بن چکے تھے لیکن انجمن کو انہوں نے اپنے نظریات کا پابند نہیں رکھا۔وہ رابندناتھ ٹیگور اور علامہ اقبال دونوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اپنی مصروفیات سے انہیں آگاہ رکھا۔ علامہ اقبال سے ان کی ملاقات کا احوال مختلف اہلِ قلم نے لکھا ہے۔علامہ ان کی کارکردگی سے متاثر بھی تھے۔ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

''میرا نقطہء نظر آپ جانتے ہیں۔ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک سے ہمدردی ہے۔آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں۔''

سجاد ظہیر کا خاندانی پس منظر سبھی جانتے ہیں۔وہ سر وزیر حسن کے چوتھے صاحبزادے تھے۔بیرسٹر ایٹ لاہو کر انگلستان سے آئے تھے۔رئیس اور اہلِ اقتدار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔اس کے باوجود(انہوں نے عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنا مناسب سمجھا۔وہ لکھنو سے بمبئ آ گئے اور کمیونسٹ پارٹی کے اخبار''قومی جنگ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ان کی شادی بھی ایک بڑے گھرانے میں ہوئی تھی۔رضیہ سجاد ظہیر جو خود بھی ایک بڑی ادیبہ تھیں۔ان کے کئی ناول ہیں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک وفادار رفیقہ حیات کی طرح بمبئ کے چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی گزارتی رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بنے بھائی پاکستان آ گئے تھے اور پھر راولپنڈی سازش کیس کا افسانہ سبھی کو معلوم ہے۔ ۱۵۹۱ء میں کچھ فوجی افسران کے ساتھ فیض احمد فیض اور سیّد سجاد ظہیر دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔وہ چار سال جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن دونوں اہلِ قلم نے جیل میں ایسی کتابیں لکھیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔فیض کے دو مجموعہ کلام''دستِ صبا''اور''زندان نامہ''(جس کا''سرِ آغاز'' سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔)اور ایلس فیض کے نام ان کے خطوط''صلیبیں مرے دریچے میں''اردو شعر و ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔اسی طرح سجاد ظہیر کے خطوط (اپنی رفیقہ حیات کے نام)''نقوشِ زنداں'' کے نام سے شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ان کی دو اہم کتابیں''ذکر حافظ''اور''روشنائی''جیل ہی کی یادگاریں ہیں۔''ذکر حافظ'' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ماضی کے ادب سے کتنے باخبر تھے اور اس کا مطالعہ کس زاویے سے کرتے تھے۔حافظ شیرازی کی شاعری کو انہوں نے جس انداز میں سمجھا وہ ترقی پسند نظریہ حیات کا ایک نیا زاویہ ہے۔''روشنائی'' انجمن ترقی پسند مصنفین کی پوری تاریخ ہے۔تمام

حوالوں اور اہم ترین شخصیتوں کے تذکروں کے ساتھ بنّے بھائی نے ہر واقعہ اتنے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری کے ہاتھ سے کتاب نہیں چھوٹتی۔سجاد ظہیر ایک باعمل انسان تو تھے ہی مگر وہ شاعر بھی تھے۔جیل میں فیض کی رفاقت میں انہوں نے غزلیں بھی لکھیں۔

کیپٹن ظفر اللہ پوشنی جیل کی یادداشتیں''زندگی زنداں دلی کا نام ہے'' میں لکھتے ہی۔

''حیدر آباد سنٹرل جیل میں قیام کے دوران ہم نے کم از کم گیارہ بارہ مشاعروں کی محفلیں برپا کیں۔فیض کا تخلص کاہلؔ، میجر حسن کا تخلص جاہلؔ، اور میں یعنی ظفر اللہ پوشنی کا تخلص خبیثؔ۔ایر کموڈور جنجوعہ کا تخلص پٹاخہؔ، میجر اسحاق کا تخلص ڈنگاؔ یعنی تیڑھا۔جنرل نذیر احمد کا تخلص سارسؔ۔کیپٹن خضر حیات کا تخلص پپٹوؔ، محمد حسین عطا گوسفندؔ، میجر جنرل اکبر خاں کا تخلص فتوریؔ اور لفٹیننٹ جنرل ضیاالدین کا تخلص گڑبڑؔ رکھا گیا تھا۔بریگیڈیئر صدیق خان کا تخلص مصدقؔ اور بریگیڈیئر لطیف خان کا تخلص خبطی تھا مگر انہوں نے ہمیں ایک شعر بھی نہیں سنایا۔دوسرا مشاعرہ ۳/مئی ۳۵۹۱ء کو یعنی ہمارے مقدموں کے فیصلے اور ہمیں سزائیں مل جانے کے چار مہینے بعد ہوا۔یہ آخری مشاعرہ تھا۔مصرعہ، طرح تھا۔

شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے ان دنوں

میری غزل کے بعد فیض صاحب نے سجاد ظہیر سے فرمائش کی، ان کی غزل کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔

شعلے لپک رہے ہیں، چراغاں ہے ان دنوں
دل کی جراحتوں سے بہاراں ہے ان دنوں

صدق و صفا و علم، تبہ حال و سرنگوں
کذب و ریا و ظلم، نمایاں ہے ان دنوں

ملبوس زرنگار میں قحبائے زِشت اف
لیلائے حسن خاک بداماں ہے ان دنوں

انساں پہ ہے وحوش و بہایم کی سروری
افسوس، ارض پاک بیاباں ہے ان دنوں

خنداں ہے ملک بیچ کے امریکنوں کے ہاتھ
جو مسخرا وطن کا نگہبان ہے ان دنوں

انسان وہ ہے، ظلم سے پیکار جو کرے
''شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے ان دنوں''

بنّے بھائی کی غزلوں کا ذکر بہت کم کتابوں میں ملتا ہے۔علی سردار جعفری نے اپنے رسالے''گفتگو'' میں ان کی ایک غزل شائع کی تھی۔یہ غزل فیض کی زمین میں ہے۔پہلے فیض کا ایک مشہور شعر سنا دوں۔

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

بنّے بھائی کی غزل ملاحظہ فرمایئے۔

جب وہ اٹھتے ہیں مٹانے خم کا میخانے کا نام
شورش مئے سے چمک جاتا ہے پیمانے کا نام

کچھ تو بدنامی کا کھٹکا، کچھ گرفتاری کا ڈر
آج کل لیتے نہیں وہ اپنے دیوانے کا نام

شیخ صاحب بھی لگے آتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ
اور پھر حضرت کبھی لیتے نہیں، جانے کا نام

سازِ آزادی کے نغمے تیز ہوتے ہیں یہاں   کون کہتا ہے کہ یہ زنداں ہے، غم خانے کا نام

سجاد ظہیر، روایت آشنا ہوتے ہوئے جدّت پسند بھی تھے۔ ان کے افسانے اور ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' تکنیک کے حوالے سے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ ''بیمار'' وہ بھی ایک مثالی تخلیق تھا۔ جیل کے دوران غزلوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں اور پھر جیل سے رہائی کے بعد بھی لکھتے رہے۔ انہوں نے زیادہ تر نثری نظمیں لکھی ہیں۔ (اس وقت نثری نظموں کا رواج نہیں تھا)

۱۹۳۵ء میں ماہنامہ ''کنول'' (آگرہ) میں سعادت حسن منٹو کی ترجمہ کردہ کچھ جاپانی نظمیں ''نثری نظمیں'' کے عنوان سے چھپی تھیں۔ شاعر کا نام تھا۔ ''زیونی سنٹو گوئنی۔'' پھر منٹو صاحب کی تخلیق کردہ دو نثری نظمیں ان کے ایک ایسے مضمون میں بھی ملتی ہیں جو انہوں نے ''جدید تر شاعری'' کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھی تھیں۔ (یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے) میں نے یہ مضمون اپنی کتاب ''شخص و عکس'' (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں بھی حوالے کے طور پر شامل کیا ہے۔ ماہنامہ ''شاعر'' (بمبئی) کے ''نثری نظم نمبر'' (۱۹۸۳ء) میں شاہد شیدائی لکھتے ہیں۔

''۱۹۳۶ء کے بعد سجاد ظہیر نے اس طرح کی شاعری کی۔ پھر اختر الایمان کے رسالے ''خیال'' (بمبئی) مطبوعہ ۱۹۴۸۔۴۹ء میں میراجی کی چند نثری نظمیں ''بسنت سہائے'' کے فرضی نام سے شائع کی گئیں۔''

سجاد ظہیر کی نثری نظموں کا مجموعہ ''پگھلا نیلم'' ہندوستان سے شائع ہوا تھا اور پھر غالباً ۶۲ء میں پاکستان سے بھی چھپا اور عرصہ دراز تک زیر بحث رہا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد بنّے بھائی کو ہندوستان بھیج دیا گیا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں وہیں تھیں۔ پھر انہیں پاکستان آنے نہیں دیا گیا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے انہیں پاکستان آنے کی اجازت ملی تھی مگر وہ اس دنیا ہی کو چھوڑ گئے۔

میں نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان ہجرت کی تھی۔ اس وقت وہ گرفتار تھے۔ میرے دل میں انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ آخر ایوب خاں کے زمانے میں جب دونوں ملکوں کے شعراء مشاعروں میں آنے جانے لگے مجھے بھی دہلی جانے کا موقع مل گیا۔ سر شنکر لال اور مرلی دھر شاد کی فیکٹریاں دہلی میں تھیں اور لائکپور میں بھی۔۔ دونوں بڑے ادب نواز تھے اور مرلی دھر تو شاعر بھی اچھے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کچھ پاکستانی شعراء حضرت حفیظ جالندھری، تابش دہلوی، ماہر القادری، سیّد محمد جعفری، شوکت تھانوی، قتیل شفائی وغیرہ کے ساتھ میں بھی دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں مدعو تھا۔ بنّے بھائی نے ہم سب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے پہلی بار انہیں اور رضیہ بھابی کو دیکھا اور ان کا گرویدہ ہو گیا۔ میں نے ان کے بارے میں جو تصوّر باندھ رکھا تھا وہ اس سے بھی اعلیٰ دکھائی دیئے۔ بنّے بھائی میرے کلام سے بھی واقف تھے۔ جنگ کے خلاف امنِ عالم کے موضوع پر میری طویل افسانوی نظم ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ میں نے جب اپنا پہلا مجموعہ کلام (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) انہیں پیش کیا تو انہوں نے اس نظم کو اس میں دیکھ کر مجھے ہدایت کی کہ اسے الگ سے بھی چھپواؤ۔ یہ نظم تمہاری پہچان ہے۔ پھر انہوں

نے میری کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار تحریری طور پر بھی کیا جو مختلف رسائل میں بطور تبصرہ شائع ہوا اور اب مجلّہ ''شخصیت'' (حمایت علی شاعر نمبر) میں ادب کی بعض بڑی شخصیتوں کے تاثرات کے ساتھ شامل ہے۔ (۱۹۹۶ء)

دہلی میں جامعہ ملیہ میں بھی ایک مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت خواجہ غلام السیّدین (مولانا حالی کے پوتے اور ہندوستان کے ایجوکیشن ایڈوائزر) فرما رہے تھے۔ بنّے بھائی نے ان سے بھی میرا تعارف کرایا۔ اس مشاعرے میں میں نے اپنی کچھ ''ثلاثیاں'' بھی سنائی تھیں۔ (اس وقت تک میں نے اس صنف کا کوئی نام نہیں رکھا تھا) دو ایک دن بعد ہمیں اپنے سفیر سجاد حیدر صاحب کا پیغام ملا کر پنڈت جواہر لال نہرو پاکستانی شعرا کو سننا چاہتے ہیں۔ ہماری خوشی کا عالم دیدنی تھا پنڈت لال نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم ضرور تھے مگر وہ ایک ادیب کی حیثیت سے بھی بڑا مقام رکھتے تھے۔ مقررہ وقت پر ہم شعرا سفیر پاکستان کے ہمراہ پنڈت جی کی کوٹھی پر پہنچے۔ پنڈت جی نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا۔

وسیع دیوان خانے میں سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پنڈت جی خود بھی سیاہ شیروانی میں ملبوس تھے اور کچھ ہندوستانی شعرا بھی۔ ان شعرا میں جگن ناتھ آزاد، ساغر نظامی اور کنور، مہندر سنگھ، بیدی سحر بھی تھے۔ خواجہ غلام السیّدین نے پاکستانی شعرا کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ میں عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔ پنڈت جی میرے پاس آئے اور ہاتھ ملایا۔ میں نے ''آگ میں پھول'' انہیں پیش کی۔ انہوں نے مختصر ورق گردانی کی اور کتاب اپنے اے۔ ڈی۔ سی کے حوالے کر دی'' مسکراتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور فرمایا۔ ''میں ضرور پڑھوں گا۔'' ''یہ میرے لیے اعزاز ہوگا'' میں نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ بنّے بھائی بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ جب میں اپنی غزل سنانے لگا تو انہوں نے ثلاثیوں کی فرمائش کر دی۔ میں نے اپنی مشہور ثلاثی سنائی۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

پنڈت جی کے علاوہ سامعین نے بھی کھل کر داد دی۔ پھر غلام السیّدین نے ایک اور ثلاثی کی فرمائش کی۔

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرار شہر علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی ''بوجہل'' تو نہیں

اس ثلاثی پر مجھے جامعہ ملیّہ میں بھی بڑی داد ملی تھی۔ وہ بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ آنکھوں سے دور چلے گئے مگر میرے دل میں آباد ہیں اور جو شخصیت دلوں میں زندہ رہتی ہے اسے وقت بھی نہیں مار سکتا۔ وہ شخصیتیں وقت کے اوراق پر بھی اپنی مہر ثبت کر دیتی ہیں۔   ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ما!

ڈاکٹر محمد علی صدیقی (کراچی)

سجاد ظہیر۔ایک نام،ایک عہد اور ایک تحریک

سوچتا ہوں کہ سجّاد ظہیر صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے.....ایک عہد اور ایک تحریک اُن کے نام سے مشخّص ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ جس شخص پر یہ تینوں باتیں بڑی حد تک صادق آسکتی ہوں وہ...سجّاد ظہیر ہے۔ مجھے اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اُن کے دوستوں، رفقاء اور خوردوں کے ذریعہ جو کچھ بھی مجھ تک پہنچا ہے اُس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔وہ شمالی ہندوستان کے ایک پابند رسوم و اقدار کلچر میں ۵ر نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔اگر وہ اُن قدرتی پابندیوں کے ساتھ باہر نکلنے کیلئے جراتِ رندانہ کا مظاہرہ نہ کرتے تو یقین مانئے کہ سر وزیر حسن کے بیٹے سجّاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک کا سُرخیل رہنما بننے میں کم ازکم ایک صدی ضرور لگتی، لیکن ہم نے دیکھا کہ سجّاد ظہیر ... سب کے بنّے بھائی نے اپنے پس منظر سے رہائی کے لئے درکار ممکنہ مدت کا فیصلہ ہفتوں اور دنوں میں طے کرلیا۔شاہد یہ سریع الحرکتی اُن کی شخصیت کا وہ جوہر ہے جو اُن کے Metamorphosis میں حد درجہ مددگار ثابت ہوا۔میں سجّاد ظہیر کی زندگی کے سنگ میلوں کی بساط پر اپنے مضمون کی بنیاد نہیں رکھنا چاہتا۔وہ ایک علمی اور ثقافتی طور پر برِّ صغیر کے چند ممتاز افراد میں شامل ہیں۔سجّاد ظہیر نے ابتدائی تعلیم جوبلی اسکول اور کرسچن کالج لکھنؤ میں حاصل کی اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں آکسفورڈ چلے گئے۔''یادیں'' اور ''روشنائی'' میں انہوں نے اپنی داستانِ زندگی کی اہم روئیداد رقم کی ہے۔ان روئیدادوں کی تحریر میں ۲۵ سال کا بُعدِ مکانی و زمانی ہے یعنی ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۴ء تک ترقی پسند سوچ، تحرک اور تنظیم کس طرح بنی۔

دوستو! ایک فرد کی سوچ کو ایک اہم ملکی تنظیم بنتے بنتے بہت مدت درکار ہوتی ہے، لیکن سجّاد ظہیر کی تنظیمی صلاحیتوں نے یہ مدت اس قدر جلد پوری کی کہ چند برسوں میں...''جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا'' کے بجائے ''جنگل کا جنگل احمریں (لال) ہوگیا'' پر بات جا کر رکی...!

سجّاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے قیام کا فیصلہ برطانیہ میں مقیم ایک طالبِ علم کی حیثیت سے کیا۔وہ یوروپ میں گذشتہ صدی کے تیسرے عشرہ میں رہے۔1930 تک Thirties کا عشرہ یوروپ میں جرمنی میں ہٹلر کے شباب کا عشرہ ہے۔ یہ جرمن قوم پر، جرمن تاریخ نگار Rank & Fichte کے طلسماتی اثرات کی دَہائی ہے۔ یہ اسپین کی

خانہ جنگی کا عشرہ ہے۔ یہ ہندوستان کے لئے گول میز کانفرنس، کمیونل ایوارڈ، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا عشرہ ہے، یہ سات صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے قیام کا عشرہ ہے۔لیکن اس عشرہ تک آتے آتے ہمیں سجّاد ظہیر کی ادبی اور سیاسی زندگی پر ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنا پڑیگا۔

سجّاد ظہیر لکھنؤ میں کالج کی زندگی کے دوران اُردو ادب، انگریزی ادب، تاریخ اور معاشیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴ میں وہ اناطول فرانس اور برٹرانڈ رسل کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھ رہے تھے۔ اناطول فرانس نے فکشن اور دوسری تحریوں میں مذہبی ریاکاری اور منافقت کا پردہ چاک کرنے میں کمال حاصل کیا تھا۔رسل حقیقت پسندی اور بائیں بازو کی طرف جھکنے والی تعقل پسندی کے وکیل تھے۔وہ مارچ ۱۹۳۰ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے براستہ مارسیلز اور پیرس، لندن روانہ ہوئے۔انہوں نے جس یونیورسٹی کا انتخاب کیا تھا وہ اپنی قدامت پرستانہ سوچ کے لئے مشہور تھی۔لیکن سجّاد ظہیر ہندوستان ہی میں بائیں بازو کی سیاست کے رسیا ہو چکے تھے۔۱۹۲۵ء برِّ صغیر میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا سال ہے۔اس پارٹی کا تاسیسی اجلاس کانپور میں منعقد ہوا جس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہ وہی حسرت موہانی جو ایک طرف تو حضرت محمدؐ کے ذکر پر اشک بار ہو جایا کرتے تھے...خود کو کرشن بھگت بھی کہتے تھے اور اشتراکیت کے اس درجہ حامی کہ

لازم ہے کہ ہو ہند میں آئینِ سوویت ۔۔۔ دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

جیسے شعر کے خالق بھی۔

اس ضمن میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھنے کا خیال جن اشخاص کو آیا اُس میں تحریک ہجرت کے بعض ایسے رہنما بھی تھے جو افغانستان اور روس ہوتے ہوئے آئے تھے۔دیکھئے کہ بنیادی طور پر ایک مذہبی نوعیت کی تحریک نے ہندوستان میں ایک انقلابی پارٹی کی Midwife کا کردار کس طرح ادا کیا۔

۱۹۲۸ء میں سجّاد ظہیر، سوئٹزر لینڈ کے سینی ٹوریم میں قیام کے بعد اشتراکی خیالات کے حامی ہو چکے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے کمیونسٹ M.P.Sakaltawala ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر اور ڈاکٹر زین العابدین احمد، (جو بعد میں زیڈ احمد کہلائے اور جن کی یادداشتیں ادارۂ یادگارِ غالب نے حال ہی میں شائع کی ہیں) کی صحبت نے منتخب راستے پر گامزن ہونے میں مزید مہمیز لگائی۔سجّاد ظہیر ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء کے زمانہ کانپور میں کچھ افسانے تحریر کر چکے تھے۔علاوہ ازیں وہ لندن میں 'نیا ہندوستان'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اور معاشی مسائل پر لکھتے چلے آرہے تھے۔یعنی سجاد ظہیر کا ذہن پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔انہوں نے انگلستان کے دورانِ قیام، فرینکفرٹ میں فسطائی طاقتوں کے خلاف منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے افسانوں کے مجموعے ''انگارے'' میں...احمد علی کا افسانہ 'بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات''، ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ 'دلّی کی سیر'' اور محمود الظفر کا افسانہ 'جواں مردی'' شامل تھے

اور ساتھ ساتھ سجّاد ظہیر کے چار افسانے ''گرمیوں کی ایک رات''، ''جنّت کی بشارت''، ''نیند نہیں آتی'' اور ''دلاری'' بھی شامل تھے۔ یہ ایک تاریخی اہمیت کی حامل کتاب تھی۔

ان افسانوں کے مرکزی خیالات میں مذہبی ریا کاری اور منافقت، ہندوستانی سماج میں عورتوں کے سقیم حالات کے خلاف احتجاج کی آواز بلند ہوئی تھی، جو آج بھی قابل توجہ ہے۔ آج بھی ہم مذہبی ریا کاری اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں آج بھی لڑکیوں کی کافی بڑی تعداد faetus ہی کے مرحلے میں ختم کردی جاتی ہے۔ پاکستان میں 1998 کی مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کی شرح آبادی 53 اور 47 ہے یعنی معروف خیال کے برخلاف مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم۔ اس حقیقت سے ہمارے دیہی سماج میں عورتوں کے بارے میں مروجّہ تعصّبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

سجّاد ظہیر نے مذہبی منافقت اور عورتوں کی حیثیت کے بارے میں ہمارے سماج کی رجعت پسندانہ سوچ کا پردہ چاک کر کے جس مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کی تھی وہ منشی پریم چند کے افسانوں کی عورت کے مقابلے میں اس لئے مختلف تھی کہ پریم چند نے زیادہ تر صنف نازک کی قربانیوں کی صورت گری سے اسے glamourise کرنے پر زور دیا گو بعد میں عورتوں کے حق میں بتدریج احتجاجی لہجہ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے اور بطورِ خاص سجّاد ظہیر نے عورت کی ترقی کے بغیر معاشرے کی ترقی کو ناممکن جانا۔ لندن کے قیام کے دوران سجّاد ظہیر انگریزی زبان کے بائیں بازو کے ادیبوں سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ ایک ایسے فکری مکالمہ یا ڈائیلاگ کا حصہ بنے جس کا مقصد ہندوستان کی جنگِ آزادی کی جدوجہد کے شرکا پر یہ واضح کرنا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج کو کس طور پر تبدیل کیا جائے تا کہ آزادی واقعتاً آزادی ثابت ہو سکے اور....

داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

ثابت نہ ہو۔ ہمارے سماج میں آزادی کو التباسِ آزادی Myth of Independence بنانے والے گماشتے موجود تھے اور ہماری آزادی، التباسِ آزادی بن کر رہ گئی جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی کتاب کے ٹائٹل سے بھی ثابت ہوا۔
سجّاد ظہیر نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سماج کے جن دو خطرناک رجحانات کے خلاف قلم اُٹھایا اُن کا لہجہ ''انگارے'' میں شامل دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں دھیما تھا۔ ''جنّت کی بشارت'' کا موضوع تنگ نظر شخصیات کی جہالت کا مرقع ہے۔ سجّاد ظہیر کے افسانے ''گرمیوں کی ایک رات'' میں سرکاری دفتر کے تین کرداروں... جمّن چپراسی، ہیڈ کلرک لالہ جی اور منشی برکت علی کی کہانی ہے۔ جمّن ہے تو دفتر کا چپراسی لیکن گھر کے کام کاج کی ذمہ داری بھی اُس کی ہے۔ بازار سے آم خرید کر لاتا ہے... بیگم صاحبہ نے آم پسند نہیں کئے... وہ واپس بازار جاتا ہے۔ ایک عجیب سے ہیجان میں مبتلا ہے... منشی برکت علی سے مدد مانگتا ہے.... لیکن منشی جی کا ایک کلاس فیلو اُنہیں مجرا سنانے کے لئے لے جاتا ہے.... اور بیچارہ جمّن حیران و پریشان کھڑا رہ جاتا ہے۔ افسانہ ''جنّت کی

بشارت'' میں ایک مولوی صاحب کی پُرخوری اور پچیس (۲۵) برس کم عمر لڑکی سے شادی کے بعد شب بیداری کے نوافل کے دوران ''جنّت'' کی سیر کا قصہ جس میں وہ اپنے لئے ایک حور پسند کر لیتے ہیں۔ افسانے کا اختتام ان کی بیگم کے قہقہوں پر ہوتا ہے۔ خواب سے بیداری کے بعد اپنے مصلّے کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنی بیوی کو۔ اُن کے سامنے جنّت اور حور کی بجائے روزمرہ کی دنیا اور قہقہے مارتی ہوئی اُن کی بیوی ایک nightmare کی صورت پیش کرتی ہے۔

سجّاد ظہیر کی ایک کہانی ''نیند نہیں آتی'' اُردو فکشن میں Stream of Consciousness کی ٹیکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستانی ادب کو Revitalize and Rejuvenate کرنے والا سجّاد ظہیر برِ صغیر کے اُردو فکشن میں نئی ٹیکنیک کا رائج کرنے والا پہلا ادیب بن گیا ہے۔ افسانہ ''دلاری'' ایک کھاتے پیتے مسلم گھرانے میں ملازم لڑکی کی کہانی ہے، جسے گھر کے ایک فرد کی طرح رکھا گیا۔ گھر کے بڑے صاحب زادے کاظم کی اس کے ساتھ رنگ رلیاں بھی ہوئیں۔ لیکن جب کاظم کی شادی کا موقع آیا تو دلاری کو یہ محسوس ہوا کہ وہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال دی گئی۔ غرض یہ کہ ان کے مندرجہ بالا افسانوں پر نظر ڈالیں یا ایک ڈرامہ ''بیمار'' یا پھر ''لندن کی ایک رات'' کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کو منظّم کرنے والے سجّاد ظہیر کو صرف ایک منتظم اور ایک Monitor کی حیثیت نہیں دے سکتے بلکہ اُردو ادب کی تخلیق میں عملی نمونے پیش کرتے ہوئے تخلیق کار اور منتظم علیحدہ نہیں ہو پاتے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد انہوں نے ترقی پسندانہ تنقید کی کئی اچھی تحریروں کے طور پر کئی مضامین تحریر کئے۔ حیرت ہے کہ یہ مضامین، اور کئی کانفرنسوں میں دیے گئے خطبات ابھی تک یکجانہ ہو سکے۔ ورنہ فیض احمد فیض کے تنقیدی مضامین ''میزان'' کی طرز کا ایک مجموعہ بھی سجّاد ظہیر کی نگارشات کی فہرست میں شامل ہوتا.... ان کے مضامین درج ذیل ہیں۔

۱۔ اُردو کی جدید انقلابی شاعری
۲۔ ترقی پسند ادب کا پیغام
۳۔ اُردو، ہندی، ہندوستانی
۴۔ غزل اور اس کا غلط رجحان
۵۔ اُردو ادب کی عمومی حیثیت
۶۔ شعرِ محض
۷۔ ہندوستانی تہذیب کا ارتقا
۸۔ اُردو شاعری کا مستقبل
۹۔ لوئی اراگان
۱۰۔ تہذیب علم پر نئے اثرات
۱۱۔ روایت اور انفرادی حیثیت (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مضمون پر مذاکرہ، سویرا، لاہور)
۱۲۔ اُردو شاعری اور اس کا مستقبل
۱۳۔ سخن گسترانہ بات، ڈاکٹر وحید اختر کے مضمون میں اُٹھائے گئے نکات کا جواب۔ مطبوعہ صبا، حیدرآباد دکن۔ اس کے علاوہ....

APWA کے جنرل سیکریٹری کی رپورٹ، الہ آباد، ۱۴/۱۵/ نومبر ۱۹۳۶، مطبوعہ ماہنامہ شاہجہاں، دہلی
زیرِ صدارت چوتھی کانفرنس ۱۹۴۳، مطبوعہ عالمگیر، لاہور، اگست ۱۹۴۳

زیرِ صدارت کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس، منعقدہ ۲۷/۲۸ رنومبر ۱۹۴۹ء، لاہور۔

علاوہ ازیں ''ذکر حافظ'' جسے مندرجہ بالا مضامین کے ساتھ یکجا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ چالیس (۴۰) کی دہائی میں ''قومی جنگ'' اور ساٹھ (۶۰) کی دہائی میں ''عوامی دور'' میں سجّاد ظہیر کی سیاسی ومعاشی مسائل پر تحریریں بھی قارئین کے سامنے آنی چاہئیں تا کہ معلوم کیا جاسکے کہ بین الاقوامی بائیں بازو کے ادباً کو ہندوستانی ادیبوں سے متعارف کرانے اور ترقی پسندی کا ایک عظیم الشان عالمی محاذ بنانے میں سجّاد ظہیر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ ''انگارے'' کے خلاف اُٹھنے والی آوازوں سے اُردو ادب کے بعض کشادہ ذہن مؤرخین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ترقی پسند تحریک پر تین اہم کتابیں شائع ہوئیں، جن میں عزیز احمد کی ''ترقی پسند ادب'' سب سے پہلی کتاب تھی۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں...

''اس کتاب میں ہزار نقص سہی لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ یہ سماج پر وحشیانہ حملہ تھا اگرچہ اس حملہ میں غیر ضروری خونریزی بہت تھی، جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کئی سال تک پنپ نہ سکی لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کتاب کا مقصد کئی قدروں کی تعمیر سے زیادہ پرانے اصولوں کی تخریب تھا۔''

اس کے بعد ''لندن کی ایک رات'' کے بارے میں کشن پرشاد کول کی کتاب ''نیا ادب'' اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب ''ترقی پسند تحریک'' کا رویّہ بھی معاندانہ تھا۔ علی عباس حسینی جیسے سجاد ظہیر کے بظاہر طرفدار مصنف بھی اپنی کتاب ''ناول کی تاریخ اور تنقید'' میں اس کتاب (انگارے) سے سرسری گزر گئے۔ وہ اسے James Jon کے Ulysses سے متاثر سمجھتے ہیں۔ اس کے یہاں ڈبلن کا ایک دن تھا اور یہاں ''لندن کی ایک رات'' پھر معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ ''روشنائی'' جنوری ۱۹۵۴ء میں مچھ جیل میں لکھی گئی تھی۔ ظ۔ انصاری کی ''غزل'' جاگیرداری طبقہ اور تصوّف کے بارے میں منفی اعتراضات کے جواب میں۔ ''ذکرِ حافظ'' جولائی ۱۹۵۴ء میں تحریر ہوئی۔ اس کتاب میں سجاد ظہیر کا اصرار تھا کہ ہمیں جاگیرداری عہد کے منفی پہلو کے بجائے مثبت رویوں کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ ''پگھلا نیلم'' پاکستان سے ہندوستان مراجعت کے بعد کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ یہ نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ نظم کی ایک ایسی فارم میں ہے جسے فیض احمد فیض اپنے انتقال کے وقت تک قبول نہیں کرسکے۔ ہر چند کہ سجّاد ظہیر نے ''پگھلا نیلم'' میں ہندوستانی سماج کی کہولت اور ترقی دشمن سماجی رویّوں کے خلاف خوبصورت احساسات کو پیش کیا ہے تاہم انہوں نے تہہ دار شاعری کے ذریعہ ثابت کیا کہ نہ تو ''تخلیق'' کی ہئیتیں جامد ہیں اور نہ ہی سماجی اقدار اور پیداواری رشتے.....! انہی تبدیلیوں کا نام استحصال سے آزادی کی تاریخ ہے۔ سجاد ظہیر کی مساعی کا لبِ لباب یہ تھا کہ انسانی رشتے ''اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر'' کے سنہری آدرشوں سے نمو پاتے ہیں۔

آپ اس سوچ کی دوررسی کا اندازہ لگایئے... ہندوستان ان دنوں اپنی تاریخ کے جس نازک دور سے گزر رہا

تھا، اس میں صرف خوابوں کا فسوں تھا... سنگلاخ حقیقتوں کا ادراک نہیں تھا۔ سجاد ظہیر نے سوچا کہ اگر انگریزی اقدار، انگریز حکومت کے گماشتوں کو منتقل ہوتا ہے تو پھر ہندوستان کے محنت کش عوام کی تقدیر کس طرح بدلے گی؟ انہوں نے سوچا کہ اس بڑے کام میں ادیبوں کو سماجی تبدیلی میں Catalytic Agent بنانا پڑیگا۔ مذہبی تقاضوں کی بحث ہندو احیا پرست ہندوؤں سے اور مسلمان احیا پرست مسلمانوں سے اپنے اپنے منابع کی طرف رجعت کا مطالبہ تو کر رہے تھے، لیکن آزادی کے بعد درکار ضروری سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے لئے صرف وہی لوگ سوچ سکتے تھے جو محنت کشوں کے حق میں بدلتے ہوئے پیداواری رشتوں کے ذریعہ ملک سے استحصال پیشہ قوتوں کا خاتمہ چاہتے ہوں۔ برِّصغیر میں کمیونسٹ پارٹی کا ۱۹۲۵ء میں قیام اس سلسلے کی کڑی تھی۔ جس طرح کراچی اور بمبئی کی سڑکوں کا Pollution ماؤنٹ آف کلامنجورو (Mount of Kilamanjoro) پر برف پگھلاسکتا ہے... اسی طرح ایک علاقے میں ہونے والی ناانصافی دنیا کے دیگر حصّوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ صرف معاشی وسیاسی معنوں میں نہیں بلکہ سیاسی سطح پر دنیا میں انصاف کی قوتیں بھی متوازن (eco-system) کی طرح انسانوں کی عمومی بھلائی کے لئے عالمی انصاف کا چلن چاہتی ہیں۔ سجّاد ظہیر جیسے منظّم اور مفکّر کی یہ خواہش تھی کہ دنیا کے تمام حقیقت پسند اور انصاف پسند ادیب دنیا بھر کے مسائل کی بہتر تفہیم کے لئے ایک پلیٹ فارم پر نظر آسکیں اور ان کی یہ خواہش ایک ایسے برِّ صغیر میں تھی جہاں اس ملک کے دو بڑے مذہبی گروہ اتحاد فکر ونظر جیسے ضروری فریضہ کی بجا آدری میں کافی سست رو تھے بلکہ اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ کی تنقید تو کر سکتے خود اپنے مذہبی گروہ میں بھی Plurarity of views کے قائل نہ تھے۔

سجّاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور ۱۳ رستمبر ۱۹۷۳ء کو ہم سے بچھڑ گئے۔ انہوں نے ۶۸ برس کی زندگی پائی لیکن یہ زندگی کیا تھی... ایک طوفان تھا...! اگست کے مہینے میں ٹورانٹو کے دوستوں کی طرف سے سجّاد ظہیر کی یاد منانا درحقیقت ایک ایسے شخص کی یاد منانا ہے جس نے برِّصغیر کے منجمد سماج کو متحرک کرنے میں بنیادی کام کیا۔ آج معاشرت ہو، معیشت ہو، یا سیاست ہو، یا ادب ہم کسی نہ کسی طرح سجاد ظہیر کی بینائی اور فہم سے استفادہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کریں یا نہ کریں... وہ کسی نہ کسی حد تک ہمارے ذہن کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرت ملّا کو ملا حکمِ بہشت
ہے بدآموزیٔ اقوام وملل کام اس کا — اور جنّت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

(علّامہ اقبال)

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

کچھ احوال سید سجاد ظہیر کا اور اُن کے دو خط

میری سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ جب ہم کسی بڑے آدمی کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنا قد اونچا کرنے کی لاشعوری فکر میں مبتلا ہوتے ہیں۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کسی فرد کے سلسلے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی ایک یا کئی کارنامے ایسے ہیں جنھوں نے ہمارے معاشرے کو کسی بھی عنوان سے ایک ایسے تغیر سے آشنا کیا جو زندگی اور انسانیت میں مثبت تبدیلیوں کا باعث بنا ہو....پھر یہ بھی معلوم ہو کہ اُس فرد کی انقلاب آفریں تحریک کی تاریخ تو موجود ہے لیکن خود اُس شخصیت کے حالاتِ زندگی یا سوانح موجود نہیں ہے تو حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوتا ہے۔اِس طرح ہم اپنے ساتھ ساتھ اپنی آنے والی نسل کے لئے بھی ایک اچھی مثال چھوڑنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔یہ فرض ہوتا ہے اُن لوگوں کا جو متعلقہ فرد یا شعبہ سے قریب یا وابستہ رہے ہوں۔وقت گزرنے کے ساتھ غیر متعلق یا غیر حقیقی واقعات اُس شخصیت کے ساتھ نتھی ہوتے چلے جاتے ہیں یوں وہ شخصیت ہی پسِ پردہ نہیں چلی جاتی بلکہ تاریخی اعتبار سے اصل واقعات پر بھی پردہ پڑا رہ جاتا ہے۔ہمارے مزاج کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں اُسے ایک اونچے استھان پر بٹھا کے بت بنا دیتے ہیں یا جس سے نظریں چراتے ہیں اُس کو بالکل اندھیروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے ہیں جس کی ایک مثال ہماری وہ ادبی شخصیات ہیں جن کے ایک ایک دو دو شعر یا مصرعے تو ملتے ہیں مگر شخصیت کا پورا حوالہ لاعلمی کے اندھیرے میں گم ہو چکا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی ہم ترقی پسند تحریک کے بانی سید سجاد ظہیر کے بارے میں لاعلمی کے اندھیرے سے بہت دور ہیں اور یقیناً سجاد ظہیر پر ہندوستان کی کسی نہ کسی یونیورسٹی میں سوانحی کام ہوا ہوگا لیکن وہ ادب سے متعلق لوگوں تک اس طرح نہیں پہنچا جیسے علی سردار جعفری یا اسی قبیل کی شخصیات کے بارے میں بنیادی معلومات ادب کی دنیا میں موجود ہیں۔اس کا ایک سبب تو یہ بھی ہے کہ ان افراد نے کوشش کی کہ جو کچھ ان کے بارے میں ہندوستان میں لکھا گیا ہے وہ پاکستان کے ادبی حلقوں تک بھی پہنچے لیکن سید سجاد ظہیر اپنے مقصد کے حصول کی لگن میں ایسے منہمک تھے کہ انھوں نے اِس طور سے اپنے بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا۔ایک تو وہ کم آمیز تھے

دوسرے بقول میرے والد ''سجاد ظہیر اپنی ذات یا اپنے کارناموں کو بیان کرنے کے سلسلے میں بہت خسیس ہیں'' جب کہ اُن کے دیگر ساتھی کسی نہ کسی عنوان سے ادبی دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے ایک ستون علی سردار جعفری بھی تھے، وہ پارٹی کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی کاموں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہے۔پاکستان میں بھی اُن کے بارے میں متعدد چیزیں لکھی گئیں بلکہ ماہنامہ ''افکار'' نے تو ان کے بارے میں ایک ضخیم نمبر بھی شائع کیا، یوں جعفری صاحب کی سوانح ترتیب دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔جب کہ بنّے بھائی نے اپنی ذات کو خالص کمیونسٹ پارٹی کے استحکام اور فروغ کے لئے وقف کر دیا تھا۔اس کے باوجود ان کی شخصیت ادبی طور سے بہت زیادہ نہ سہی لیکن زرخیز ضرور تھی۔سید سجاد ظہیر کی شخصیت کے سب نہ سہی ایسے تمام پہلوؤں کو ضرور سامنے لانا چاہئے تھا جن سے عزم واعتماد، ایثار وقربانی کی عملی صورتیں ہمارے کارکنوں اور انقلاب پسند نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے سامنے آتیں۔یہ کام اُن کے قریبی اور معتمد ساتھیوں کے کرنے کا تھا۔اس بارے میں تو یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے ساتھ کام کرنے والے حضرات اپنے مقصد کے حصول کی لگن میں ایسے جتے تھے کہ اِس اہم کام کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے۔تاہم جن حضرات نے سید سجاد ظہیر کے ساتھ کام کیا تھا یہ اُن ہی لوگوں کا کام تھا کہ ایک مختصر اور مستند سوانح عمری لکھتے۔یقیناً سجاد ظہیر اِس طرح کی تحریر کے لئے راضی نہیں ہوتے کہ وہ تحریک کے کام میں اور اُس کے مقصد کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں منہمک تھے اور اِس کام کو (اپنی سوانح ترتیب دینے کے کام کو) ممکن ہے وہ پسند بھی نہ کرتے لیکن اُن کے ساتھیوں کا فرض تھا کہ بہر حال وہ یہ کام کرتے۔گیارہ برس میں تحریک جوان ہو چکی تھی۔اہلِ قلم اِس کے مثبت ومنفی مضمرات پر جی بھر کے باتیں کہہ اور لکھ چکے تھے۔اِس تحریک نے قیامِ پاکستان کی حمایت کی تھی۔خود سید سجاد ظہیر پاکستان آگئے تھے کہ یہاں کمیونسٹ پارٹی کی بنیادیں مستحکم کر سکیں۔لیکن پاکستان میں ترقی پسند تحریک اور کمیونزم یا سوشلزم کا نام لینے والی جماعتوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ایسے تمام لوگ جن کو حکومتِ وقت ''سرخا'' سمجھتی تھی وہ جیل میں تھے یا زیرِ زمین چلے گئے تھے۔سجاد ظہیر کو حکومتِ پاکستان نے ۱۹۵۵ء کے شروع میں جلا وطن کر دیا تھا اور وہ ہندوستان جا کر وہاں کمیونسٹ پارٹی کے لئے کام کرنے لگے تھے۔اس وقت کسی قریبی ساتھی کو اُن کی سوانح عمری لکھنا چاہئے تھی۔جو لوگ ایسی شخصیتوں سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں وقتِ گزراں کے ساتھ جب وہ بھی گزر جاتے ہیں تو پھر مجھ جیسے ادب کے طالبِ علموں کے لئے اس حوالے سے ایک خلاء رہ جاتا ہے۔آج بھی ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک کو ہمارے ادب کی ایک ناقابلِ فراموش کڑی سمجھنے والے موجود ہیں اور اس حوالے سے طویل تقریریں تو کرتے ہیں اور ترقی پسند ادب کی تاویل اور تشریح میں ورق کے ورق سیاہ کر دیتے ہیں لیکن سید سجاد ظہیر کی ایک مستند سوانح عمری مرتب کرنے کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔یہ بات صرف سید سجاد ظہیر کے لئے ہی نہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کے لئے لکھ رہا ہوں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے لئے تن من دھن سے کام کیا اور اِس تحریک کی خاطر اپنی

تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پسِ پشت ڈال دیا، اُن سب کے بارے میں خصوصاً پاکستان کی نئی نسل بالکل بے خبر ہے۔ایسے تمام لوگوں کی جنھوں نے ادب کے حوالے سے کام کیا اور پاکستانی ادب کی تاریخ میں گم نام رہے انکی سوانح کم ازکم ایک ایسے کتابچے کی صورت میں شائع کئے جانے کی ضرورت ہے جیسے آج سے نصف صدی پہلے علیگڑھ سے مختلف شعراء کا انتخابِ کلام۔''جدید شاعری کے معمار'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یا آج بھی بہت سے شعراء کے سو(۱۰۰) اشعار شائع ہوتے ہیں۔

پروفیسر عتیق احمد نے کہ اللہ ان کا بھلا کرے سجاد ظہیر کی زندگی اور تحریروں کے حوالے سے دو مختصر کتابیں ''بنے بھائی'' اور ''سجاد ظہیر۔تخلیقی اور تنقیدی جہات'' مرتب کر دی ہیں، یا پھر چند سطریں ''روشنائی'' کے دیباچے میں ملتی ہیں جو سبط حسن نے لکھا ہے۔خلیق احمد خلیق کی سوانح ''منزلیں گرد کے مانند..'' میں بھی سجاد ظہیر کا ایک مختصر سوانحی نوٹ ہے۔لیکن کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے کتنے بچے تھے۔؟ ۱۹۳۷ میں شادی ہوئی اور ۱۹۷۳ میں انتقال.... سوانح کے سلسلے میں اولاد مستند حوالہ ہوتی ہے۔

اُن کے والد نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا، وہاں سے قانون کی ڈگری لانے کے بعد جب وکالت کرنے کے بجائے ٹریڈ یونین کے کام میں لگ گئے تو والدین، اور دوسرے بھائیوں کا کیا ردِعمل ہوا۔اتنی پارٹی کی مصروفیات ہوتے ہوئے ادبی کاموں کی جانب دھیان دینے کا خیال کسی کی ترغیب وتحریک سے آیا یا خود اپنی فطرت میں گھلے ملے ادبی ذوق نے اپنی طرف کھنچا۔؟ یہ ساری باتیں ایک تفصیلی مقالے یا کتاب میں ہی سمیٹی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر عتیق احمد کراچی میں ایک روشن خیال نقاد ہیں۔(اللہ انکو صحت عطا فرمائے کہ آجکل شدید علیل ہیں) پروفیسر عتیق احمد جناح کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔لاولد ہیں۔ان کی بیگم فہمیدہ عتیق بھی تعلیم کے شعبہ سے وابستہ تھیں، انھوں نے انتقال سے دو ایک برس پہلے جامعہ کراچی سے جمیل الدین عالی پر پی ایچ ڈی کیا تھا۔عتیق احمد کراچی اور پاکستان کے اُن اہل قلم سے قربتِ خاص رکھتے ہیں جو معروف معنی میں خود کو ترقی پسند یا روشن خیال کہتے ہیں۔اب تک پروفیسر عتیق احمد کی جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں ۱۔استفادہ (تنقیدی مضامین) ۲۔مضامین پریم چند (ترتیب معہ مقدمہ) ۳۔مثلث (عزیز احمد کا ناولٹ ترتیب ومقدمہ) ۴۔اردو ادب میں احتجاج (جلد اول) ۵۔فیض اور اُن کا عہد۔ ۶۔بنّے بھائی (مرتبہ) ۷۔سجاد ظہیر۔تخلیقی اور تنقیدی جہات، شامل ہیں۔اور اتنی ہی اشاعت کے انتظار میں ہیں۔سید سجاد ظہیر کی شخصیت پر مختلف لوگوں کے مضامین ''بنّے بھائی'' نامی کتاب میں یکجا کئے گئے ہیں میں نے اُن ہی مضامین سے تھوڑی تھوڑی وہ باتیں لے کر ایک خاکہ بنانے کی کوشش کی ہے، جس سے سید سجاد ظہیر کی زندگی، شخصیت، نظریات، ادبی رویوں اور تخلیقات کی ایک واضح جھلک سی نظر آسکے۔آخیر میں میں نے سجاد ظہیر کے دو خط شامل کئے ہیں جو میرے نام آئے۔

عصمت چغتائی کے مضمون میں درجِ ذیل جملے سجاد ظہیر کی زندگی کے نجی گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

☆عشق سب سے چٹ پٹا موضوع تھا تو سنا کہ گھر والوں نے اپنی پسند سے لڑکی ڈھونڈی اور یہ دولہا بن گئے...

☆ سنا تھا شراب بھی پی کر اودھم نہیں مچاتے۔یا خدایا یہ کیسے انقلابی ہوئے کہ ان کی شادی میں مانجھا اُبٹن تک ہوا۔ پورے پکے دولہا بنے یہ سب غیر انقلابی حرکتیں ہیں......☆ میری دوسری ملاقات بنّے بھائی سے ان کے گھر سیکری بھوّن کے کمرے میں بمبئی میں ہوئی اس وقت وہ کیفی اعظمی کا اور موتی بیگم کا نکاح پڑھوا رہے تھے۔قاضی مو گھے نکاح پڑھا رہے تھے، بنّے بھائی گواہ تھے۔جب قاضی جی نے کیفی کی مذہبیت کے بارے میں پوچھا تو بنّے بھائی نے بڑی متانت سے جواب دیا سنی المذہب۔وہ اس لئے کہ اگر یہ کہہ دیتے کہ کیفی شیعہ ہیں تو شیعہ مولوی کو بھی بلانا پڑتا، خوامخواہ تین چار گھنٹے لگ جاتے....

☆ ....میری اصل ملاقات بنّے بھائی سے اُس وقت ہوئی جب میں لکھنو کانفرنس میں شرکت کے لئے گئی تو بنّے بھائی کے گھر ٹھہری۔وہاں رہ کر میں نے پہلی بار بنّے بھائی کا بحیثیت ایک انسان کے مطالعہ کیا۔بنّے بھائی اپنی خاندانی کوٹھی کے پچھواڑے نوکروں کے کوارٹر میں رہتے تھے۔صحن کی دیوار اُٹھی ہوئی تھی، کمرے پرانے اور بوسیدہ تھے۔بڑے کمرے میں کئی پلنگ پڑے ہوئے تھے سخت جاڑے پڑ رہے تھے اور ہم سب وہاں ہی سوتے تھے۔۔۔بنے بھائی کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔رضیہ، لکھنو کرامت اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ان کی کمائی پر گھر کا خرچ چلتا تھا۔۔۔

☆ میں ایک واقعہ کبھی نہیں بھولونگی، جن دنوں میں وہاں تھی سخت جاڑے پڑ رہے تھے۔رضیہ نے بڑی بیٹی نجمہ کے لئے نیا کوٹ بنوا دیا کیونکہ اس کا کوٹ چھوٹا ہو گیا تھا۔اس لئے نسیم کو مل گیا چھوٹی بہن ہونا بھی قیامت ہے، نسیم ضد کرنے لگی کہ پرانا کوٹ نہیں پہنے گی.....

☆ وہ خطوط جو انہوں نے رضیہ کو لکھے ان میں انہوں نے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے۔شاید رضیہ نے اُن ہی خطوط کے سہارے زندگی کی تلخیوں کو اس خوبصورتی سے جھیلا۔یہ خط انہوں نے صرف اپنی پیاری بیوی کو لکھے ہیں مگر دنیا کے ضمیر سے خطاب کیا ہے۔

عصمت چغتائی کے مضمون ''خوابوں کا شہزادہ'' سے متذکرہ بالا اقتباسات کے بعد کچھ سطریں سانکریتائن کے مضمون ''نئے نیتا'' سے بھی سن لیجئے۔

☆ جب وہ اپنے جون پور ضلع کی بولی بولتے ہیں تو پتہ نہیں چلتا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص بول رہا ہے۔

☆ سروزیر حسن کا گھر کلاں پور (کھیت سرائے کے پاس) ضلع جونپور میں ہے۔بنّے کی ماں سکینۃ الفاطمہ بڑی ہی مہذب اور سنجیدہ خاتون ہیں۔صوبہ متحدہ میں اونچے گھرانے کی شاید وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے پردے کی رسم کو توڑا۔گاؤں والے انھیں سکّن بی بی کہتے ہیں... سکّن بی بی کے پانچ بیٹوں میں بنّے چوتھے اور زیادہ لاڈلے ہیں۔

☆ گورنمنٹ جوبلی اسکول اس وقت لکھنو کا سب سے اچھا اسکول تھا۔نو سال کی عمر میں (۱۹۱۴)اسی مدرسہ میں پانچویں جماعت میں بنے میاں کو شریک کیا گیا۔۔ ہاکی اور فٹ بال کا بہت شوق تھا۔۔۔خود شیعہ خاندان کے فرد تھے اس پر لکھنو کی شیعی فضا، وہاں محرّم جس موثر طریقہ سے منایا جاتا تھا وہ بنّے کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔خاص کر انیس کے مرثیوں میں کربلا کے شہیدوں کے دل ہلا دینے والے واقعات سن کر وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکتے تھے۔
☆ ۱۹۲۰ میں کربلائے معلیٰ گئے۔☆ ۱۹۲۱ میں درجہ دوم سے میٹرک پاس کیا۔☆ بنّے میاں نے اللہ کے لئے زندگی میں ایک بار روزہ بھی رکھا۔
☆ ۱۹۲۳ء ۱۹۲۴ء میں بنّے نے کئی انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں کی کتابیں پڑھیں۔ایف اے پاس کر کے ۱۹۲۴ء میں وہ لکھنو یونیورسٹی میں بی۔اے میں شریک ہو گئے۔اسی وقت کانپور میں کمیونسٹوں پر سازش کا مقدمہ چلا، روس، ماسکو، لینن کا نام زیادہ سنائی دینے لگا۔روسی انقلاب کے بارے میں تجسّس بڑھا اور لائبریری میں اِس موضوع پر جتنی کتابیں مل سکیں، پڑھ ڈالیں۔اکثر بیمار رہتے، لیکن اسکے باوجود ۱۹۲۹ء میں امتحان میں بیٹھ گئے اور درجہ سوم سے پاس کیا۔اب انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ جانا تھا مگر صحت کی خرابی کے باعث ایک سال رک جانا پڑا۔اس دوران میں وہ فارسی پڑھتے رہے۔
☆ مارچ ۱۹۲۷ء میں ولایت کے لئے روانہ ہوئے۔☆ آکسفورڈ میں زیادہ عرصہ نہ رہ پائے تھے کہ تپ دق نے حملہ کیا۔لا چسوٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم کو بھاگنا پڑا۔☆ صحت ٹھیک ہو جانے کے بعد ۱۹۲۸ء میں بنّے جب آکسفورڈ لوٹے تو وہ پکے کمیونسٹ ہو چکے تھے۔لندن میں اِن کے کئی ہم خیال مثلاً ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زین العابدین وغیرہ موجود تھے۔لندن کی کانگرسی جماعت میں شامل ہو گئے۔آکسفورڈ میں مجلس طلبائے ہند کے نام سے ایک جماعت ہے بنّے اسکے نمائندہ بن کر مخالف فسطائی کانفرنس میں شریک ہونے کیلئے یورپ (فرینکفرٹ) گئے، کانفرنس میں سوویت کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا۔☆ ۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ سے بی اے کیا، اور ڈنمارک، جرمنی، آسٹریا اور اٹلی کی سیر کی، پھر بنّے ہندوستان لوٹ آئے۔
☆ سوئٹزرلینڈ ہی کے دوران قیام میں انہوں نے ''انگارے'' لکھا تھا اور اب اسے شائع کرایا۔مگر وہ جلد ہی ضبط ہو گیا۔یہ بنّے کی پہلی تصنیف نہ تھی۔انگارے سے پہلے ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں ان کی کئی کہانیاں ''زمانہ'' میں بھی چھپی تھیں۔(یہاں کتاب کے مرتب، پروفیسر عتیق احمد نے حاشیہ میں لکھا ہے۔'انگارے' سجاد ظہیر نے ترتیب دیا تھا)
☆ ہندوستان میں چھ مہینے رہنے کے بعد بنّے بیرسٹر بننے کے لئے پھر ولایت چلے گئے۔اب وہ لندن میں رہتے تھے اور زیادہ وقت سیاسی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔☆ وہ پہلے ہندوستانی طلباء کے (مجلّے) 'ہندوستان' کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اب انہوں نے ''نیا ہندوستان'' (سہ ماہی) نکالا۔☆ ۱۹۳۵ء میں بنّے نے بیرسٹری پاس کی۔☆ دسمبر ۱۹۳۵ء میں بنّے ہندوستان لوٹے۔آخر ماں باپ نے روپیہ خرچ کر کے آٹھ سال تک ولایت میں پڑھایا تھا،

انھیں بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ بنّے کچھ ہو کر آئے ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں۔اسی لئے تو سجاد نے ایک سال بعد الہٰ آباد میں بیرسٹری شروع کی۔لیکن بیرسٹری نرے قانونی امتحان پاس کر لینے سے تھوڑے ہی ہوتی ہے اس کے لئے تو خاص دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔
☆ ۱۹۳۷ء میں بنّے دولہا بنے، برات اجمیر گئی۔بیوی (رضیہ) تعلیم یافتہ اور اردو کی اچھی ادیبہ ہیں۔بیاہ کے بعد بہت اچھے نمبروں سے انہوں نے الہ آباد سے ایم اے پاس کیا، اِس میں شک نہیں کہ یہ جوڑا بہت اچھا رہا۔مگر پہلے کچھ محبت کی رسہ کشی جاری رہی۔ایک امیر سید زادی پھر سر وزیر حسن کی بہو پھر جیٹھوں میں کوئی آئی سی ایس اور کوئی یونیورسٹی کے پروفیسر، قریبی رشتہ داروں میں ہائیکورٹ کے جج اور بڑے بڑے عہدیدار..رضیہ بیاہ کے وقت خوش تھیں کہ ان کے میاں اتنے بڑے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔
☆ ۱۲/مارچ ۴۰ء آ گیا۔بنّے میاں کو پکڑ کر لکھنو جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔پورے دو سال جیل میں رہنے کے بعد ۱۴/مارچ ۴۲ء کو رہا کئے گئے۔
☆ پہلے رضیہ، ترقی پسندی کا دم بھرتے ہوئے بھی کٹّر مذہبی خیالات کی تھیں، اس کی انہیں بڑی فکر تھی کہ میاں روزی نہیں کماتے۔۔اب میاں کو پاگل نہیں سمجھتیں...آخر میاں کماؤ بھی تو ہیں۔بمبئی جیسے عالی شان شہر میں رہتے ہیں۔ایک اخبار ''قومی جنگ'' (اب 'نیا زمانہ' کے نام سے نکل رہا ہے) کی ادارت کرتے ہیں اور پچیس روپیہ کی بھاری تنخواہ پر، رضیہ جب بمبئی میں رہتی ہیں تو بنّے جو کھانا کھلاتے ہیں وہ اِنہیں سر وزیر حسن کے دسترخوان سے کم میٹھا نہیں لگتا ہوگا۔☆ بنّے جنتا کے آدمی ہیں۔اس لئے جنتا کی زبان اور اسکے گیتوں سے انہیں بڑی محبت ہے۔انہوں نے جونپوری بولی میں لینن پر ایک آلھا (گیت) لکھا ہے۔
راہل سانکر یتائن کے مضمون ''نئے نیتا'' کے اقتباسات کے بعد ایک اقتباس **مجنوں گورکھپوری** کے مضمون ''بہ مرگ من یاد آر'' سے:
☆ سجاد ظہیر بڑے شریف النفس اور سچے انسان تھے۔ترقی پسند گروہ میں اِن سے زیادہ مہذب، شائستہ اور سلیم الطبع شخص مجھے آج تک نہیں ملا۔
سید سبط حسن لکھتے ہیں ☆ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سجاد ظہیر کی اچانک موت نے ایک ایسی پیاری شخصیت کو ہمارے درمیان اور اردو ادب کے میدان سے اٹھا لیا ہے جس کی خدمات جدید اردو ادب کی نشو و نما میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اُنکا انتقال ایسے وقت میں ہوا کہ جب وہ افریقی اور ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس (منعقدہ الماتا) میں شرکت کر رہے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کا اتحاد اور انکی یکجہتی سجاد ظہیر کو ہمیشہ سے بے حد عزیز تھی۔
☆ سجاد ظہیر کوئی پُر نویس قسم کے ادیب نہیں تھے۔اپنے ۳۵ سالہ ادبی کیرئر میں انہوں نے صرف ایک ناول چند

کہانیاں اور ڈرامے اور جدلی مادیت پر ایک کتابچہ، حافظ شیرازی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ترقی پسند تحریک کی تاریخ، نظموں کا ایک مجموعہ ''پگھلا نیلم'' اور دو درجن سے زائد مضامین لکھے لیکن جو کچھ بھی لکھا جدید اردو ادب پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑے۔

☆ وہ مشرقی اور مغربی موسیقی کے بڑے دل دادہ تھے۔ فارسی اردو اور ہندی شاعری کو بےحد پسند کرتے تھے۔

اپندرناتھ اشک نے لکھا ☆ بنّے بھائی نہ صرف اچھی کہانیاں لکھا کرتے تھے بلکہ انہوں نے اردو میں سب سے پہلا ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھا تھا ''بیمار''۔ میں نے اسے پڑھا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند آیا۔ اسے پڑھ کر مجھے بھی ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھنے کی تحریک ملی تھی اور میں نے مسلسل ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے.... میں نے ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھا۔ خواجہ احمد عباس نے ''طوفان سے پہلے'' اس کا عنوان رکھا۔ بنّے بھائی نے اس کا دیباچہ لکھا۔

اب ایک دو اقتباسات **مفتی محمد رضا فرنگی محلی** کے مضمون سے جو ''سید سجاد ظہیر۔ خطوط کے آئینے میں'' کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ ایک جگہ صاحبِ مضمون لکھتے ہیں۔ ☆ بنے بھائی میں ہم خیال بنانے کا بڑا ہنر تھا، وہ تبادلۂ خیال میں نہ برہم ہوتے تھے نہ طنزیہ چوٹ کرتے بلکہ دوسرے کے نقطۂ نظر کے احترام کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے، کوئی شوخ جملہ اگر وہ کہنا بھی چاہتے تو پہلے سے اس کی معذرت کر لیتے اور ہنس ہنس کر ہی بات جاری رکھتے تھے۔

☆ بنّے بھائی لکھنو آئے (۱۹۴۳ء میں)۔ ان سے ملاقات کے لئے ایک نشست پنڈت آنند نرائن ملّا کے مکان واقع جگت نرائن روڈ گولہ گنج میں، میں نے بلائی۔ اس میں بنّے بھائی آئے تو جناح کیپ پہنے ہوئے تھے۔ میں نے چھیڑا کہ کیا آپ بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ یہ جناح کیپ کب سے شروع کر دی۔ بگڑے کہ آپ لوگ تعصب نہیں چھوڑیں گے تو محنت کشوں کے مطالبات کبھی پورے نہ ہوسکیں گے۔۔ یہ بھی کہا ''ابھی پی سی جوشی کی ایک پریس کانفرنس بمبئی میں ہوئی تھی، اس میں گاندھی جی، مسٹر جناح اور پنڈت نہرو کی تصویریں لگی تھیں تو خواجہ احمد عباس نے (بمبئی کرانیکل کے اُس وقت کے اسٹاف رپورٹر) مسٹر جناح کی تصویر پر اعتراض کیا، پھر یہ اعتراض کہ مولانا آزاد کی تصویر کیوں نہیں لگی ہے۔۔ آپ لوگ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اور تعصب کو نکالئے..وغیرہ وغیرہ۔ جناح کیپ کے بارے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ ٹوپی انہوں نے ڈنمارک میں نوے شلنگ کی خریدی تھی جب وہ انگلستان میں پڑھتے تھے۔

☆ ''یہاں (بمبئی) قیام کے دوران میں ایک نئے نظریے سے سابقہ پڑا۔ مسلم لیگ باوجودیکہ فرقہ وارانہ جماعت ہے مگر چونکہ عام مسلمان اس کے ساتھ ہیں اور ترقی پسندوں کو عوام میں کام کرنا ہے۔ اُن کے لئے اب کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر ان کے ذریعے ہندو مسلم عوام تک اپنا نقطۂ نظر پہنچائیں اس لئے پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے ہندو حضرات کانگریس میں اور مسلم حضرات مسلم لیگ میں شامل

ہوں۔۔۔

☆ مضمون نگار نے (مفتی محمد رضا) لکھنو سے ۱۹۴۳ء سے ایک رسالہ 'منزل' نکالا تھا، اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کے طلباء کی ہڑتال کے حق میں ایک نوٹ شائع کیا جس میں علامہ سید سلمان ندویؒ پر بھی کچھ چھینٹیں تھیں، یہ سب باتیں سجاد ظہیر صاحب کو لکھیں۔ اُن کا جواب آیا...... ''میری رائے یہ ہے کہ تمہارا اس حد تک جھگڑے میں پڑ جانا موجودہ حالات میں جبکہ اور بہت سے ضروری کام کرنے ہیں غلط تھا...... ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں اَن گنت خرابیاں ہیں لیکن ہم سب مل کر اگر اِس وقت ''انجمن اصلاح تعلیم'' کی بنیاد رکھ دیں تو کس قدر بے موقع اور فضول بات ہوگی، ہندوستان میں فاقہ کشی بڑھ رہی ہے دشمن کی فوجیں ہماری سرحد پر کھڑی ہیں ملک میں پس ہمتی کا دَور دَورہ ہے اور ہم بھئی معاف کرنا بے چارے سید سلمان ندوی کی داڑھی میں دیا سلائی لگا رہے ہیں! بھئی میں نے ایک ہفتہ تک اِس معاملہ پر غور کیا اور آخر اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بزرگوں کو بیچ میں ڈال کر اس معاملے کو رفع دفع کر ڈالو سید سلمان ندوی سے معافی مانگ لینا بری چیز نہیں، وہ عالم ہیں اور بزرگ ہیں ہمارے ان کے خیالات میں بہت اختلاف سہی پھر بھی ان کی بزرگ داشت کرنا ہمارا فرض ہے۔''

☆ بنّے بھائی علمی اور تحقیقی مزاج بھی رکھتے تھے، ان کا مطالعہ وسیع اور گوناگوں تھا وہ ان تحریروں کو استفادے کے لئے پڑھتے تھے جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ ان کو ان سے دلچسپی ہوسکتی ہے مثلاً مولانا آزاد کے ''ترجمان القرآن'' کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا، مجھے ان کا یہ جملہ نہیں بھولتا کہ باوجود مذہب سے دلچسپی نہ ہونے کے انہوں نے ترجمان کی دونوں جلدیں پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا ''بھئی مولانا آزاد کی تحریر کا کوئی جواب نہیں، ایسے دل نشیں انداز میں اپنا مطلب ادا کر جاتے ہیں کہ چون و چرا کی گنجائش نہیں رہتی، میں نے ان کی تفسیر یہ سوچ کر اور پینسل لیکر بیٹھا تھا کہ جہاں جہاں مجھے اختلاف ہوگا۔ نشان لگاتا جاؤں گا، مگر ایک نقطہ بھی پکڑ میں نہیں آیا کہ نشان لگا سکوں۔

☆ **ظ۔ انصاری** صاحبِ طرز خطیب و ادیب تھے۔ وہ اپنے مضمون ''بنّے بھائی کی شخصیت'' میں لکھتے ہیں۔ بنّے بھائی لکھنو کے ایک خوشحال اور ذی اثر شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پلے بڑھے۔ رائٹ آنریبل سر وزیر حسن کے سات بیٹوں اور بیٹیوں میں وہ چھٹے تھے۔ کھرچن سب گھر والوں کو عزیز ہوتی ہے۔ یہ بھی اپنی ماں کے سب سے لاڈلے رہے۔

☆ ..راولپنڈی سازش کیس میں انہیں گرفتار کیا گیا تو وکیل سرکار نے پھانسی کی سزا تجویز کی تھی۔ بچپن کے دوست افتی میاں (افتخار الدین) اور چند احباب کے علاوہ باہر کی دنیا کو قطعی خبر نہ تھی کہ لاہور کی سفاک جیل میں ان پر کیا گزر رہی ہے، جب سیاسی حالات نے پلٹا کھایا تو وہ چھوٹ کر ہندوستان آگئے۔ جواہر لال سے ملنے گئے، کوئی گھنٹہ بھر تنہائی میں باتیں ہوتی رہیں۔ مہینہ بھر نہ گزرا تھا کہ انہیں بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں

دھانس دیا۔۔۔کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سابق جنرل سیکریٹری، ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر، راولپنڈی فوجی سازش کیس کے ملزم اور کمیونسٹ خانقاہ میں راضی بہ رضا بسر کرنے والے بنّے بھائی بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں اسی اطمینان اور نیک نیتی کے ساتھ آنے جانے لگے جیسے دس برس پہلے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسوں میں کالی قراقلی ٹوپی زیب سر کیئے ہوئے نظر آتے تھے۔

☆ چار برس سے اوپر وہ پاکستان کی جیلوں میں پابہ زنجیر گھمائے گئے (اس سے پہلے برطانوی ہندوستان کی جیلوں میں وہ قفس میں رہنے کے آداب سیکھ چکے تھے) اور الزام اتنا سنگین تھا کہ جو کچھ بھی گزر جاتی کم نہ تھی لیکن ؎

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

معلوم ہوتا ہے کہ انہیں نوجوانی میں ''لندن کی ایک رات'' اور اسکے بعد ''انگارے'' کے افسانے لکھتے وقت بے فکری کی جو زندگی میسر تھی وہ پندرہ برس کی بھاگ دوڑ کے بعد پھر جیل میں نصیب ہوئی۔ جواہر لال کی تاریخی تصانیف جیل کے دنوں کی یادگار ہیں، بنّے بھائی نے بھی جی لگا کر قلم سنبھالا۔ بیوی کو دل نواز خط لکھے جو اکیلا دم لکھنو میں زندگی کے پاپڑ بیل رہی تھیں اور بچے پال رہی تھیں۔'' ذکر حافظ'' میں اپنی خلوت گاہِ شوق سے پردہ اُٹھایا۔ ''روشنائی'' میں اپنی یادداشتیں جمع کیں جو بہت سے نئے پرانے چہروں کا البم ہے۔

''...ظ۔انصاری غزل کے خلاف تمہارا مضمون رضیہ نے مجھے بھیجا تو تم جانو جیل میں ہر چیز غور سے پڑھی جاتی ہے۔ مجھے غصہ آ گیا یہ کیا کفر پھیلایا کرتے ہو؟ غزل کی بہتات سے خیر ہم کو بھی ابکائی آتی ہے، لیکن حافظ کے متعلق ایسی سرسری رائے؟ لاحول ولاقوۃ...''

''ذکر حافظ'' پاکستان کی مچھ (بلوچستان) جیل میں ایسے وقت میں لکھی گئی جب فیض کی وہ نظم شائع ہوئی تھی...ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔۔۔ایسے میں انھوں نے بادۂ شیراز کی داددی۔

در اندیشہ محو تلاطم ہنوز قدح ساز ساقی تراشم ہنوز (غالب)

☆ کوئی نہیں جانتا کہ سجاد ظہیر کے وجود کی تکمیل میں اُن کی جاں نثار بیوی کا کتنا حصہ ہے جنھیں بہ حیثیت اہلِ قلم بھی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ان میں اگر اتنی سہار نہ ہوتی تو بنّے بھائی کے لئے ایک ہاتھ پر جامِ شریعت اور دوسرے ہاتھ پر سندان عشق لے کر عمر کے ساٹھ سال تیر جانا بھاری پڑتا۔۔۔

☆ **ڈاکٹر آغا سہیل** لکھتے ہیں۔

''بنّے بھائی سے ملنے جاؤ اگر وہ موجود نہیں ہیں تو رضیہ آپا نہایت شفقت و محبت سے پیش آتیں بلا کر بٹھاتیں، چائے سے تواضع کرتیں، کوئی تازہ افسانہ لکھا ہوتا تو سناتیں اور ہماری الٹی سیدھی رائے کو توجہ سے سن کر لکھ لیا کرتیں بنّے بھائی آجاتے تو نہایت تپاک سے ملتے'' آخاہ مولانا آغا، کہو کیا حال ہے، کیا لکھ رہے ہو کیا کیا پڑھ ڈالا۔''

''....دراصل بنّے بھائی کے گھرانے میں خود نوازی کی ریت نہ صرف پرانی تھی بلکہ اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی

ہوئی تھیں، ''نقوشِ زنداں'' کا میری موجودگی میں چرچا بہت تھا۔ رضیہ آپا نے چند خطوط سنائے بھی تھے لیکن مجھے تو بنّے بھائی کی ''ذکرِ حافظ'' سے دلچسپی تھی جسے بنّے بھائی انجمن کے جلسوں، یونیورسٹی کی ادبی مجلسوں میں بالاقساط سنا سنا کر آراء جمع کرتے پھرتے تھے تا کہ کتاب بنتے بنتے اس پر تنقید بھی ہو جائے لیکن میں نے ''ذکرِ حافظ'' پر تحسینی کلمات کے سوا اور کچھ نہ سنا۔ اسی زمانے میں غالباً کسی نے شرارتاً بنّے بھائی کے کان میں یہ بات پھونک دی کہ آغا سہیل سے ذکرِ حافظ کے مسّودے صاف کرالو.......مسّودے کی بات بتاتا چلوں کہ کسی وجہ سے بات ٹل گئی اور میری جان بچ گئی لیکن جس قدر مسودہ میں نے پڑھا مجھے اندازہ ہوا کہ بنّے بھائی عربی و فارسی ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔۔۔......ایک روز ذکر حافظ کا مسودہ بغل میں دبائے ہوئے اثر لکھنوی سے ملنے گئے۔ پوچھا۔ بنّے بھائی یہ کیا۔ بولے، میاں زبان کی صحت کے لئے مشورہ ضروری تھا۔

☆ **شاہد نقوی** اپنے مضمون ''سجاد ظہیر'' میں لکھتے ہیں۔

....اُس نشست میں خاص طور پر قابل ذکر اور چونکا دینے والی بات بنّے بھائی کی شاعری تھی، ہم میں سے بیشتر انھیں نثر نگار، ناول نگار، اور مترجم کی حیثیت سے تو جانتے تھے لیکن جب احتشام صاحب نے بنّے بھائی سے فرمائش کی کہ وہ غزل سنائیں تو اُن کے اِس جملے نے ہم سب ہی کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔ کچھ دوستوں کا اصرار تھا کہ وہ پنڈی سازش کیس کے متعلق تاثرات پیش کریں جنھیں بنّے بھائی نے بہت خوبصورتی سے ٹال دیا۔ بالآخر احتشام صاحب کی فرمائش کا پاس رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔

تجھے کیا بتاؤں ہمدم، اسے پوچھ مت دوبارا کسی اور کا نہیں تھا، وہ قصور تھا ہمارا

.....بعض لوگ انھیں ملحد سمجھتے تھے، ممکن ہے وہ ہوں۔ مگر جہاں تک مجلسی و تہذیبی زندگی کے آداب تھے، معاشرتی میلانات اور اخلاقی روائتیں تھیں وہ اُن پر پوری طرح کاربند بھی تھے اور ان کا صدق دل سے احترام بھی کرتے تھے۔ کوئی آٹھ سال کی بات ہے لکھنو کے محلّہ وزیر گنج کی مشہور آتو جی مسجد میں جب بنّے بھائی عید کی نماز پڑھنے گئے تو کئی ثقہ قسم کے بزرگوں کو زیرِ لب کہتے سنا گیا کہ بنّے بھائی کو غلط طور پر لامذہب مشہور کیا گیا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ایک اور واقعہ سے ملتی ہے۔ غالباً سات یا آٹھ محرم کی تاریخ تھی۔ قیصر باغ بارہ دری میں شہر کی ایک انجمن کی ثقافتی تقریب تھی۔ منتظمین میں مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف پیش پیش تھے۔ بنّے بھائی، رضیہ آپا، پروفیسر احتشام وغیرہ بھی مدعوئین میں سے تھے۔ تقاریر کے بعد جب اسٹیج سیکریٹری نے ایک فنکارہ کا نام لیا کہ وہ لوک ناچ پیش کریں گی تو ایک دم سے یہ حضرات اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جانے لگے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم فوراً آئے اور جانے کی وجہ پوچھی۔ بنّے بھائی نے بڑی ملائمت سے کہا کہ یہاں تک تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن آج آٹھ محرم ہے، ہم لوگ ناچ کسی قیمت پر نہیں دیکھ سکتے۔ ڈاکٹر اشرف نے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ یار تم کمیونسٹ بھی رہے اور شیعہ بھی اور ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔

....بنّے بھائی اپنے ہمعصروں کے علاوہ نئی نسل میں جس قدر مقبول تھے ۔وہ حیثیت کم ہی لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔انکے بڑے بھائی سید علی ظہیر جو وزیر وسفیر بھی رہ چکے ہیں اور کانگریس کے پرانے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے ہیں،انھیں بھی عوام میں وہ مرتبہ حاصل نہ تھا جو سجاد ظہیر کو حاصل تھا۔بنّے بھائی ہر قسم کے تعصّبات سے عاری تھے۔میں پاکستان نیا نیا آیا تھا بنّے بھائی کوئٹہ سینٹرل جیل میں تھے۔اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا۔''میرا مشاہدہ رہا ہے کہ عام طور پر یو پی سے آنے والے حضرات یہاں سے ناخوش ہیں اور انھیں شکوہ ہے کہ پنجابیوں کا اخلاق،زبان،آدابِ معاشرت ہم جیسی کیوں نہیں۔یہ بڑے سطحی الزامات ہیں اور اور عموماً تاریخ سے عدم واقفیت کی بِنا پر لگائے جاتے ہیں.....''

☆ **کیپٹن ظفر اللہ پوشنی** نے جیل کی یادداشتوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔''زندگی زنداں دلی کا نام ہے''مرتب پروفیسر عتیق احمد نے بھی اس کتاب سے مختلف اقتباسات شامل کئے ہیں۔یہاں ایک اقتباس دیا جارہا ہے۔

''۱۹۵۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔رات کے وقت ہم سب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ فیض نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی انہوں نے کہا کہ میں تنہا ہی شعر لکھوں اور سب دوستوں کو اپنا کلام سناتا رہوں،کیوں نہ ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے تاکہ میں بھی غزل لکھوں اور دیگر احباب بھی مصرعے طرح پر طبع آزمائی کریں۔۔۔ حیدرآباد سینٹرل جیل کے دوران قیام میں ہم نے کم از کم دس گیارہ بار مشاعرے کی محفلیں برپا کیں......دوسرا مشاعرہ ۳۰رمئی ۱۹۵۳ء کو یعنی ہمارے مقدموں کے فیصلے اور ہمیں سزائیں مل جانے کے چار مہینے بعد منعقد ہوا۔یہ آخری مشاعرہ تھا۔طرح کے مصرعے حسبِ ذیل تھے۔

؎ وحشتِ دل سرِ بازار لئے پھرتی ہے اور ؎ شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے اِن دنوں

میری غزل کے خاتمے پر فیض نے سجاد ظہیر سے فرمائش کی کہ اب وہ اپنا کلام سنا کر محفل کی رونق دوبالا کریں۔سجاد ظہیر ہمیشہ بڑے اہتمام سے شعر پڑھتے ہیں۔پہلے جیب سے لمبا سا کاغذ نکالا' عینک کو درست طریقے سے ناک پر جمایا،تمام سامعین پر ایک رفیقانہ نظر ڈالی' چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ پیدا کی' پھر ہاتھ اٹھا کر انگشتِ شہادت کو ہوا میں ہلاتے ہوئے بلند آواز میں فرمایا۔۔مطلع عرض کیا ہے۔۔

''ارشاد!''ساتھ آٹھ آوازیں بیک وقت سنائی دیں۔۔۔۔۔۔فرمایا

شعلے لپک رہے ہیں چراغاں ہے ان دنوں دل کی جراحتوں سے بہاراں ہے ان دنوں

اور پھر بولے

صدق و صفا و علم' تباہ حال و سر نگوں کذب و ریا و ظلم نمایاں ہے ان دنوں
تخلیق و فن زبون تو محنت ہے خوار خوار تنقیص و جہل صاحبِ ساماں ہے ان دنوں

''مولانا!ذرا کم ثقیل الفاظ استعمال کیا کیجئے،،خضر حیات نے فریاد کی،،ہماری اردو کا معیار تو آپ کو معلوم ہی ہے''

''چپ رہو جی شعر سنو۔''ارباب نے ٹوکنے والے کو ٹوکا۔
''آل رائٹ مسٹر کرنل۔شکر ہے،آپ کی سمجھ میں آجاتے ہیں''
''کوئی تمہاری طرح جاہل تو نہیں ہم!''
سجاد ظہیر نے غزل جاری رکھی۔اگلے چند شعر یہ تھے۔

ملبوسِ زرنگار میں قحبائے زشت رُو لیلائے حسن خاک بداماں ہے ان دنوں
انساں پہ ہے وحوش و بہائم کی سروری افسوس ارضِ پاک بیاباں ہے ان دنوں
منبر پہ کل تلک تو سناتا تھا شیخ وعظ رندوں کے ساتھ داخلِ زنداں ہے ان دنوں
شاعر گرا تو بھانڈ اُچک کر پہنچ گیا کیسی عجیب گردش دوراں ہے ان دنوں
خنداں ہے ملک بیچ کے امریکنوں کے ہاتھ جو مسخرا وطن کا نگہباں ہے ان دنوں

آخری شعر یہ تھا۔۔۔

انسان وہ ہے ظلم سے پیکار جو کرے شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے ان دنوں

☆ **میجر محمد اسحاق** نے لکھا ہے۔

....ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لئے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔اطلاع ملی کہ سید سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی۔ہم وہاں رک گئے اور سید صاحب کا انتظار کرنے لگے۔اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس،سر پر جناح کیپ جمائے،ایک بھاری بھرکم،زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ہمارے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہوسکتا ہے۔ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پہچان نہیں تھی۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نہایت قبیح صورت،درندہ صفت انسان ہوتے ہیں۔داہنے بائیں پستول لگاتے ہیں۔پیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں۔بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں اور ان کا موضوعِ سخن قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔اس لئے لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہئے تھی۔اور ان کو اس قسم کا کائیاں انسان ہونا چاہئے تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے۔یہ شخص جو نرم چال،پاکیزہ خدوخال اور ایک عدد عالمانہ توند لئے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہوسکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدت سے مصر تھے گویا یہ ان کا جزوایمان ہے۔چنانچہ چار و ناچار ہم سب نے یہ تسلیم کرلیا کہ یہ سجاد ظہیر نہیں ہوسکتے،کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولس کے کوئی خضر صورت ایجنٹ چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گم سم بیٹھے ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے رہے۔عدالت میں جب وہ کھڑے ہوکر گرجے کہ جناب والا!پندرہ دن ہوگئے اور مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔یہ بالکل لغو

(preposterous) بات ہے۔تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔

یہاں تک میں نے اپنی دانست میں پروفیسر عتیق احمد کی مرتبہ کتاب ''بنّے بھائی'' سے مختلف حضرات کی تحریروں سے ایسے اقتباسات درج کئے جو کسی نہ کسی عنوان سے بنّے بھائی کی شخصیت کے اہم رُخ کی آئینہ نمائی کرتے ہیں۔اب اپنے پاس موجود خطوط کی بات کرنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد ظہیر دسمبر ۱۹۷۳ء میں جب ماسکو میں افروایشیائی ادیبوں کی پانچویں کانفرنس منعقد ہوئی تو ہندوستانی ادیبوں کے وفد کی سربراہی کرتے ہوئے سوویت یونین کی ریاست قزاقستان کے دارالسلطنت الماتی گئے جہاں ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو دل کا دورہ پڑنے سے اُن کا انتقال ہوا۔رہے نام اللہ کا۔

سجاد ظہیر کی تصانیف میں۔۔۱۔انگارے (اِس مجموعے میں اُن کے پانچ افسانے شامل تھے)۔۲۔لندن کی ایک رات (ناولٹ)۳۔بیمار (ون ایکٹ ڈرامہ)۴۔نقوشِ زنداں (اپنی بیگم رضیہ سجاد ظہیر کے نام خطوط)۵۔ذکرِ حافظ (حافظ شیرازی کے کلام کی تفہیم وتشریح)۶۔روشنائی (ترقی پسند تحریک کی تاریخ، یادیں)۷۔پگھلا نیلم (نثری نظموں کا مجموعہ)۸۔میری سنو (خلیل جبران کی کتاب The Prophet کا ترجمہ شامل ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب ''اردو۔ہندی۔ہندوستانی'' کے نام سے بھی لکھی تھی۔مختلف رسالوں میں جو اُن کے مضامین شائع ہوئے تھے، اردو اکادمی لکھنو نے اُن کو ''مضامینِ سجاد ظہیر'' کے نام سے ۱۹۷۹ء میں شائع کر دیا تھا۔

میرے پاس سید سجاد ظہیر کے دو خط ہیں ایک اہم اور دوسرا بھی اس لئے اہم کہ اس سے مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔میں چاہتا تھا کہ اہلِ ادب کی خدمت میں وہ خط پیش کرنے کے ساتھ سجاد ظہیر کی سوانح سے مختصر اقتباسات دئے جائیں، اسی لئے متذکرہ کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا، ورنہ تحقیق میرا شعبہ ہے نہ تنقید۔۔کناڈا والے اشفاق حسین کا خدا بھلا کرے کہ انھوں نے ٹورنٹو میں سجاد ظہیر کی صد سالہ تقریب اعلیٰ پیمانے پر منائی (۲۶۔۲۷ر اگست ۲۰۰۵ء) مگر یہاں بھی جتنے مضامین پڑھے گئے ان میں ترقی پسند تحریک کے بانی کی سوانح کے تعلق سے کوئی مضمون یا مقالہ نہیں پڑھا گیا۔ سب سے اچھا مضمون ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا تھا اور سب سے اچھی تقریر لڈمیلا واسیلوا کی۔اسی طرح جون ۲۰۰۵ء میں ایک اردو کانفرنس ٹورنٹو میں منعقد ہوئی تھی، اُس میں ڈاکٹر قمر رئیس۔سید عاشور کاظمی اور علی احمد فاطمی اور شاہد ماہلی بھی تشریف لائے تھے۔یہ وہ نام ہیں جو سید سجاد ظہیر کی اور اُن کی بیگم جو معروف افسانہ نگار بھی ہیں، رضیہ سجاد ظہیر کی سوانح اس لئے بھی بہ آسانی لکھ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر وابستہ رہے ہیں۔اور ان کی دسترس میں وہ تمام مواخذ ہیں جو ترقی پسند تحریک کے بانی کی ایک مستند سوانح کے لئے لازمی ہو سکتے ہیں۔

میں نے سید سجاد ظہیر کو کبھی نہیں دیکھا۔سنا بہت کچھ۔پہلی بار ایک مکالمہ کی صورت میں جو میرے والد اور نانا کے مابین ہوا۔پھر کچھ باتیں اپنے والد کی خود نوشت میں پڑھیں۔اب جبکہ میں سجاد ظہیر کے دو خط اپنے نام آئے

ہوئے پیش کر رہا ہوں تو وہ باتیں اور وہ جملے جو میرے پاس محفوظ ہیں تمہید کے طور پر استعمال کر رہا ہوں، متذکرہ کتابوں سے جو ایک خاکہ سا مرتب ہوا ہے اس کو میں اپنے پاس موجود سجاد ظہیر کے خطوط کا پیش نامہ بنا کر اہلِ ادب کے سامنے حاضر کر رہا ہوں۔

میرے دادا، ڈاکٹر خواجہ علی محمد (پ ۱۸۷۰ء۔و ۱۹۳۳ء) اور سر وزیر حسن کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔سر وزیر حسن مسلم لیگ کے لئے کام کرتے تھے اور ڈاکٹر خواجہ علی محمد کانگریس اور خلافت کمیٹی سے وابستہ تھے۔اور ان کی زیادہ تر ملاقاتیں لکھنو، الہ آباد اور آگرہ میں ہوتی تھیں، سجاد ظہیر اپنے والدین کی آخری اولاد تھے (پیدائش۔۵ر نومبر ۱۹۰۵ء) اور میرے والد صبا اکبر آبادی، آگرہ میں ۱۴ر اگست ۱۹۰۸ کو پیدا ہوئے۔قیامِ پاکستان سے پہلے صبا صاحب کی سید صاحب سے کتنی، کب اور کہاں ملاقاتیں ہوئیں مجھے کچھ علم نہیں ہے مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ میرے والد ایک مرتبہ سید سجاد ظہیر سے ملنے کے لئے مچھ (بلوچستان) جیل گئے تھے اور تین چار بار حیدرآباد جیل۔سید صاحب کے والد سر وزیر حسن کا ذکر اس حوالے سے کہ وہ میرے دادا کے دوستوں میں سے تھے، صبا صاحب نے اپنے ایک خط (بنام سید علی حسنین زیبا ردولوی) میں بھی کیا اور ایک مرتبہ جب وہ حیدرآباد جیل ملنے کے لئے جا رہے تھے اور میرے نانا رعنا اکبر آبادی نے اُن کو جانے سے روکا تھا کہ کہیں خفیہ پولس والد صاحب کے پیچھے نہ لگ جائے، تب انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ ظہیر ہمارا دوست ہے اور اس کے والد سے ہمارے والد کے بھی مراسم تھے۔یہ میرے سامنے کی بات ہے۔

میں اپنے کئی مضامین میں بھی لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۵۷ کے آخر میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹیشن ڈائریکٹر حفیظ ہوشیارپوری نے اپنے گھر ایک شعری نشست رکھی جس میں طرح کا مصرع غالبؔ کا دیا۔

میں ہوں اپنے شکست کی آواز

حیدرآباد سندھ میں موجود تمام قابلِ ذکر شاعر شریک ہوئے۔صبا صاحب بھی کراچی سے حیدرآباد، دوپہر کی گاڑی سے پہنچے تھے، حیدرآباد بہت بڑا شہر نہیں تھا۔لوگ زور سے سانس بھی لیتے تھے تو دوسروں کو خبر ہو جاتی تھی۔حفیظ صاحب کو بھی معلوم ہو گیا کہ صبا صاحب کراچی سے آ گئے ہیں وہ دعوت دینے آ گئے۔دعوت منظور ہو گئی، نشست کی صدارت بھی صبا صاحب کے حصہ میں آئی۔جب وہ غزل پڑھنے بیٹھے تو کہا، حفیظ صاحب کی یاد فرمائی اور غالبؔ کا مصرع۔دو غزلیں ہو گئیں، ایک غزل کے چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں۔یہ کہہ کر انھوں نے غزل پڑھی:

دیکھتا ہوں سوئے حریمِ ناز　　　ہر نظر ہے فغانِ بے آواز

گیارہ شعر کی اِس غزل کا مقطع تھا۔

کام میں لاؤ دل کا خون صباؔ　　　کہ مزاجِ بہار ہے ناساز

داد و تحسین کے ساتھ یہ غزل ختم ہوئی تو حفیظ صاحب کے ساتھ ڈاکٹر الیاس عشقی کے والدِ محترم مولانا رزی جے

پوری، جن کا شمار اپنے عہد کے نہایت سخن فہم لوگوں میں ہوتا تھا، اصرار کیا کہ دوسری غزل بھی سنائی جائے۔ اس غزل کا مطلع تھا،

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز　　آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اور مقطع تھا۔۔۔　　تیرا رنگِ سخن الگ ہے صبؔا　　کہیں چھپتا ہے بات کا انداز

بلا مبالغہ اس غزل کے مطلع پر اتنی داد ملی کہ بیان سے باہر ہے۔ اور اتنی مرتبہ پڑھوایا گیا کہ مجھے یاد ہو گیا۔ جب میں یہ غزلیں صبا صاحب کی بیاض میں نقل کرنے لگا تو اس مطلع کے معنی پر اٹک گیا۔ اپنے حلقہء احباب میں تذکرہ کیا۔ طے پایا کہ خود صبا صاحب سے معنی و مفہوم کے لئے رجوع کیا جائے۔ صبا صاحب کو کراچی خط لکھ کر معنی پوچھے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ میں نے علامہ نیاز فتح پوری سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا تک اردو ادب کے تمام نامور اہل قلم کی خدمت میں یہ شعر، شاعر کا نام بتائے بغیر، معنی و مفہوم کی وضاحت فرمانے کی درخواست کے ساتھ بھیجا۔ سید سجاد ظہیر کو بھی خط لکھا۔ جواب آیا:

163 North Avenue

New Delhi...2

۱۹/اگست ۵۸ء

بھائی نسیم صاحب، آداب عرض ہے، آپ کا خط مورخہ ۳۰/جولائی مجھے ملا۔ لکھنو سے ری ڈائرکٹ ہو کر آیا تھا۔ آج کل میں کافی وقت دہلی میں رہتا ہوں۔ خط کا شکریہ۔ آپ نے جو شعر بھیجا ہے وہ چاہے کسی ترقی پسند شاعر کا ہو یا کسی دوسرے کا مجھے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ اُس پر سر کھپایا جائے۔ معمّوں سے مجھے خاص رغبت نہیں اور رمزیت اور ابہام کو میں شاعری کی صفت نہیں بلکہ خامی سمجھتا ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس میں تاثر کی کمی ہے' بلکہ فقدان۔ اور جہاں تک مغز و معنی کا تعلق ہے، وہ بھی کوئی غیر معمولی نہیں۔ جہاں تک میں اُسے سمجھ سکا ہوں مجھے تو اس کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ آئینہ ساز نے اتفاقاً آئینہ دیکھا اور اُسے اپنی صورت اُس میں نظر آئی تو اُسے یہ احساس ہوا کہ خود بینی کا عمل' جس سے خود پرستی وجود میں آتی ہے کوئی مستحسن چیز نہیں ہے اور آئینے بنا بنا کر تو وہ لوگوں کو ایسا کرنے میں مدد دے رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں نے اس شعر میں یہ معنی ''پہنائے'' ہیں۔ اسلئے کہ 'عکس کی آواز' کیا ہے' اس کے متعلق شاعر نے خود کچھ نہیں بتایا ہے۔ سوا اس کے کہ ''چونکنے'' سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ آواز کسی ایسے امر کے متعلق تھی جس کا عام طور سے اُسے احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہی اِس شعر کی خرابی بھی ہے۔
ویسے مجھے 'عکس کی آواز' کی ترکیب بھی اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ یہ شعر ہے کس کا؟ برائے مہربانی مجھے لکھئے۔ مجھے امید کہ وہ صاحب میرے اِن خیالات سے کبیدہ خاطر نہ ہوں گے۔ اچھے شاعر بھی کمزور شعر کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی (یعنی میری) رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اب میؔر کے اس شعر کو دیکھئے،

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر　　منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

کتنا لطیف' پُر مغز اور پُر اثر شعر ہے۔ دیواریں' یعنی عمارتیں انسانوں کی ہی بنائی ہوئی ہوتی ہیں؛ وہ اُن میں رہتے ہیں کام کرتے ہیں ہنستے بولتے ہیں' محبتیں اور نفرتیں کرتے ہیں؛ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک دیوار کے ایک 'انسانی' معنی ہوتے ہیں۔ انسان کی پوری تاریخ، انفرادی اور اجتماعی، اُن میں نظر آتی ہے۔ اگر چشم ہو۔ پھر دیکھئے اِس شعر کا تاثر کس غضب کا ہے، چاہے تاریخی عمارتیں یا آثار ہوں؛ یا وہ دیواریں جہاں ہم رہے ہیں اور جن کے سائے میں ہم سرگرمِ عمل ہوئے ہیں، دوستیاں، محبتیں اور نفرتیں کی ہیں۔ ہمارے کتنے جذبات اور یادیں اُن سے وابستہ ہوتی ہیں؛ دراصل اُن میں ہر طرف 'منہ' نظر آتے ہیں۔ مثلاً مجھے اِس وقت حیدر آباد سندھ کا جیل خانہ نظر آ رہا ہے، اور نہ صرف وہ صورتیں جو دو سال تک مجھے وہاں نظر آتی رہیں، بلکہ وہ بھی جن کے بارے میں نے سنا کہ اُس جیل کی دیواروں کے ''بیچ'' مجھ سے پہلے رہ چکی تھیں اور پھر وہاں سے سندھ کے امیروں کے مقبروں کے سبز گنبد بھی نظر آتے تھے۔ اُن کی اپنی ایک داستان تھی۔ اِس طرح میؔر کا شعر ہمارے جذبات اور ہماری عقل و فہم دونوں کی تربیت اور تزئین کرتا ہے' اور یہی شاعری کا بلند ترین منصب ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

نیازمند **سجاد ظہیر**

اس خط کا میں نے جواب لکھا جس میں صرف شاعر کا نام اور شاعر سے اپنا رشتہ بیان کیا۔ پہلا خط لفافے میں آیا تھا دوسرے کا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر۔ جس پر اُن کا پتا درج تھا نہ تاریخ لکھی تھی:

عزیزِ القدر نسیم میاں، آپ کا خط بہت سی یادیں اپنے ساتھ لایا۔ یہ اچھا کیا کہ مجھے پہلے خط میں صبا صاحب کا نام نہ لکھا شاید پھر میں بے لاگ تبصرہ نہ لکھ سکتا۔ قدرِ نعمت بعدِ زوال کے مصداق اب دور ہو کر مجھے صبا صاحب اور عزیز ہو گئے ہیں۔ میرا اسلام کہئے گا اور کبھی کبھی اپنی سب کی خیریت لکھتے رہئے۔

دعا گو **سجاد ظہیر**

ترقی پسند تحریک سجاد ظہیر کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ پروفیسر عتیق احمد کو ۱۹۹۱ء میں جب وہ سجاد ظہیر پر کتابیں مرتب کر رہے تھے جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اظہار ان کتب میں موجود ہے۔ سجاد ظہیر پر سوانحی مواد کم از کم پاکستان میں اُس طرح موجود نہیں ہے جتنی سہولت کے ساتھ ہندوستان میں دستیاب ہوسکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تحقیقی کام بہت کم ہوتا ہے جس کا ایک سبب جامعات کی کمی بھی ہے جبکہ ھندوستان میں یونیورسٹیاں زیادہ ہیں، معیار سے بحث نہیں لیکن ادب اور ادیبوں پر وہاں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں یہ بات پھر دہراؤں گا کہ اگر ہندوستان میں سجاد ظہیر جیسے اہم لوگوں پر کام ہو چکا ہے تو اس کو پاکستان تک بھی پہنچانا چاہئے۔

☆☆☆

پروفیسر قمر رئیس (دہلی)

سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک

بیسویں صدی میں جس ادبی تحریک نے ہندوستانی ادب کا رُخ بدل دیا اس کے آہنگ واسلوب اور مزاج وکردار پر دُوررس اثرات ڈالے، وہ ترقی پسند تحریک ہے۔ نہ صرف اُردو بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس تحریک کو جو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے زیرِ اثر شعروادب میں جو نئے رجحانات رونما ہوئے، مواد، موضوع اور تکنیک کے جو کامیاب تجربے ہوئے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حقیقت جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ادب میں اس تحریک کے پروان چڑھنے کے لیے حالات سازگار تھے، وہاں اس بات کو فراموش کرنا بھی ممکن نہیں کہ اس تحریک کے رہنما اور معمار اعلیٰ درجے کی تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے۔ اُن میں سچی لگن، ایثار واستقلال کا وہ جذبہ اور دانش مندانہ قیادت کی وہ صلاحیت موجود تھی جس کے بغیر کوئی بھی تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اس تحریک کے اولین معمار اور سب سے بڑے رہنما سید سجاد ظہیرؔ تھے۔ ان کی ذہانت، بصیرت، سنجیدہ انہماک اور ان کی بہترین تنظیمی اور تعمیری صلاحیت سے اس تحریک نے ہمہ گیر مقبولیت اور قوت حاصل کی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی سماج اور تہذیب میں اس تحریک کے پنپنے اور برگ وبار لانے کے آثار وعلائم پہلے سے موجود تھے۔ زمین نرم اور زرخیز تھی، آب وہوا سازگار تھی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستانی سماج، انسانی رشتوں اور عوامی تحریکوں میں اس تحریک کی جڑوں کو ڈھونڈ نکالا اور اس تحریک کا رشتہ آزادی، جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے ہندوستانی عوام اور ساری دنیا کے عوام کی بڑھتی ہوئی جدوجہد سے جوڑا اور مضبوط بنایا۔

سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

> ''ملک کے ہر ایک حصے میں ترقی پسند ادب کی تحریک ایک ناگزیر واقعہ کی طرح نمودار ہورہی تھی۔ ہماری تہذیب کا ماضی اور حال اس نئے ارتقا کا متقاضی تھا۔ ہم باہر سے کوئی اجنبی دانہ لاکر اپنے کھیتوں میں نہیں بو رہے ہیں۔''   (روشنائی۔ص ۴۲)

گذشتہ چالیس سال کی مدت میں یوں تو اس تحریک نے ملک کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کو متاثر کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اس تحریک کے اثرات کچھ زیادہ ہی وسیع اور دوررس رہے ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ اردو شعروادب میں ظلم وجبر کی قوتوں کے خلاف بغاوت اور سماجی انصاف اور آزادی کی حمایت کو ہمیشہ ایک برگزیدہ قدر کا درجہ حاصل رہا ہے دوسرا یہ کہ پریم چند، اقبال، جوش، حسرت موہانی اور بعض دوسرے قوم پرست ادیبوں کی تخلیقات میں آزادی، جمہوریت، سامراج دشمنی اور اشتراکیت کے تصورات پہلے ہی اپنی جگہ بنا چکے تھے اور رومانی باغیانہ فکر کی ایک توانا لہر سارے ادب میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اردو میں اس تحریک کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ رہا ہے کہ اس کے کچھ ممتاز رہنما سجاد ظہیر اور ڈاکٹر علیم خود اردو کے ادیب تھے۔ اردو ادیبوں اور دانشوروں کے حلقے میں ان کی کوششیں اور سرگرمیاں زیادہ موثر ثابت ہوئیں اور اس کے نتیجے میں اردو میں اس تحریک کو نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

سجاد ظہیر کی زندگی کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی تحریک کی تعمیر اور تہذیب میں بسر ہوا۔ ان کی شخصیت اس تحریک کی متحرک روح تھی۔ ایک بار لینن کے ایک طاقت ور حریف اور بالشویک جماعت کے رہنما نے اعتراف کیا تھا کہ مخالف نظریہ وفکر کا مقابلہ اور بطلان تو دشوار نہیں لیکن ایک ایسے انسان (لینن) پر فتح پانا ناممکن ہے جو مارکسی نظریہ وفکر کی زندہ صورت ہو جو ہر لحظہ اپنے نظریہ کی ترویج ودفاع کے لئے منطقی اور سائنسی استدلال سے مسلح رہتا ہو۔ سجاد ظہیر بھی ترقی پسند نظریہ ادب کی ترویج واشاعت کے لئے ہمیشہ اسی طرح کمربستہ رہتے تھے۔ جو لوگ انھیں قریب سے جانتے ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کوئی بھی صحبت یا محفل ہو وہ ترقی پسند ادب، اقدار اور آدرشوں کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ فن وادب کے ان مسائل کو چھیڑتے تھے جن پر انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نگاہ سے غور وفکر کیا تھا، یا جو انھیں بے چین رکھتے تھے۔ عالمی ادب اور انسانی تہذیب کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ قانون کی اعلیٰ تعلیم نے ان کے ذہن کو منطقی استدلال کی قوت بخشی تھی۔ پھر ان کے طرز گفتگو میں ایسی سادگی، نرمی، شائستگی اور خود اعتمادی ہوتی تھی کہ مخاطب کے دل میں بات بیٹھ جاتی تھی۔ اکثر ان کے حریف بھی جب ان سے ملتے تھے تو ان کے نقطۂ نگاہ اور خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ان کی شخصیت خود پسندی، خودنمائی اور ادعائیت کے اس جارحانہ احساس سے عاری تھی جو عام طور پر بڑے رہنماؤں اور دانشوروں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے میں ان کی پُرخلوص اور پُروقار شخصیت کی سحرکاری اور دل داری کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کا خیال کب پیدا ہوا؟ اور کن حالات میں اس تحریک نے جنم لیا؟ اس کی تفصیلی روداد سجاد ظہیر نے اپنے مضمون یادیں ۱۹۴۰ء اور اپنی کتاب ''روشنائی'' میں لکھی ہے۔ اس صدی کے چوتھے عشرے میں وہ انگلستان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں ہٹلری

فاشزم کا طلوع ساری دنیا کی امن پسندی جمہوری قوتوں کے لیے ایک بھیانک خطرہ بنتا جارہا تھا۔ جرمنی، اسپین، اطالیہ اور آسٹریا کے بعد فرانس میں بھی فاشسٹ اور رجعت پسند طاقتیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ عالمی معاشی بحران کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ ہندوستان میں ۱۹۳۰ء اور پھر ۱۹۳۲ء کی ستیہ گرہ کی تحریک کو بڑی بے دردی سے کچلا جا چکا تھا۔ تحریک آزادی کے کم و بیش تمام رہنما قید کیے جا چکے تھے۔ ہنگامی قوانین اور حکومت کے جبر و تشدّد سے ہر طرف خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ نوجوانوں میں غم و غصّہ اور احساسِ بے چارگی نے عجیب ہیجانی کیفیت پیدا کردی تھی اور انگلستان میں رہنے والے ہندوستانی نوجوانوں میں بھی غلامی اور جبر و استبداد کے وحشیانہ نظام سے آزادی حاصل کرنے کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے۔۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کرکے تاریخی سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے۔ اسی نسبت سے ہمارے دماغ اور روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوجاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیلِ علم کی ابتدا تھی۔'' (نیا ادب اور کلیم۔ جلد ۴، نمبر ۱، ص ۷۰)

یہ ان کے ذہنی سفر اور اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جو آج ہمارے ادب اور ادبی تاریخ کا قابلِ فخر حصّہ ہے۔ سید سجاد ظہیر ۳۲-۱۹۳۱ء میں چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے تھے۔ یہاں ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ہم خیال اور ہم عمر نوجوان ادیبوں کی دس کہانیوں کا مجموعہ ''انگارے'' کے نام سے لکھنؤ سے شائع کیا۔ جس میں پانچ کہانیاں خود اُن کی اور باقی احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی تھیں۔ فنّی نقطۂ نگاہ سے یہ کہانیاں خام اور کمزور سہی لیکن ان کے ذریعے اُردو میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی جو پریم چند اور سدرشن کی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری سے بہت مختلف تھی۔ اس میں بقول سجاد ظہیر سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصّہ اور ہیجان کا بے باکانہ اور باغیانہ اظہار تھا۔ اختر حسین رائے پوری نے ایک فرضی نام سے رسالہ ''اُردو'' میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نئے رجحان کو سراہا۔ ہر چند یہ کتاب قدامت پسندوں کے احتجاج پر حکومت نے ضبط کرلی لیکن اُردو افسانوی ادب میں اس نے ایک نئے موڑ کی نشان دہی ضرور کی۔ اس کے اثرات خاموشی سے اپنی جگہ بناتے رہے۔ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیب بھی نوجوانوں کی ان سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔

سجاد ظہیر اس مختصر قیام کے بعد جب لندن واپس آگئے تو اس کتاب کی اشاعت ہی سے نہیں، اس کی ضبطی سے بھی ان کے حوصلے بلند تھے۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ ادیب اور دانشور بھی اپنے وطن کے مقدّر بدلنے اور بنانے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے چند انقلابی نوجوانوں کے تعاون سے لندن میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بنایا جسے ۱۹۳۵ء میں باضابطہ ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا نام دیا گیا۔ اس کے جلسے پابندی سے ہونے لگے اور اس کا ایک مینی فسٹو بھی سائیکلو اسٹائل کرا کے سجاد ظہیر نے ہندوستانی مصنفین کو بھیجا۔ منشی پریم چند کو جب یہ مینی فسٹو ملا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اسے اپنے رسالہ ہنس میں شائع کیا بلکہ ایک ادارتی نوٹ میں ترقی پسند مصنفین کی اس انجمن اور اس کے مقاصد کو لبیک کہا:

''ہم اس تنظیم کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ زندہ و تابندہ ہو۔ ہمیں اصل میں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے اور ہم نے یہی آدرش اپنے سامنے رکھا ہے۔ ''ہنس'' بھی ان ہی مقاصد کے لیے جاری کیا گیا ہے۔'' (ساہتیہ کا ادیش ص ۲۵۶)

اسی زمانے میں پریم چند نے اپنی مشہور کہانی ''کفن'' لکھی جو دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ ''جامعہ'' میں شائع ہوئی۔ انگارے کے افسانوں میں بے لاگ اور باغیانہ حقیقت نگاری کا جو انداز سامنے آیا تھا یہ کہانی اس کی نکھری ہوئی اور فنّی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ صورت تھی گویا اس طرح پریم چند نے اپنی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری کی روایت سے خود ہی انحراف کیا تھا۔ منشی پریم چند کی طرح ہندوستان کے دوسرے ادیبوں نے بھی اس تحریک اور اس کے مقاصد کی تائید کی۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے دل کی ہی نہیں، وقت کی آواز ہے۔ اس سے سجاد ظہیر کو مزید حوصلہ ملا۔ اسی زمانے میں پیرس میں فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ادیبوں کا ایک عالمی اجتماع ہوا جس میں میکسم گورکی، ردمیں رولاں، ہنری باربس اور ٹامس مان جیسے عالمی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے شرکت کی۔ اجتماع میں اس پر زور دیا گیا کہ رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور تہذیب و انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لیے ساری دنیا کے روشن خیال ادیبوں کو متحد اور بیدار ہوجانا چاہیے۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ اس عالمی اجتماع کی کامیابی سے ان کے عزائم اور بھی بلند ہوگئے۔

۱۹۳۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہوکر سجاد ظہیر وطن واپس آئے تو ملک میں اس تحریک کو پھیلانے اور اسے کامیاب بنانے کا نصب العین ان کے سامنے تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ الہ آباد میں رہنے لگے۔ وہاں پریم چند، احمد علی، فراقؔ گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین پہلے ہی اس تحریک کے ہم نوا ہوچکے تھے۔ سجاد ظہیر ان سے ملے اور پھر مولوی عبدالحق، جوشؔ ملیح آبادی، ڈاکٹر تاراچند، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ سب نے ان کی تائید کی۔ ہمّت بڑھائی۔ وہ اس تحریک کو صرف اُردو تک محدود دیکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دوسری بڑی زبانوں میں بھی اسے فروغ دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس مقصد سے انھوں نے چند ماہ کے اندر

ہندی، پنجابی، بنگالی اور گجراتی زبان کے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ بڑی سرگرمی، مستعدی اور مجنونانہ لگن سے کام کر رہے تھے۔ اس تحریک کی تنظیم اور ادیبوں کے اشتراک فکر و عمل کے بارے میں بہت سے مسائل اگر ان کے ذہن میں روشن تھے تو کچھ نیم روشن اور غیر واضح بھی تھے۔ ''روشنائی'' میں انھوں نے لکھا ہے :

''جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلی تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رُخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں کسانوں اور درمیانہ طبقے کی طرف ہونا چاہیے۔ ان لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس و حرکت جوش و عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارا اولین فرض ٹھہرا۔''

اس سے ظاہر ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں ایک ترقی پسند ادیب کا منصب کم از کم ان کے ذہن میں واضح تھا اور ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کی تنظیم کے ذریعے اس تصوّر کو زیادہ سے زیادہ ادیبوں کی تائید و حمایت حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ چند ماہ کی تیاری کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کا اعلان کر دیا جو اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اس میں حسرتؔ موہانی، چودھری محمد علی رودولوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی، فیض احمد فیضؔ، فراق گورکھپوریؔ، ساغرؔ نظامی، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے شرکت کی۔ کانفرنس عام توقعات سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس میں پریم چند نے جو خطبہ پڑھا وہ ترقی پسند نظریہ ادب کی وضاحت کے سلسلے میں ان کے منشور سے بھی زیادہ جامع اور مؤثر ثابت ہوا۔ بعد میں سجاد ظہیر نے اس کا انگریزی ترجمہ اور کانفرنس کی روداد کتابی شکل میں Towards Progressive Literature کے نام سے شائع کی۔ کانفرنس میں سجاد ظہیر کو ہی اس کا جنرل سکریٹری چُنا گیا تھا۔ اس لیے اس کی قراردادوں اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام مختلف شہروں میں انجمن کی شاخوں کا قیام تھا۔ ملک میں ادیبوں کی یہ پہلی انجمن تھی جس کی تنظیم ادب کے بارے میں کچھ واضح اور مشترک مقاصد کے تحت عمل میں آ رہی تھی۔ سجاد ظہیر نے مسلسل تگ و دو کے بعد چند ماہ کے عرصے میں الہ آباد، بنارس، لکھنؤ، کانپور، علی گڑھ، پٹنہ، لاہور، دہلی اور امرت سر میں اس کی شاخیں قائم کر لیں۔ نوجوان ادیبوں کے ساتھ پریم چند جیسے بزرگ ادیب بھی جو اس زمانے میں سخت علیل تھے، بڑی مستعدی اور جوش سے تنظیمی کاموں میں سجاد ظہیر کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اپنے ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں پریم چند نے بنارس سے سجاد ظہیر کو لکھا تھا :

''میں نے یہاں ایک برانچ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم اس کے متعلق جتنا لٹریچر ہو، وہ سب بھیج دو۔ تو میں یہاں لیکھکوں کو ایک دن جمع کر کے بات چیت کروں۔ بنارس قدامت پرستی کا اڈا ہے اور ہمیں شاید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑے گا لیکن دو چار بھلے آدمی تو مل ہی جائیں گے جو ہمارے ساتھ اشتراک کر سکیں، پھر

میں پٹنہ جاؤں گا اور وہاں ایک شاخ قائم کرنے کی کوشش کروں گا''۔ (روشنائی)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب پریم چند جیسی عمر اور مرتبہ کے ادیب اس تحریک کو فروغ دینے میں ایسے والہانہ شغف سے کام کر رہے تھے تو دوسرے نوجوان ادیب کیسی لگن اور دلچسپی سے اُسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ ایک سال بھی مشکل سے گزرا تھا کہ کرشن چندر، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، مجاز، جذبی، سید احتشام حسین، مخدوم محی الدین، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، کیفی اعظمی اور سبط حسن جیسے با صلاحیت ادیب اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کے قریب آئے ان کے علاوہ ایسے ادیب بھی اس تحریک میں شامل رہے اور اس کے جلسوں میں سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے جو گاندھیائی یا قوم پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے مثلاً حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملاّ، علی عباس حسینی، ساغر نظامی، علی جواد زیدی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ۔

سجاد ظہیر کی کوشش یہی تھی اور ان کا خیال تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے دروازے ان تمام ادیبوں کے لیے کھلے ہوں جو ملک کی آزادی، سماجی انصاف اور جمہوریت کے لیے عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں، جو زندگی کے بارے میں ایک واضح سائنسی اور عقلی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک اور تنظیم نے ایک متحدہ محاذ کی صورت اختیار کر لی جس میں ہر فکر و خیال اور ہر سیاسی مسلک کے ادیب شریک تھے۔ جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر محمد اشرف سب کی حمایت اور سرپرستی اُسے حاصل تھی۔

☆☆☆

مارکسزم کی تھوڑی بہت شد بد رکھنے والے بھی اس نکتے سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ ایک مادیت پسند فلسفہ ہے۔ مارکس نے انسانوں کے تصورات اور عقائد کو نہیں بلکہ انسانی زندگی کے روزمرہ حالات کو اہمیت دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مارکسزم زندہ خیالات کی تجسیم ہے اور اس کا تعلق حقیقی سیاسی اور معاشی مسائل سے ہے لیکن موسیو ماشیرے ان چیزوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب تو مکروہ مارکسیت Vulgur Marxism ہے جسے ادب کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔۔۔۔ اسٹیون ارن شا نے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ''اگر کسی مقام پر کان کھودنے والے ہڑتال کر دیں اور اس ہڑتال کو، کوئی شخص قلمبند کر دے تو نئے نظریہ سازوں کے نزدیک وہ تحریر بیانیہ کے ذیل میں آئے گی لیکن اگر آپ نے اس ہڑتال کو طبقاتی کشمکش کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی تو پھر بیانیہ فوراً ہی ''مکروہ مارکسزم'' میں بدل جائے گا کیونکہ طبقاتی کشمکش کا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام پر حملے کے مصداق ہے''

(**فضیل جعفری** کے مضمون ''تھیوری، امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت'' سے اقتباس

بحوالہ کتاب **تماشائے اہلِ قلم** مرتب: **فاروق ارگلی** ص ۱۷۶، ۱۷۵)

ضیاء الحق (الہ آباد)

سجاد ظہیر ایک مثالی رہنما

سجاد ظہیر کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے کی تقریبات ہندوستان و پاکستان کے علاوہ اور کئی عالمی مراکز میں ان دنوں لگا تار منعقد ہو رہی ہیں اور کافی عرصے تک ہوتی رہیں گی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی الہ آباد میں ۱۱ر سے ۱۳ر نومبر ۲۰۰۵ء تک ہونے والا جلسہ اور جشن بھی ہوگا۔ الہ آباد سے سجاد ظہیر کا گہرا اور قریبی رشتہ رہا ہے۔ وہ یہاں دسمبر ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک رہے۔ پی۔ ڈبلیو اے (ترقی پسند مصنفین) کی انجمن کی داغ بیل یہیں ان کے والد کے گھر میں پریم چند، جوش ملیح آبادی، مولوی عبدالحق، رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری، مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں وغیرہ کی موجودگی میں ڈالی گئی اور اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں اس کی پہلی کل ہند کانفرنس کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ الہ آباد میں ہی پی ڈبلیو اے کی پہلی شاخ اور اس کا پہلا صدر دفتر قائم ہوا۔ الہ آباد میں ہی ان دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر تھا اور اس کے صدر جواہر لال نہرو کی قیام گاہ۔ یہیں نوجوان کمیونسٹ اور سوشلسٹ رہنما کنور محمد اشرف، زیڈ۔ اے۔ احمد، رام منوہر لوہیا وغیرہ اے آئی سی سی آفس میں مصروف کار تھے۔ سجاد ظہیر بھی الہ آباد شہر کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے اور شہری زندگی، مقامی سیاست اور مزدور تحریک میں سرگرم۔ وہ الہ آباد اور ملک کی زندگی میں ایک سنہرا دور تھا۔ مجھے بھی اس فضا میں سانس لینے اور نئی سیاسی بیداری اور شعور سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملا۔ آج سجاد ظہیر کی ۱۰۰ ویں سالگرہ منا کر ہمیں اس دور کی یاد تازہ کرنے، سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی زندگی اور کارناموں سے نئی نسل کو آگاہ کرنے اور Inspiration حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

اس میں شک نہیں کہ سجاد ظہیر بنیادی طور پر سیاست کے میدان کے آدمی تھے۔ آج کل کی سیاست نہیں بلکہ سماجی نظام کو بدلنے اور سماجی انصاف، انسانیت، برابری اور بھائی چارے پر مبنی سماج قائم کرنے کی جدوجہد والی سیاست کے۔ وہ کمیونسٹ نظریات اور کمیونسٹ پارٹی کی ممبری انگلینڈ میں طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۳۰ء کے آس پاس قبول کر چکے تھے اور تا عمر اس پر قائم اور عمل پیرا رہے۔ لیکن ان کا فطری میلان ثقافت (کلچر)، خصوصاً ادب کی طرف تھا۔ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے تھے وہ اپنے آپ میں ہی خاصا ادبی اور

ثقافتی اقدار میں رچا بسا ماحول تھا۔ اپنی شروعاتی تعلیم میں ہی انھوں نے ہندستانی اور ہند اسلامی تہذیب کی کلاسیکی تخلیقات سے اچھی واقفیت اور دلی رغبت حاصل کر لی تھی۔ اودھ کا عوامی کلچر تو ایک طرح سے انھیں ماں کے دودھ سے ہی مل کر ان کی شخصیت کا جُز بن چکا تھا۔ غرض یہ کہ ادب کی خدمت اور ترقی کے لیے شاید قدرت نے ہی انھیں تیار کر کے بھیجا تھا اور وہ کام انھوں نے زندگی میں بخوبی نباہا۔ وہ کوئی معمولی ادیب نہیں تھے بلکہ اپنی تحریروں میں گو وہ قدرے مختصر ہیں، انھوں نے نئی جہتیں اختیار کیں اور نئے راستے دکھائے جن پر چل کر ایک ہونہار نئی نسل نے بہترین شعری و نثری ادب تخلیق کیا جو آج بھی ہمارے ذہنوں اور روحوں کو منور اور معطر کر رہا ہے۔

جہاں وہ ایک نئے دور کے نئے ادب کی بنیاد رکھنے والے اور عملاً راہ دکھانے والے تھے وہیں اور اس سے کہیں زیادہ وہ ادیبوں کے تنظیم کار بنے۔ یہ ان کا بہت بڑا، یادگار اور لاثانی کارنامہ ہے، جس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ کوئی تنظیم اور خصوصاً ادیبوں کی تنظیم ہمیشہ یا بہت عرصے تک نہیں رہ سکتی پھر بھی اس کے اثرات یقیناً دیرپا اور اپنا نقش چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ غیر منقسم ہندستان اور تقسیم کے بعد پاکستان میں بھی یہاں کی تقریباً سبھی زبانوں کی ایک اور متحدہ تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین PWA کو تشکیل دینا بڑی حد تک انھیں کا (سجاد ظہیر کا) کارنامہ ہے۔ تنظیم آج چاہے کئی حصوں میں بٹی ہو لیکن تحریک آج بھی زندہ ہے اور برابر پھل پھول رہی ہے۔ سبط حسن نے صحیح لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ''ڈھاکہ سے پشاور اور دہلی سے مدراس تک کا سفر کرنا اور مختلف زبانوں اور نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور پھر انھیں ایک تنظیم کی کڑی میں پرو دینا بڑا جان جوکھوں کا مرحلہ تھا۔ لیکن سجاد ظہیر نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے ہنستے کھیلتے کر دکھایا''۔ آگے سبط بھائی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''وہ (سجاد ظہیر) عمر بھر انسانوں اور انسانیت کی سربلندی کے لیے بڑے خلوص اور چاؤ کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے اور کسی موقعہ پر بھی انھوں نے کسی قسم کی تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ایک ایسی زندگی بخش تحریک کے بانی کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا جس نے ابتدا سے اب تک اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والی نسلوں کو جنم دیا ہے۔''

سجاد ظہیر کی سیاسی زندگی میں بہت سے پڑاؤ آئے۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں انھوں نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک برطانوی سامراج کی قید کی صعوبتیں جھیلیں۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں انھوں نے پارٹی کی طرف سے ایک اہم سیاسی رہنما اور مرکزی کمیٹی کے ممبر کا کردار ادا کیا۔ پارٹی کے اردو اخبار قومی جنگ کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیے اور ایک نہایت اعلیٰ درجے کی ادارتی ٹیم تشکیل دی۔ ساتھ ہی بمبئی کو ہر لحاظ سے ایک زبردست ادبی مرکز بنایا۔ ۱۹۴۸ء کی کمیونسٹ پارٹی کی

دوسری کانگریس کے بعد ملک کی تقسیم کے مدِ نظر انھیں پاکستان کے علاقے میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی ذمہ داری دے کر بھیجا گیا۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی شروع میں ہی ایک غیر قانونی تنظیم قرار دے دی گئی تھی اور سجاد ظہیر کو روپوشی کی زندگی گذارنی پڑی جو اپنے آپ میں ایک بہت سخت اور مشکل زندگی ہوگئی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک ان مشکل حالات میں سرگرم رہنے کے بعد وہ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں حکومت پاکستان کو ایک فوجی بغاوت کے ذریعے الٹنے کی کوشش کے جھوٹے الزام کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر دیا گیا۔ اُسی کیس میں فیض احمد فیض کو بھی جو اُس وقت پاکستان کے سب سے بااثر اخبار پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے پھنسا کر قید کیا گیا۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک پاکستان میں روپوش رہ کر سجاد ظہیر نے جس طرح وہاں کی کمیونسٹ پارٹی اور اس کی ذیلی تنظیموں کو کھڑا کر کے بااثر بنا دیا وہ اپنے آپ میں ایک کارنامہ ہے جو تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں:

> ''انھوں (سجاد ظہیر) نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ بڑے پریشان کن حالات میں سنبھالا تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پیشتر بھی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر لاہور، پشاور اور کراچی میں موجود تھے۔ لیکن سب سے فعال صوبائی پارٹی پنجاب کی تھی۔ البتہ اس کے بیشتر رہنما سکھ یا ہندو تھے۔ سردار ممنوہن سنگھ جوش، سردار تیجا سنگھ سونتر، سردار کرم سنگھ مان وغیرہ۔ ان میں سے بعضوں کا تعلق غدر پارٹی سے رہ چکا تھا، ملک تقسیم ہوا تو ان سب لوگوں کو بھی ہندستان جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ سجاد ظہیر کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کے بکھرے ہوئے تاروں کو نہ صرف از سرِ نو جوڑا بلکہ نئے کارکنوں کی سیاسی تربیت کر کے اس نوزائیدہ پارٹی کو ایک نہایت باعمل اور منظّم جماعت میں تبدیل کر دیا۔''

سجاد ظہیر کے ایک اور ساتھی جو بمبئی میں بھی پارٹی کے اردو اخبار میں ان کے ساتھ کام کرتے تھے اور بعد میں اپنے وطن لاہور واپس جا کر وہاں بھی سجاد ظہیر کی رہنمائی میں کمیونسٹ پارٹی کا کام کرتے رہے۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

> ''بنّے بھائی زندگی کی صحت مندانہ اقدار اور تہذیب کے سچے علمبردار تھے۔ بدترین حالات میں بھی میں نے انھیں مایوس نہیں دیکھا۔ وہ ایک انتہائی مہذب، شائستہ اور دلربا شخصیت کے مالک تھے۔ ایک سچے ادیب اور فنکار جو دنیا میں حسن شائستگی اور انسانوں کی بہتری کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ بظاہر وہ بہت ڈھیلے ڈھالے بلکہ

> انتہائی سست قسم کے انسان نظر آتے تھے مگر انجمن ترقی پسند مصنفین اور بعد ازاں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اُنھوں نے حیرت انگیز تنظیمی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ ۱۹۴۸ء کے اوائل سے لے کر جب وہ پاکستان آئے، ۱۹۵۱ء میں ان کی گرفتاری کے وقت تک کا زمانہ کمیونسٹ پارٹی اور اس کے زیر اثر کام کرنے والی تمام تنظیموں کا انتہائی فعال زمانہ تھا۔ یہ انھیں کی صلاحیتوں کا انجام تھا کہ تمام ریاستی جبر اور مشکلات کے باوجود پاکستان کے محنت کش خیبر سے کراچی تک کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے جمع تھے۔ لاہور، کراچی اور پشاور میں دانشوروں کے فرنٹ پر ترقی پسند مصنفین سرگرم عمل تھے۔ پورے ملک کے صنعتی مزدور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی رہنمائی میں منظّم تھے، ریلوے مزدوروں کی یونین مرزا ابراہیم کی قیادت میں سب سے زیادہ فعال تھی۔ کسانوں کے فرنٹ پر سندھ، پنجاب اور سرحد میں زبردست کام ہوا۔ کراچی میں سوبھو گیان چندانی محنت کشوں کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اگر راولپنڈی سازش کیس جیسے مقدمے قائم کر کے اور سیفٹی ایکٹ جیسے ظالمانہ قوانین کے ذریعے اس ملک کے محنت کشوں کی تحریکوں کو سختی سے کچل نہ دیا جاتا تو آج یہیں ملک کی شکل مختلف ہوتی۔۔۔''

(حمید اختر مصنفہ 'آشنائیاں' جنگ پبلیشرز لاہور، ص ۲۳)

راولپنڈی سازش کیس میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض وغیرہ کے بچاؤ میں وکالت کے فرائض حسین شہید سہروردی نے انجام دیے اور بالآخر حکومت کے سارے الزامات بے بنیاد ثابت کر کے ان لوگوں کو بری کروا لیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک دنیا دم بخود دیکھتی رہی کہ برصغیر کی ان مایۂ ناز ہستیوں کو موت کی سزا تو نہیں سنائی جائے گی۔ ان کی رہائی کی ایک عالمگیر تحریک چلی اور حکومت پاکستان کو ان قیدیوں کو رہا کرنا پڑا۔ سجاد ظہیر کے لیے پاکستان میں قیام کسی طرح ممکن نہ تھا کیوں کہ وہاں کی حکومت پھر کسی بہانے انھیں جیل میں ٹھونسنے یا نظر بند کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ہندستان واپس آ گئے۔ پاکستان کے سات سالہ قیام نے پھر بھی بڑے نقوش چھوڑے۔ پاکستان اور ہندستان کے ادیبوں، دانشوروں، ترقی پسند عوامی کارکنوں میں یکجہتی کی بنیادوں کو مضبوط کیا جو آج ہم سب کے لیے، آئندہ کی مشترکہ جدوجہد کے لیے ایک مضبوط بنیاد ہے۔

ہندستان واپس آ کر سجاد ظہیر نے رفتہ رفتہ از سرِ نو یہاں کی تحریکوں میں شرکت کرنا اور ذمہ داریاں سنبھالنا شروع کیا۔ پارٹی کے اردو ہفت روزہ عوامی دور اور اس کے بعد حیات کی ایڈیٹری اور رہنمائی کا کام انھوں نے سنبھال لیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (PWA) اس درمیان بہت سے مراحل سے گزر چکی تھی اور اب ایفرو

ایشیائی ادیبوں کی تنظیم کی بھی تشکیل ہو چکی تھی۔ سجاد ظہیر نے انھیں حتی المقدور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لیے انھیں وقت کم ملا اور ۱۹۷۳ء میں ۱۳ رستمبر کو الما تا جو اس وقت قازقستان کا دار السلطنت تھا ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے دوران دل کا دورہ پڑنے پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ فی الجملہ ایک نامکمل Innings چھوڑ کر وہ ریٹائر ہو گئے۔ انھیں ابھی کم از کم پندرہ سال اور جینا تھا۔ تبھی وہ ان کاموں کو پورا کر سکتے جنھیں انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک قابل قدر مقام تک پہنچا دیا تھا۔ بقول سبطِ حسن:

> ''سجاد ظہیر جن کو ہم سب پیار سے بنّے بھائی کہتے ہیں بڑے آن بان کے آدمی تھے اور بڑی شان سے اس دنیا سے رخصت ہوئے انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، تمام عمر سچائی، انصاف اور انسانیت کی قوتوں کا ساتھ دیا اور بدی، بے انصافی، انسان دشمنی، ذہنی اور مادی غلامی، غرض کہ ان تمام قوتوں سے لڑتے رہے جو موت اور زوال کی نشانیاں ہیں۔'' (بنّے بھائی، مولفہ عتیق احمد، ص ۴۱)

بنّے بھائی اور ان کے ساتھیوں نے جو ورثہ چھوڑا ہے، جو مثال اصولوں پر قائم رہنے اور سمجھوتہ پرستی، موقعہ پرستی، مفاد پرستی جیسی لعنتوں سے دور رہنے کی انھوں نے قائم کی ہے اس پر ثابت قدم رہنا اور آگے بڑھتے رہنا سب کی ذمہ داری ہے۔

☆☆☆

''ہمارے اکثر ترقی پسندوں نے بغیر سوچے سمجھے مذہب کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اس میں انگریزوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم کا مقابلہ کوئی فکری تحریک ہی کر سکتی ہے، چنانچہ انہوں نے ایک پلاننگ کے تحت اسلام اور کمیونزم کا تضاد پیدا کر دیا حالانکہ اسلام اور کمیونزم کے بنیادی عقائد اور اخلاقیات ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ اقبالؔ نے یونہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ ؎

نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

عبید اللہ سندھی نے کہیں لکھا ہے کہ لینن اسلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور سٹالن تو برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کا ایک بلاک بنانا چاہتے تھے۔ لیکن شاطر برطانیہ نے نہ صرف یہ بلاک نہیں بننے دیا بلکہ الٹا مسلمانوں کو کیمونسٹوں سے ایسا لڑایا کہ یہ لڑائی پھر مسلمان ہی نے لڑی۔ انگریز کا یہ منصوبہ افغانستان میں جا کر مکمل ہوا۔ ہمارے ترقی پسند عملی کی بجائے آئیڈیلسٹ تھے۔ انہوں نے نہ تو یہاں کے ثقافتی مزاج کو سمجھا اور نہ مذہب کے گہرے اثرات کو محسوس کیا۔''

(**ڈاکٹر رشید امجد** کی خود نوشت **تمنا بے تاب** صفحہ نمبر ۱۳۱۔۱۳۰ سے اقتباس)

صدیق الرحمٰن قدوائی (دہلی)

نقش قدم تو زندہ ہیں

میں اور میری عمر کے لوگوں نے جب پہلی پہلی بار اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ تو بنّے بھائی کی شخصیت میں ہمیں اپنا پہلا ہیرو ملا تھا۔ اس وقت بنّے بھائی جو کچھ کہتے اور لکھتے تھے وہ ہم پوری طرح سمجھ بھی نہ سکے ہوں گے۔ پھر بھی کوئی جذبہ، کوئی آئیڈیلزم کوئی اَن دیکھی اور اَن کہی سی بات تھی جو دلوں کو اور ذہنوں کو عمر کے ایک خاص دَور میں طرح طرح کی وابستگیاں عطا کرتی ہے۔ چنانچہ بنّے بھائی سے میری وابستگی اس وقت سے ہے جب میں نے انہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ دیکھنا تو یوں بھی مشکل تھا کہ وہ اُن کی ''روپوشیوں'' کا زمانہ تھا بس ان کے بارے میں سنتے تھے یا تھوڑا بہت کہیں پڑھ لیتے تھے۔ پھر ملک تقسیم ہوا، بنّے بھائی پاکستان چلے گئے۔ گرفتار ہوئے اور پھانسی کے تختے تک پہنچ کر واپس آئے۔ اس واقعہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو فیضؔ کی بات یاد آتی ہے۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے ۔۔۔ تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

پاکستان سے رِہا ہو کر جب بنے بھائی ہندوستان آئے تو انہیں قریب سے دیکھنے اور ان سے بات کرنے کا موقع ملا۔ پھر آخر وقت تک اُن سے نیاز حاصل رہا۔

بنّے بھائی اردو میں ترقی پسند تحریک کے بانی تھے جو ہماری زندگی میں اس صدی کی سب سے بڑی، سب سے با اثر اور نتیجہ خیز ادبی تحریک ثابت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وجود میں آنے والے شعر و ادب نے ہندوستان میں مارکسزم اور ترقی پسند سیاسی و سماجی نظریات کو پھیلانے میں بہت اہم حصّہ لیا۔ اور زندگی کے حقائق کو محسوس کرنے اور سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک نیا ذہنی اور جذباتی ماحول پیدا کیا سچ تو یہ ہے کہ نوجوانوں کی پوری نسل ترقی پسند ادب کے توسط سے مارکسزم تک پہنچی، تحریکات کو وجود میں لانے اور فروغ دینے کا عمل ہمیشہ ان افراد کے ذریعے ہوتا ہے جو اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے افراد کا ایک گروپ ۱۹۳۵ء کے بعد ظہور میں آیا۔ اور اس کے سربراہ بنّے بھائی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کے نوجوانوں کے ذہن و مزاج کی تربیت اور اس دَور کے ہندوستان کی دانشورانہ زندگی کی تشکیل میں بہت اہم حصّہ لیا۔

اشتراکی نظریئے کی مقبولیت، دنیا کے ایک بڑے حصّے میں اشتراکی تحریکات کی کامیابی اور عوامی

حکومتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ نظریاتی مباحث بھی زور و شور سے ہونے لگے۔ مختلف اشتراکی ممالک میں اور خود ہمارے ملک میں اشتراکیوں کے درمیان نظریاتی اختلافات بھی نمودار ہوئے اور ایک جان دار نظریہ حیات کو عمل میں لانے کے دوران تجربات و تغیرات کے اختلافات کا پیدا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ اس کی صحت کی نشانی ہے یا خود مارکسزم کے مطابق اس کشاکش ہی سے علم و عمل کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ بنّے بھائی مارکسی تحریک سے تمام عمر عملی طور پر وابستہ رہے تھے۔ اس لئے ان مباحث میں ان کا شامل ہونا اور خود ان کے رول کا معرض بحث میں آنا قدرتی امر تھا۔ بنّے بھائی ان بحثوں میں ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ شریک ہوئے اور اپنے چھوٹوں سے تو ان کا رویّہ نہ صرف مشفقانہ رہا بلکہ وہ تو اس بات کی ہمّت افزائی کرتے تھے کہ لوگ سوچیں، اختلافات ہوں تو ان کا جرأت کے ساتھ اظہار کریں باہمی گفتگو اور بحث مباحثے کے ذریعے مسائل کی وضاحت اور ان کے حل کی تلاش کی کوشش کریں۔ ان کی ذات شریف رواداری کا ایک نمونہ تھی۔ ان کا خیال آتا ہے تو ان کے ہونٹوں کی دلکش مسکراہٹ نگاہوں میں دمکنے لگتی ہے اور اس وقت یہ احساس فنا ہو جاتا ہے کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔

☆☆☆

''ادب کبھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اگر اخلاقیات کا ایک اپنا مقصد ہے اور سیاسیات کا اپنا! اسی طرح اگر کاروبار، زراعت حتیٰ کہ ورزش اور کھیل تک کے اپنے اپنے مقاصد ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کا بھی ایک اپنا مقصد نہ ہو۔ مگر یہ مقصد زندگی کے باقی شعبوں کے مقاصد سے قطعاً جدا ہے اور جمالیاتی تسکین کے ذریعے تزکیۂ نفس پر منتج ہوتا ہے۔

ادب اپنے خالق اور قاری دونوں کے جذباتی تشنج کو فرو کر کے انہیں ایک ارفع تر انسانی سطح پر لے آنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے بڑا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے؟۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ادب کو اس کی اصل کارکردگی اور مقصد سے ہٹا کر بعض دوسرے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنانے کی کوشش کی جائے۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ ادب کی تخلیق کا عمل ایک قطعاً آزاد عمل ہے۔ اسے اگر کسی مینی فیسٹو کے تابع کر دیا جائے تو یہ فی الفور رُک جائے گا اور ادب کے بجائے اشتہارات چھپنے لگیں گے۔

ادب اور مقصدیت از **ڈاکٹر وزیر آغا** بحوالہ **دائرے اور لکیریں**

اک تم ہو جو غم کو ٹھوکر مار کے آگے بڑھتے ہو
اک ہم ہیں جو سینے میں اس غم کو بلونے لگتے ہیں

وزیر آغا

پروفیسر علی احمد فاطمی (الٰہ آباد)

سجاد ظہیر: ایک تحریک، ایک تاریخ

سجاد ظہیر ایک ادیب تھے، پھر ایک تحریک ہوئے اور اب ایک تاریخ ہیں۔ لیکن ایک ادیب تاریخ کیسے بنتا ہے اس کے پیچھے بھی ایک تاریخ پوشیدہ رہتی ہے۔ آج اس تاریخ کو صرف اس لئے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اس سال (۲۰۰۵-۱۹۰۵) ان کی پیدائش کا سوواں سال ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہم ایک ایسے دور اور ماحول سے گزر رہے ہیں جہاں شاعروں، فنکاروں اور ان کے کارناموں کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت بھلا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایک نئی سوچ اور سنسکرت کو ہوا دی جا رہی ہے جو بنیادی طور پر ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت اور ادب کو کنارے کر کے مادّہ پرست تہذیب کو کھلے عام ترغیب دی جا رہی ہے۔ انسانوں کو مذہب، علاقہ اور طبقہ میں تقسیم کر کے انہیں گمراہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے چنانچہ آج بھی ہو رہا ہے اور اب تو اس میں تبدیلی اور ترقی کا غیر شعوری احساس بھی شامل ہو گیا ہے۔ سنجیدہ، حساس اور باخبر انسان اور ادیب کل بھی بے چین اور پریشان تھے اور آج بھی بے چین اور پریشان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دولت مند گھرانے کا نوجوان سجاد ظہیر (۱۹۷۳-۱۹۰۵) جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن تو جاتا ہے لیکن لندن میں رہنے والے ہندستانیوں بالخصوص طالب علموں کا قریب سے مشاہدہ کرتا ہے جو زیادہ امیر اور جاگیردار گھرانوں سے، تعلیم حاصل کرنے کم، عیش و عشرت کرنے زیادہ آئے تھے۔ لیکن یہ دردمند انسان اس ماحول میں دنیا کے حالات کو نزدیک سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور چونکہ ادیب و تخلیق کار کا ذہن اور جذبہ لے کر آیا تھا اس لئے دنیا کی سیاست، طاقت اور سامراج وادی نظام کی اُتھل پتھل کو ادب میں تلاش کر رہا تھا اور چونکہ اردو ادب پر ہمیشہ سے ہی جاگیرداروں اور اوپری طبقہ کا تسلط رہا ہے۔ سماج، سیاست، احتجاج وغیرہ کی باتیں دیر سے اٹھتی رہی ہیں۔ پھر بھی ان دنوں غالب، حالی کی کوششوں سے چکبست اور اقبال کے یہاں راست طور پر سیاست اور انقلاب کی آواز سنائی دینے لگی تھی اور،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یا چکبست کا مصرع ؎ 'نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے'

نعرے کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اردو شاعری میں بکھرا سماج اور بکھری بکھری سی سیاست داخل ہو چکی تھی لیکن ناول اور افسانے کی دنیا میں یہ گونج نہ تھی۔ پریم چند نے پہلی مرتبہ 'سوزِ وطن' کے ذریعہ انگریزوں کی مخالفت کی لیکن انگریز سرکار کی جابرانہ دھمکی اور نام کی تبدیلی کام کو بھی تبدیل کر گیا اور وہ ڈپٹی نذیر احمد، شرر اور راشد الخیری کے اصلاحی راستے پر چل پڑے۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ وہ خود بھی کائستھ گھرانے کے شریف صلح پسند انسان تھے۔ پہلے آریہ سماجی ہوئے، پھر گاندھی وادی جہاں تشدد وغیرہ کا گزر نہیں تھا۔ اس لئے پریم چند کی کہانیوں میں طبقاتی تفریق اور جدوجہد کا شعور ملتا ہے لیکن راست طور پر احتجاج کم۔ وہ چوٹ تو کرتے ہیں لیکن وہ چوٹ نعرہ بنتی کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ پھر بھی پریم چند عظیم ہیں اور اس سے ان کی عظمت متاثر نہیں ہوتی۔ کہنا یہ ہے کہ پہلی بار جو کہانیاں انگارہ بن کر بہت کچھ جلا دینا چاہتی ہیں وہ سب کچھ پہلی بار انگارے کی کہانیوں میں ملتا ہے۔

انگارے (۱۹۳۲ء) میں سجاد ظہیر کے ذریعہ ترتیب دیا ہوا نو (۹) کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ جس میں خود سجاد ظہیر کی پانچ کہانیاں (نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، گرمیوں کی ایک رات، دلاری، پھر یہ ہنگامہ) مثال ہیں۔ رشید جہاں کی ایک کہانی (دلّی کی سیر) اور ایک ڈرامہ (پردے کے پیچھے) احمد علی کی دو کہانیاں (بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات) اور محمود الظفر کی ایک کہانی (جواں مردی) شامل تھیں۔ انگارے کے چھپتے ہی ایک ہنگامہ ہو گیا۔ جاگیردار، زمیں دار اور مذہبی طبقہ کی طرف سے جم کر مخالفت ہونی ہی تھی اس لئے کہ سجاد ظہیر کی کہانیوں میں گہرا طنز اور کاٹ تھی۔ اور بڑی نزاکت و جرأت کے ساتھ بلکہ کڑواہٹ کے ساتھ ان کے کھوکھلے رویوں کی پول کھولی گئی تھی۔ یہ پول کھولنے میں صرف جوانی کا جوش اور مذاق نہ تھا بلکہ ایک ترقی پسند اور احتجاج بھری سوچ تھی۔ ایک نظریہ تھا جو نوجوان سجاد ظہیر کے ذہن میں پرورش پا چکا تھا اس لئے کہ وہ نوجوانی میں ہی تحریک آزادی میں حصہ لے چکے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس (لندن برانچ) کے فعال رکن رہے اور ہندستانی طالب علموں کو جمع کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں انگلینڈ میں ہندستانی کمیونسٹ طالب علموں کا پہلا گروپ قائم کر چکے تھے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ سماج واد اور مارکس واد کے مطالعہ نے ان کے دل و دماغ میں آگ بھر دی تھی۔ جو آگے بڑھ کر انگارے کی شکل میں روشن ہوئی۔ انگارے کی کہانیوں میں سماج کی برائیوں، مولوی اور امیر طبقہ کے خلاف جو آواز ہے وہ ایسا پتھر ہے جس نے تالاب کے ٹھہرے اور گندے پانی میں ایک ہلچل مچا دی۔ ظاہر ہے کہ جب ہلچل مچی اور چھینٹیں پھیلیں تو ہائے توبہ مچنی ہی تھی۔ اردو کہانی کے سفر میں بھی انگارے میل کا پتھر کا ثابت ہوئی۔ پریم چند کی کہانیوں کے سماجی شعور اور انگارے کی کہانیوں کے جرأت بھرے انقلابی شعور نے مل جل کر ایک نئی راہ بنائی جس پر کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی وغیرہ چل پڑے اور اردو کہانی دیکھتے دیکھتے مالا مال ہو گئی۔ یہ کہا جائے کہ ترقی پسند کہانی کاروں کے آنے، انگارے کے چھپنے اور انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہونے سے خود پریم چند کے ذہن میں انقلابی تبدیلی آئی تو غلط نہ ہوگا۔ کفن اور گئودان جیسی تخلیقات۔ ادب کا مقصد

جیسا مضمون اس کی مثالیں کہے جا سکتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب فسطائی طاقتیں اپنے عروج پر تھیں تو دنیا کے بڑے بڑے ادیب و دانشور ادب اور ثقافت کے تئیں کستے شکنجے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور پیرس میں ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس میں نوجوان سجاد ظہیر نے بھی شرکت کی اور دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں مثلاً گورکی، رال فاکس، روماں رولاں، ہینری باربوس وغیرہ سے ملاقات کی اور حرکت و حرارت، جوش و ہمت میں سرشار ہو کر جب لندن واپس لوٹے تو ادیب دوستوں (ملک راج آنند، تاثیر، جیوتی گھوش، ہیرن مکھرجی وغیرہ) کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کا خاکہ تیار کیا اور باقاعدہ ایک مینی فیسٹو بھی تیار کیا جس کی کاپیاں ہندوستان کے دوستوں کو بھیجیں۔ نومبر ۳۵ء میں وہ تعلیم مکمل کر کے واپس ہندستان آئے۔ ان کے والد الہ آباد ہائی کورٹ میں مشہور وکیل تھے اسی راہ پر سجاد ظہیر کو بھی لگایا لیکن سجاد ظہیر کے ذہن میں تو بہت سارے انقلابات رقص کر رہے تھے انھوں نے وکالت کے بجائے سیاست کی راہ پکڑی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے قریب آئے اور کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انہیں دنوں ہندوستانی اکادمی، الہ آباد میں کوئی کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کرنے پریم چند، جوش، عبدالحق جیسے مشہور ادیب و شاعر الہ آباد آئے، سجاد ظہیر نے فراق گورکھپوری اور اعجاز حسین کی مدد سے اپنے گھر پر ایک نشست کا اہتمام کیا اور ان بزرگوں کو مدعو کیا۔ یہ لوگ آئے سجاد ظہیر نے نشست کا مقصد بیان کیا اور انجمن کا مینی فیسٹو پڑھ کر سنایا۔ سب نے انجمن کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا او مینی فیسٹو پر دستخط کر دئے۔ اس نشست کے انعقاد، بزرگوں سے ملاقات اور انجمن کے مقاصد سے اتفاق نے نوجوانوں کے حوصلے بلند کر دئے اور انھوں نے ۳۰/دسمبر ۱۹۳۵ء الہ آباد میں انجمن کی بنیاد ڈال دی اور یہ طے کیا کہ اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی جائے اور پھر پوری تیاری، محنت و لگن کے ساتھ یہ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت پریم چند نے کی اور اپنا فکر انگیز مضمون ادب کا مقصد بطور صدارتی خطبہ پیش کیا۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں رشید جہاں اور ان کے شوہر محمود الظفر نے کلیدی رول ادا کیا اور جس میں حسرت موہانی اور ساغر نظامی جیسے مشہور و بزرگ شعرا کے علاوہ نوجوان ادیبوں و شاعروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سجاد ظہیر روشنائی میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ممتاز ادباء پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے روپے کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجہ میں سفر کر کے لکھنؤ پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ سے چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگریٹ کے لئے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں

ہے ------ بعد کے اجلاس میں جن لوگوں نے مقالے پڑھے ان میں احمد علی، محمود الظفر اور فراق تھے۔ بنگال کی انجمن کے سکریٹری نے جدید بنگالی ادب کے رجحانات اور بنگال میں انجمن کی تنظیم پر لکھی ہوئی ایک اچھی رپورٹ پیش کی۔ گجرات، مہاراشٹر، مدراس کی زبانوں کے نمائندوں نے زبانی تقریریں کیں----- کانفرنس کے آخری دن شام کے اجلاس میں منجملہ اوروں کے سوشلسٹ لیڈروں جے پرکاش نرائن، یوسف مہر علی، اندولال یاجنک، کملا دیوی چٹوپادھیائے اور میاں افتخار الدین نے بھی شرکت کی۔ یہ لوگ اس زمانے میں ملک کے درمیانہ طبقے کے سوا ان روشن خیال نوجوانوں کی نمائندگی کرتے تھے جو سامراج دشمن انقلاب چاہتے تھے اور سوشلزم کے نئے نظریے کو اپناتے تھے۔''

اس انجمن کو ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو وغیرہ کی دعائیں اور نیک خواہشات حاصل ہوئیں۔ ایسے تاریخی اور انقلابی قدم سے انجمن کی دھوم مچ گئی اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کے چرچے ہونے لگے اور ہر ادیب وشاعر اپنے آپ کو ترقی پسند کہنے لگا۔ ترقی پسند ہونا مارکس پر باتیں کرنا ایک طرح سے ادبی فیشن اور چلن بن گیا۔ یہ سب اپنی جگہ پر لیکن سنجیدہ حلقے میں ایک بڑا سوال بھی کھڑا کیا گیا کہ جب آزادی کی تحریک کام کر رہی تھی جب اقبال، پریم چند جیسے بڑے شاعر وادیب بڑا اور بامقصد ادب جنم دے رہے تھے تو پھر الگ سے انجمن کی ضرورت کیوں؟ اس کا جواب ایک خطبہ میں سجاد ظہیر یوں دیتے ہیں:

''بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے اور جب حالی، شبلی اور اقبال بھی ترقی پسند ہیں تو پھر آخر ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

یہ سوال ایسا ہی ہے جب دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک پھول کھلتے رہے ہیں تو باغ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس انجمن کی ضرورت اسی وجہ سے ہوئی جس وجہ سے دوسری انجمنوں کی ہوتی ہے یعنی کہ انسان اجتماعی طور پر ادبی مسائل پر گفتگو اور بحث کریں۔ انسان اور جماعت کو سمجھیں، سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ اجتماعی کوشش انفرادی کوشش سے بہتر ہوگی۔''

اسی درمیان سجاد ظہیر کا ناولٹ 'لندن کی ایک رات' (۱۹۳۸ء) شائع ہو کر مشہور ہوا۔ لندن میں اقامت پذیر ہندستانیوں بالخصوص طالب علموں کی سوچ اور رویوں میں ڈوبا یہ ناول اپنے موضوع اور اسلوب کے رخ سے انوکھا اور الگ سا تھا۔ اس نے اپنی شہرت کی ایک مثال قائم کی جس نے تخلیق کار سجاد ظہیر کو الگ مستحکم شکل اور حیثیت عطا کی۔ تقریباً ۷۰ برس گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ ناول اردو کے منتخب ومعیاری ناول میں شمار کیا

جاتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کا خیال ہے کہ:

''تکنیک کی نظر سے یہ ایک انوکھی تخلیق ہے۔ محض ایک رات میں لکھا گیا یہ ناول سامراج وادی نظام پر گہرا طنز کرتا ہے۔ زبان وبیان اور فلیش بیک کی تکنیک نے اسے زندہ جاوید کر دیا۔'' خود سجاد ظہیر نے ایک جگہ اچھی بات کہی:

''انسانی زندگی کا دائرہ صرف عشق ومحبت تک محدود نہیں ہے۔ کیا اس کے علاوہ بہت سے مسائل اور بھی بہت سی دلچسپ اور غیر دلچسپ چیزیں نہیں ہیں جن سے ہم وابستہ ہیں۔ ان چیزوں کو چھوڑ کر ہم خلائے محض میں رہ کر عشق نہیں کر سکتے۔''

یہی سجاد ظہیر کی فکر اور فلسفہ تھا جو انہیں سوشلزم کی طرف لے گیا۔ اور وہ ایک نظریاتی سیاست یعنی کمیونسٹ پارٹی اور نظریاتی ادب یعنی انجمن ترقی پسند مصنفین میں ڈوبتے چلے گئے اور اپنی کوششوں سے دونوں کو قریب بھی کرتے گئے ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۵ء تک لگاتار بڑی بڑی کانفرنسیں کیں جو دلی، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ جیسے شہروں میں ہوئیں۔ اسے وقت کی ضرورت کہیئے یا سجاد ظہیر کا کارنامہ۔ ہندی، اردو، پنجابی، بنگالی وغیرہ کے ادیبوں کا میلہ سا لگ گیا۔ ایک بھیڑ امنڈ پڑی سب انجمن سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین جلد ہی تحریک میں بدل گئی۔ ایک ایسی ادبی تحریک جس کا دہائیوں سے انتظار تھا، جس نے صدیوں کا غبار دھو دیا، جس نے حال کی دھند مٹا دی، جس نے مستقبل کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ جس نے نہ صرف ادب بلکہ تمام ادبی اصناف کے خانے اور جالے صاف کر دیئے۔ جس نے تنقید کو ایک وقار اور وژن بخشا۔ جس نے سفرنامے، افسانے، رپورتاژ وغیرہ کو جلا بخشی، خطوط نگاری کو بھی نئی پہچان دی۔ ان سب میں سجاد ظہیر کا بڑا اور برابر کا رول ہے۔ آزادی کی تحریک میں وہ جیل بھی بھیجے گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے جیل سے اپنی بیوی اور مشہور افسانہ نگار رضیہ سجاد ظہیر کو خطوط لکھے جو بعد میں نقوشِ زنداں (۱۹۴۲) کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۴۲ میں جب کمیونسٹ پارٹی سے پابندی ہٹائی گئی تو سجاد ظہیر نے پارٹی کے لئے کھل کر کام کیا اور پارٹی کے اخبار 'قومی جنگ' اور 'نیا زمانہ' کو ترتیب دیتے رہے۔ ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۷ تک وہ انجمن کو منظّم کرنے اور ملک کی دوسری زبانوں کے ادیبوں کو جوڑتے رہے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ہندی کے بڑے بڑے ادیب ودانشور مثلاً رام بلاس شرما، راہل، یشپال، امرت لال ناگر، بھیشم ساہنی، شیودان سنگھ چوہان، نامور سنگھ، امرکانت، بھیرو پرساد گپت، مارکنڈے وغیرہ سبھی انجمن سے جڑے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر پاکستان چلے گئے اور وہاں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پاکستان کے طالب علموں، مزدوروں کے درمیان کام کیا اور تقریباً تین سال انڈر گراؤنڈ رہے۔ ۱۹۵۲ میں راولپنڈی کے ایک کیس میں پاکستان حکومت نے سجاد ظہیر کو گرفتار کر لیا اور

تقریباً چار سال تک جیل میں رکھا۔اسی تنہائی اور تخلیق کے عالم میں انھوں نے دو بڑی کتابیں لکھیں۔پہلی روشنائی جو ترقی پسند تحریک کی تاریخ ہے، جو اپنے مزاج کی بے پناہ عمدہ اور دلچسپ کتاب ہے۔جس کی اپنی ایک تاریخی حیثیت ہے جو آج بھی پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔اسی سال (۱۹۴۵) ایک اور کتاب ذکر حافظ بھی چھپی جو فارسی شاعر حافظ شیرازی پر تنقید کی حیثیت سے جانی گئی۔۱۹۵۶ء میں ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے ایک بار پھر انجمن کو منظّم کیا اور اس محاذ پر فعال ہوئے۔۱۹۵۸ء میں تاشقند میں منعقد پہلی افرو ایشین رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی اور اس تنظیم کی ہندوستانی شاخ کے سکریٹری بنائے گئے۔۱۹۵۹ء میں وہ ترقی پسند ہفتہ وار 'عوامی دور' کے مدیر اعلیٰ بنائے گئے اور سیاسی وسماجی مضامین لکھتے رہے۔بعد میں اخبار 'حیات' میں بدل گیا جو آج بھی پارٹی سے نکلتا ہے۔سجاد ظہیر ایک کامیاب اور سلجھے ہوئے صحافی تھے۔ہندوستان کی صحافت میں بحیثیت ایک بائیں بازو کے صحافی ان کا شمار پہلی صف میں کیا جائے گا۔۱۹۶۲ سے ۱۹۷۰ تک وہ مختلف کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے۔ملک کے اندر اور ملک کے باہر بھی۔اسی درمیان ان کو شاعری کا بھی شوق ہوا اور انھوں نے آزاد نظمیں کہیں۔۱۹۶۴ میں 'پگھلا نیلم' نام کا نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔لوگوں نے ان آزاد نظموں پر بڑے اعتراضات کئے تو انھوں نے یہ جواب دیا:

> ''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔اگر کوئی شاعری سے متعلق اپنے روایتی تصورات سے مجبور ہو کر ان نظموں کو نثری شعر کہتا ہے۔میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اصل اور اچھی شاعری بحر، وزن یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جاسکتی ہے اور کی بھی گئی ہے اور ان کے بغیر بھی۔''

۱۱-۱۲ ستمبر ۱۹۷۳ کو الما تا (روس) میں بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش کے ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے گئے وہیں ۱۳ دسمبر ۱۹۷۳ کو دل کا دورہ پڑا اور اسی دن وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کی موت پر دنیا میں سوگ منایا گیا۔فیض نے سجاد ظہیر کی موت پر بڑی اچھی اور پر اثر نظم کہی۔

نہ اب ہم ساتھ سیر گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن کی اشک باری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر

نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفت ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا انداز تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسند پیر مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمام دورِ جام ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جام الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

سجاد ظہیر نے ۶۸ سالہ زندگی میں قلم اور قدم دونوں حوالوں سے کام ہی کام کئے۔کہانیاں لکھیں۔ناول لکھا۔شاعری کی۔صحافت کی۔تنقید لکھی (ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مضامینِ سجاد ظہیر ان کی موت کے بعد یو۔پی اردو اکادمی نے ۱۹۷۶ میں شائع کیا۔) تحریک کی تاریخ لکھی لیکن ان سب میں سب سے بڑا کام تو انجمن کی بنیاد ڈالنا اور پھر اسے نہایت سرعت سے تحریک میں بدل دینا تھا۔یہ کوئی معمولی کام نہ تھا اس کے پیچھے فکر و نظر اور محنت و عمل کی ایسی تصویر تھی جس میں اس عہد کا پورا سماج اور تاریخ دیکھی جاسکتی ہے۔اردو کے ممتاز شاعر فارغ بخاری نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''وہ اپنی ذات میں انجمن تھے، ایک تحریک تھے، ایک مکتبۂ فکر تھے انھوں نے ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔نیا ذہن دیا۔نئی سوچ اور نئی روشنی دی اور قلمکاروں کی ایسی کھیپ پیدا کی جو نئے چراغ روشن کر رہی ہے۔جب تک یہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

جو لوگ بڑے کام کر جاتے ہیں انھیں صرف جسمانی موت آتی ہے۔وہ مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں۔

ان کے نام اور کام نہ صرف ہمیشہ زندہ رہتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے دل ودماغ میں دھڑکتے رہتے ہیں۔فیض نے کہا تھا:

”بنّے بھائی ان ہستیوں میں سے تھے جن کی موت کا ماتم نہیں زندگی کا جشن منایا جاتا ہے۔آج وہ ہم میں نہیں رہے لیکن ان کی تخلیقات زندہ رہیں گی۔ساری دنیا کے ترقی پسند عوام کے لئے سرچشمہ وجدان اور مشعلِ راہ بنی رہیں گی۔“

وہ ایک ادیب وتخلیق کار کی حیثیت سے تو زندۂ جاوید ہیں ہی، بانیٔ تحریک اور ترقی پسند فکر ونظر کے محرک کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

پاکستان کی جیل سے ایک ردّی کاغذ پر کوئلہ سے سجاد ظہیر نے اپنی رفیقۂ حیات کو خط لکھا تھا:

”تم مجھے غم کے ساتھ نہ یاد کرنا کہ میں خوشی کے لئے زندہ رہا تھا۔میرا قصور بس اتنا ہے کہ میں چاہتا تھا کہ خوشی سب کو ملے۔تم مجھے آنسوؤں کے ساتھ نہ یاد کرنا کہ میں سب کے چہروں پر مسکراہٹ چاہتا تھا۔یہی میرا سفر تھا اور یہی میری منزل اور یہی میری آخری کوشش۔“

لینن کے یہ جملے سجاد ظہیر کی شخصیت اور کارناموں پر پورے اترتے ہیں:

”انسان کی عزیز چیز ہے زندگی۔اسے اس طرح جینا چاہئے کہ مرتے وقت یہ کہہ سکے کہ میری ساری زندگی اور ساری طاقت دنیا کے سب سے بڑے مقصد انسانوں کی خوشی اور آزادی میں خرچ ہوئی۔“

☆☆☆

یہ وحیٔ دہریت روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات ومنات
(علامہ اقبال)

غالباً سب سے بڑی بات یہی ہے کہ نئے لکھنے والے جو ابھی طالب علم تھے یا باقاعدگی سے ادیبوں کی صف میں داخل نہیں ہوئے تھے ترقی پسند ادب کی تحریک اور ترقی پسند نظریہ سے متاثر ہوئے۔وہ تمام غالباً جن کے نام ہم پہلی بار ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء سے ترقی پسند ادیبوں کی حیثیت سے سنتے ہیں، اسی زمانے میں ترقی پسندی کی طرف کھنچ رہے تھے۔مثلاً احمد ندیم قاسمی، ساحر، ظہیر کاشمیری، رہبر وغیرہ اور اس ترقی پسند قافلے کا مرکز بمبئی تھا۔

سجاد ظہیر از روشنائی

شاہد نقوی (کراچی)

سجّاد ظہیر

غالباً ۱۹۵۶۔۵۷ء کا زمانہ تھا میں حسب معمول اپنے والدین ودیگر اعزّ ا واحباب سے ملنے لکھنؤ گیا ہوا تھا، وزیر منزل بھی گیا۔اس زمانے میں یوپی کی صوبائی کابینہ میں بنّے بھائی کے بڑے بھائی سید علی ظہیر صاحب وزیر عدل وانصاف تھے۔بنّے بھائی کی چونکہ شہریت کا تعین نہ ہوا تھا۔لہذا وہ خاصے پریشان سے تھے کیونکہ ہندوستان کی حکومت عملاً انہیں ”بے ملک فرد“ قرار دے رہی تھی۔بہرنوع ان کی علمی وادبی کاوشیں جاری تھیں۔پنڈت نہرو کے ذاتی اصرار پر لوئی آراگوں کی تصنیف کا ترجمہ کر رہے تھے۔

دوران ملاقات میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں دوستوں اور ساتھیوں کی جدائی کا جو قلق انہیں تھا، سو تھا مگر سب سے زیادہ رنج انہیں لائبریری کا تھا جو حکومت کی تحویل میں تھی اور بقول بنّے بھائی خود مرحوم راجہ غضنفر علی خان (جو اِن دنوں ہندوستان میں سفیر تھے) وزیر منزل میں ان سے وعدہ کر آئے تھے کہ وہ سفارتی ذرائع سے ان کی تمام کتابوں کی ہندوستان منتقلی کی ذاتی سطح پر کوششیں کریں گے۔لیکن یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی۔انہی دنوں میرے گھر پر یونیورسٹی کے پُرانے اہل قلم ساتھیوں کی ایک نشست ہوئی جس میں مہمان خصوصی بنّے بھائی تھے۔اس محفل کے شرکاء میں شارب ردولوی، ڈاکٹر پروفیسر محمود الحسن رضوی، نواب عالم، بی بی سی کے آل حسن کے بھائی پروفیسر نجم الحسن (اس وقت سب لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے)۔پروفیسر احتشام حسین مرحوم، متاعِ غالبؔ کے مصنف مرزا جعفر حسین ایڈووکیٹ اور فرحت حسین وغیرہم شامل تھے۔اس نشست میں خاص طور پر قابل ذکر اور چونکا دینے والی بات بنّے بھائی کی شاعری تھی۔ہم میں سے بیشتر انہیں نثر نگار، ناول نگار اور مترّجم کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن جب احتشام صاحب نے بنّے بھائی سے فرمائش کی کہ وہ غزل سنائیں تو ان کے اس جملے نے ہم سب ہی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔کچھ دوستوں کا اصرار تھا کہ وہ پنڈی سازش کے متعلق تاثرات پیش کریں۔جنھیں بنّے بھائی نے بہت خوب صورتی سے ٹال دیا۔ بالآخر احتشام صاحب کی فرمائش کا پاس رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔ ؎

تجھے کیا بتاؤں ہمدم، اسے پوچھ مت دوبارہ — کسی اور کا نہیں تھا، وہ قصور تھا ہمارا

غزل کیا تھی واقعات و حادثات کی ایک ایسی داستان تھی جس میں اَن کہی باتوں کو بڑے خوب صورت وسادہ انداز میں بیان کر دیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کے علم میں یہ ان کی پہلی غزل تھی جس کو سب ہی نے سراہا۔ اپنی غزل کے بعد انہوں نے فیضؔ کے اپنی پسند کے کچھ اشعار سنائے۔ بہر نوع ''لندن کی ایک رات'' جو ناول نگاری میں ایک بالکل نیا تجربہ تھی اسی طرح ''پگھلا نیلم'' جو حال ہی میں شائع ہوا۔ شاعری کی ایک نئی شاہراہ کی حیثیت سے کم نہیں ہے۔

بنّے بھائی طبعاً وعملاً دونوں اعتبار سے سوشلسٹ تھے۔ پاکستان سے جانے کے بعد انہوں نے اپنی رہائش کے لئے وزیر منزل کے کوارٹروں کا انتخاب کیا تھا۔ کوٹھی میں غالباً انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل کا دفتر تھا اور بیشتر حصّہ سرکاری اہل کاروں کے مصرف میں تھا۔ بڑے بھائی سیّد علی ظہیر صاحب جو وزیر بھی تھے۔ اوٹرم روڈ کی کشادہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ بنّے بھائی عموماً پیدل یا سائیکل رکشہ پر سفر کرتے تھے۔ شام کو حضرت گنج میں کافی ہاؤس میں یا پیدل نظر آتے تھے۔ لباس کی صفائی اور سادگی بھی اسی چیز کی غمّاز تھی۔ باوجود یہ کہ ایک متمول تعلق دار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی طرز رہائش اور بود و باش ان فرسودہ تکلفات سے بالکل عاری تھا۔ راقم کو یاد ہے کہ جب پنڈی سازش میں قید کاٹ کر وہ کوئٹہ سے لاہور آئے تھے تو ان کے پاس صرف ٹین کا ایک چھوٹا سا بکس تھا جس پر چاک سے سجّاد ظہیر لکھا ہوا تھا اور مذکورہ سفر بھی انہوں نے ریلوے کے تیسرے درجے میں کیا تھا۔

بعض لوگ عام طور پر انہیں ملحد سمجھتے تھے۔ ممکن ہے وہ ہوں۔ مگر جہاں تک مجلسی وتہذیبی زندگی کے آداب تھے، معاشرتی میلانات اور اخلاقی روائتیں تھیں وہ ان پر پوری طرح کار بند بھی تھے اور ان کا صدقِ دل سے احترام بھی کرتے تھے۔ کوئی آٹھ سال کی بات ہے لکھنؤ کے محلّہ وزیر گنج کی مشہور آتو جی کی مسجد میں جب بنّے بھائی عید کی نماز پڑھنے گئے تو کئی ثقہ قسم کے بزرگوں کو زیرلب کہتے سنا گیا کہ بنّے بھائی کو غلط طور پر لا مذہب مشہور کیا گیا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ایک اور واقعے سے ملتی ہے۔ غالباً سات یا آٹھ محرّم کی تاریخ تھی۔ قیصر باغ بارہ دری میں شہر کی ایک انجمن کی ثقافتی تقریب تھی۔ منتظمین میں مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف پیش پیش تھے۔ بنّے بھائی، رضیہ سجاد ظہیر پروفیسر احتشام وغیرہ بھی مدعوئین میں سے تھے۔ تقاریر کے بعد جب اسٹیج سکریٹری نے ایک فن کارہ کا نام لیا کہ وہ لوک ناچ پیش کریں گی تو ایک دم سے یہ حضرات اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جانے لگے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم فوراً آئے اور جانے کی وجہ پوچھی۔ بنّے بھائی نے بڑی ملائمت سے کہا کہ یہاں تک تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن آج آٹھویں محرّم ہے۔ ہم لوگ ناچ کسی قیمت پر نہیں دیکھ سکتے۔ ڈاکٹر اشرف نے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ یار تم کمیونسٹ بھی رہے اور شیعہ بھی اور ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا
۔

بنّے بھائی کے لکھنؤ واپس پہنچنے پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ شاخ کو دوبارہ زندگی مل گئی تھی یوں تو

آل احمد سرور اور احتشام حسین اس کی دل چسپیوں کو قائم کئے ہوئے تھے اور نعمت اللہ روڈ پر باقاعدگی سے ہفتہ وار نشستیں بھی ہوتی تھیں مگر سرور صاحب سے ادیبوں کا عنصر کچھ کشیدہ سا لگتا تھا۔ بنّے بھائی نے بڑی خوبصورتی سے ان اختلافات کو ختم کیا اور نوجوان حلقہ پوری تن دہی سے پھر سرگرم عمل ہو گیا۔ چونکہ بنّے بھائی خود اس انجمن کے بانیوں میں سے تھے لہذا جتنا ان پر اعتماد کیا جاتا تھا اتنا کسی اور ذات پر نہ ہو سکتا تھا۔

ظہیر کے بعد اگر کوئی دوسری مقتدر ہستی تھی تو وہ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی تھی جن کی غیر جانب داری، رواداری اور نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی قابل رشک حد تک تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد احتشام صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی مقرر ہو کر چلے گئے۔ سرور صاحب علی گڑھ چلے گئے اور بنّے بھائی نے بھی مستقل دہلی میں ہی سکونت اختیار کی۔

بنّے بھائی اپنے ہم عصروں کے علاوہ نئی نسل میں جس قدر مقبول تھے۔ وہ حیثیت کم ہی لوگوں کو میسر تھی۔ ان کے بڑے بھائی سید علی ظہیر جو وزیر و سفیر بھی رہ چکے ہیں اور کانگریس کے پُرانے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہیں بھی عوام میں وہ مرتبہ حاصل نہ تھا جو سجاد ظہیر کو حاصل تھا۔ بنّے بھائی ہر قسم کے تعصّبات سے عاری تھے۔ میں پاکستان میں نیا نیا آیا تھا۔ بنّے بھائی کوئٹہ سینٹرل جیل میں تھے۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا۔

''میرا مشاہدہ رہا ہے کہ عام طور پر یوپی سے آنے والے حضرات یہاں سے ناخوش ہیں اور انہیں شکوہ ہے کہ پنجابیوں کا اخلاق، زبان، آداب معاشرت ہم جیسی کیوں نہیں۔ یہ بڑے سطحی الزامات ہیں اور عموماً تاریخ سے عدم واقفیت کی بناء پر لگائے جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ان میں سے نہیں ہو اور یہاں آ کر مقابلتاً زیادہ خوش ہو'' ۔۔۔۔۔۔۔ ''یہ سرزمین مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، احمد ندیم قاسمی اور فیضؔ کی ہے اور اس اعتبار سے بڑی خوش قسمت ہے۔''

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں جب ہندوستانی دانش وروں کی تقریریں ہندوستانی ریڈیو سے ریلے کی گئیں تو اس میں بہت سے لوگ اپنا دامن آلودہ کر بیٹھے۔ البتہ بنّے بھائی کی تقریریں ہمیشہ دوستی مفاہمت کے جذبے سے سرشار رہیں۔ خاص طور پر جب کہ یہ مقرر پنجاب کو مورد عتاب ٹھہرا رہے تھے تو سجّاد ظہیر ہی تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کر رہے تھے۔ لکھنے کو تو دفتر کے دفتر موجود ہیں مگر چند بے ربط واقعات اس عظیم دانش ور کے حضور پیش کرنا ضروری سمجھا تھا۔ جس کے فیض سے میں نے اکتساب کیا ہے۔☆☆☆

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ ومحنت میں ہے کیسا خروش
علامہ اقبالؒ

سید محمود الحسن

ترقی پسند تنقید اور سجاد ظہیر

ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد کا سرسری طور سے تجزیہ کرنے پر اِن پہلوؤں کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی جس میں ادب کو زندگی کا ایک شعبہ قرار دیا گیا تھا اور ادبی تخلیق خالص تخیل پرستی اور عینیت پسندی سے الگ ہونے لگی، ادب میں زندگی کی طرف توجہ دینے کا رواج تیزی سے بڑھنے لگا۔ اس نقطۂ نظر میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ انفرادی زندگی سماجی ماحول کی پابند ہے اور جس طرح سماجی طاقتیں حیات کے ہر شعبہ کو متاثر کرتی ہیں ادب بھی اس کا ایک عکس ہونے کی وجہ سے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ادب کو جذبات کی مصوری مانتے ہوئے بھی اس کے قائل ہیں کہ ادیب اپنے ذاتی اور انفرادی جذبات کی نہیں، سارے ماحول کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جس میں سارے عوام کی آواز سنائی دیتی ہے، معاشرتی قوانین اور اجتماعی قدروں کا پتہ چلتا ہے اور ادب کے مقاصد ماحول کے تقاضوں کی عکاسی کرنے لگتے ہیں جس میں مادی تبدیلیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یعنی جب اس نظریہ کی روشنی میں ادب کو زندگی کی علامت مانا گیا تو اس میں ماحول اور معاشرت کے تمام تغیرات اور انقلابات اسی شکل میں پیش کئے گئے جس میں زندگی کے تمام حرکات کی عکاسی ہو سکے۔ اس طرح ایک طرف ادب میں خارجی زندگی کے مسائل پر زیادہ زور دیا گیا دوسری طرف انفرادی اور ذہنی تاثرات کو بھی مادی ذرائع کی ایک شکل قرار دیا گیا، فہم و ادراک سب کو اس کا پابند سمجھ لیا گیا۔ جب ادبی تخلیق کو خارجی اور مادی زندگی کی حرکات کا ایک شعبہ سمجھ لیا گیا تو اس طرح ترقی پسند ادب میں طبقاتی کشمکش، معاشرتی ہیجان اور انسانی زندگی کی تمام تبدیلیوں کو شامل کرنا لازمی جز بن گیا، یعنی ادب انفرادی زندگی کا ترجمان نہیں بلکہ اجتماعی شعور کا عکاس بن گیا، اس کے ذریعہ زندگی کو بہتر بنانے پر توجہ بھی کی گئی اور زندگی کی کشمکش کی ترجمانی بھی۔ مختصراً پروفیسر عبدالعلیم کے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''وہ ادب جو ہم میں تنقید کی قوت پیدا کرتا ہے، جو عقل کی روشنی میں ہمارے رسم و رواج کو جانچتا ہے، جو تنظیم اور عمل میں ہماری مدد کرتا ہے، ترقی پسند ہے۔''

ترقی پسند ادب کے ان اصولوں کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ سیاسی زندگی

کے انقلابات، طبقاتی کشمکش، تہذیبی زندگی کے امتیازی پہلو، ان تمام عناصر کو اجتماعی شعور کے نتیجہ کے لحاظ سے پیش کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ادب کو انفرادی مسائل اور کشمکش کے بجائے زندگی کی توجیہہ و تشریح کو اہمیت دینی چاہئے، واقعیت اور حقیقت کو اس لئے اہمیت دی گئی کہ تخئیل کی بے راہ روی زندگی کے مسائل کو نظر انداز نہ کردے۔

یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب کی تمام خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جائے بلکہ یہ ذہن نشیں کرانا ہے کہ شعر و ادب کے مختلف شعبوں کی طرح تنقید میں بھی اِن اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ایسے نظریات کی تشکیل ہوئی جس سے بہت سے نئے رجحانات سامنے آئے اور ادب کی اردو تنقید میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ترقی پسند تنقید کے نظریات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ ادیب و شاعر کے جذبات کسی الہامی قوت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کے سارے احساسات، تاثرات اور شعور و ادراک کی تخلیق سماج اور ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ذہنی اور شعوری عناصر اپنے گرد و پیش کے تعلق سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اسی لحاظ سے فنی دلکشی اور ذوق کا احساس بھی بدلتا جاتا ہے۔ ترقی پسند نقادوں نے ادب سے یہ کام لیا کہ اس کے ذریعہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے، سماجی زندگی کی ہر کمزوری، اس کی تلخی، گھناونے پن کی ہر بنیاد اور طبقاتی کشمکش کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے تاکہ زندگی کے ہیجان کی کیفیت کو پیش کر کے اِن میں افادیت اور اعلا مقاصد شامل کئے جائیں۔ اس طرح اس تنقید میں، ایک طرف فن کو محض داخلی کیفیات کے اظہار تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ خارجی مسائل بنیادی شکل اختیار کر گئے، دوسری طرف حقیقت پسندی اور افادیت کو زیادہ جگہ دی گئی۔ ان کے خیال میں شعر و ادب زبان کا مجموعہ ہوتا ہے اور زبان سماجی تخلیق ہے جس کے ذریعہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس لئے فن کا مطالعہ سماجی مطالعہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مشہور مارکسی نقاد کرسٹوفر کاڈویل اسی چیز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> ''فن کو عینیت کی نظر سے دیکھنے والے اسے داخلی محرکات کا عکس مانتے ہیں۔۔۔ ان کا یقین ہے کہ جمالیاتی ذوق ہی سب کچھ ہے۔۔۔ لیکن فن کی تخلیق کا مقصد محض ذوقِ جمال اور احساسات کی تشفی نہیں ہوتا بلکہ جہاں اس میں یہ عنصر شامل ہوا کہ فن کی تنقید کی جائے تو اس کا دائرہ محض اس فن پارے تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ وہ باہری دنیا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔''

چنانچہ سماجی زندگی اور خارجی مسائل پر توجہ دینے کا نتیجہ تھا کہ ان نقادوں نے انفرادی اور داخلی زندگی اور جذباتی و تاثراتی نظریات کی سخت مخالفت کی۔ ان کے خیال میں شاعر جب غم و الم کی مصوری کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی غم نہیں ہوتا بلکہ شعور و جذبہ کی ہر تحریک میں ماحول کے مسائل اثر انداز ہوتے ہیں۔

ترقی پسند تنقید کے جن اصولوں کی طرف دھیان دلایا گیا ان کو عملی طور پر پیش کرنے میں بعض نقادوں نے زیادہ شدت برتی اور بعض اسے اعتدال کے حدود کے اندر رکھ کر تجزیہ کرنے کے قائل رہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اپنے تنقیدی خیالات کے لحاظ سے ترقی پسند نقاد کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اشتراکی اصولوں سے متاثر ہو کر خیالات کا اظہار کر رہا تھا، دوسرا گروہ پارٹی کی بنیاد پر تو نہیں بلکہ عملی حیثیت سے ادب کے تجزیہ میں مارکس کے اصولوں کو اپنانے کا قائل تھا۔ البتہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ دو گروہ ایسی تنقید سے متعلق رہے جنھوں نے صالح اور صحت مند ادب کی تخلیق پر زور دیا۔ ان ترقی پسند نقادوں کا ایک سلسلہ وہ ہے جنھوں نے بنیادی طور پر ادب اور زندگی کے رشتے کو نامیاتی انداز میں تسلیم کیا اور ادب کو سماجی زندگی کا عکس قرار دیا۔ یہ زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اسی سے ملتا جُلتا ایک گروہ ان نقادوں کا بھی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے قائل ہیں کہ ادب انسان کی زندگی میں حسن ولطافت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کر سکتا ہے یا کرتا ہے اس میں انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کے وہ تمام صالح اور صحت مند پہلو شامل ہو جاتے ہیں جن سے زندگی بہتر بن جاتی ہے۔

ترقی پسند نقادوں میں جن کو خاص طور سے اہمیت حاصل ہے ان میں احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، ممتاز حسین، عبدالعلیم، علی سردار جعفری، محمد حسن، سید محمد عقیل، قمر رئیس، محمد علی صدیقی، وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان کے علاوہ بعض حیثیتوں سے سب سے اہم نام سجاد ظہیر کا ہے۔

سجاد ظہیر نے تنقید کے نظریات یا عملی تنقید پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی نہ انھوں نے تنقید نگاری پر زیادہ توجہ دی لیکن ترقی پسند تحریک کے اصولوں کی اشاعت اور اس کی بنیاد پر ادبی تخلیقات کے متعلق بعض مضامین میں جن مسائل کا اظہار کیا گیا ان کے ذریعہ ان کے خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان متفرق مضامین کے علاوہ ''روشنائی'' اور ''ذکر حافظ'' کے مطالعہ سے بھی بہت سے بنیادی تصورات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

''روشنائی'' میں اس پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ترقی پسند ادب کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ ان کے خیال میں مذہبی اور تہذیبی احیائیت کا جذبہ، اصلاحی و تعلیمی تحریکوں کے اثرات، سامراجی ملکوں اور رجعت پرست طاقتوں کا سیاسی غلبہ، ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد جب دانشوروں نے سیاسی اور عوامی جدوجہد کے ساتھ صنعتی مزدوروں کی بیداری کے لئے سوشلزم کے نظریات کو اپنایا تو ادب میں بھی نئے اثرات کی ابتدا ہوئی۔

سجاد ظہیر نے مادی حالات زندگی کو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی شمولیت کے بغیر انسانیت کی ترقی اور بہتری ممکن نہیں جو ادب کا بنیادی مقصد ہے۔ قدیم ادبی روایات کے رد و قبول کے لئے بھی انھوں نے اسی معیار کو سامنے رکھنے پر زور دیا ہے۔ وہ ان ادبی قدروں کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں جن سے زندگی کا حسن وشعور بڑھتا ہے، جن میں فکری بلندی اور شعور وفہم کو جِلا دینے کی کوشش

کی گئی ہے، جن سے انسانی ماحول کو حسین سے حسین تر اور لطیف سے لطیف تر بنانے کا پیام ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''البتہ علم وفن ہنر، آرٹ ادب اور اخلاق کے وہ خزانے جو گذشتہ دوروں میں ہمارے اسلاف نے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی کاوش سے جمع کئے ہیں وہ ہمارا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔''

ان اصولوں کے علاوہ سجاد ظہیر نے ادبی تخلیق میں نوع انسانی کی ہمدردی، فہم وشعور کی پابندی کے ساتھ ادیب کے اظہار خیال کی آزادی اور شعر وادب میں زندگی کے حقائق کی مصوری پر زور دیا جنھیں سب ہی ترقی پسند نقادوں نے اپنی عملی تنقید کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ انھوں نے ادب کو محض سیاسی پروپیگنڈہ اور اشتراکیت کے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا بلکہ اس کی صنّاعانہ خوبیوں کو بھی قائم رکھنے پر توجہ دلائی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ ''شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے، اگر وہ اپنے تمام ساز وسامان، تمام رنگ و بو تمام ترنم وموسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا، اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا، اور اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے میں قاصر ہوگا تو اچھے سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر زمین میں ہوتا ہے۔''

ان خیالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ترقی پسند تنقید میں انتہا پسندی کے بجائے ان عناصر کی اہمیت کے قائل ہیں جن سے عوام کسی ادب پارہ میں دلچسپی حاصل کر سکیں، جو ادب کے صحت مند اور مفید رجحانات کا پتہ دیتا ہے۔ مجاز کے مجموعہ آہنگ کے دیباچہ یا کیفی اعظمی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے انھیں نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔

> ''ذکر حافظ کے مطالعہ سے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ شدت پسند کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے قائل ہیں کہ ''شعر کے عقائد، اس کا فلسفہ اس کا نظریہ حیات اپنے زمانے اور اپنی قوم کے عقائد، علم اور فلسفے سے مربوط ہوتا ہے۔۔۔ضرورت اس کی ہے کہ ہم تفصیل سے اس کے کلام کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آیا اس کا تاثر منفی یا فراری ہے یا شاعر نے اپنے زمانے کے حقائق اور اس کے حسن وقبح کو اس طرح دیکھا اور سمجھا ہے جس سے ہمارے۔۔۔شعور میں اضافہ ہوتا ہے، زندگی میں ہماری دلچسپی کو بڑھاتا ہے اور ہماری روح کو جہدِ حیات میں حصہ لینے کے لئے متوازن اور مستعد کرتا ہے۔
>
> ان کے لئے شاعری کا منصب یہ ہے کہ وہ ہمارے ذہن کے ہر گوشوں میں حقیقت اور سچائی کی روشنی ڈالے، روح اور احساس کے تاروں کو چھیڑ کر انھیں اس طرح مترنم کرے کہ انسانی خصائص زیادہ اجاگر ہوں اور ہم پاکیزہ اور لطیف طور سے

محظوظ ہوں۔وہ اشاریت پسندی کے رجحان کو اس لئے غیر صحت مند سمجھتے ہیں کہ ”یہ شاعری کو محض ماورائی اور مابعد الطبیعاتی حیثیت دے کر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے دور ایک ایسی موہوم اور باطنی سطح پر لے جانے کی سعی کرتا ہے جو اس نظریئے کے ماننے والوں کے نزدیک سچائی اور حسن سے زیادہ قریب ہے۔“

یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ سجاد ظہیر نے بیسویں صدی کی مختصر سی مدت میں شعر و ادب کے لئے جو راہ متعین کی وہ آج بھی روشن و تابناک ہے اور اس کو اپنانے کے لئے شاعر، ادیب اور فنکار آج بھی فخر کرتے ہیں اور مستقبل میں اس کی عظمت قائم رہے گی۔ہم ان کی پیدائش کی صدی تو منا رہے ہیں پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے نظریات کی اشاعت کے لئے کوئی کوتاہی نہ کریں۔یہی سب سے بڑا اخراجِ عقیدت ہوگا۔

☆☆☆

”دُنیا میں ہر گروہ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود کو سچا سمجھتا ہے۔ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جب اپنی سچائی کا اعلان کرنے والا ساتھ ہی دوسروں کو جھوٹا بھی قرار دے دیتا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں ہر گروہ اپنے حق بجانب ہونے کے دلائل بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے جھوٹا ہونے کے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ایسی صورتحال میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کسے جھوٹا کہیں اور کسے سچا سمجھیں۔شاید یہ معاملہ کچھ ایسے ہی ہے کہ جب کوئی خود کو سچا کہتا ہے تو گویا اپنے خوبصورت ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی دوسروں کو بدصورت بھی قرار دیتا ہے۔اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لئے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔اگر آپ خوبصورت ہیں تو کسی کی بدصورتی کی نشاندہی کئے بغیر بھی آپ خوبصورت ہیں، لیکن اگر آپ بدصورت ہیں تو بے شک سارے جہان کی بدصورتی ثابت کر دیجئے اس سے آپ کا خوبصورت ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔چونکہ ہم اصلاً سچائی کی بات کر رہے ہیں اس لئے مختلف گروہوں اور افراد کی سچائیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔

۔۔۔آئینے کو ہمارے ہاں سچ کی بڑی علامت بنالیا گیا ہے اسی لئے ہر کوئی خود آئنہ دیکھنے کی بجائے دوسروں کو آئنہ دکھانے میں لگا ہوا ہے۔بے شک عام طور پر آئینہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی ہمیں دکھا دیتا ہے۔اس لحاظ سے آئنہ سچا بھی ہے لیکن کچھ اتنا زیادہ بھی سچا نہیں ہے۔مثلاً کبھی کوئی تحریر آئینے کو دکھایئے، اچھی بھلی اُردو کو عبرانی تحریر بنا کر دکھا دے گا اور عبرانی بھی ایسی جو عبرانی کے استادوں کے پلّے بھی نہ پڑے۔پھر ایسے آئینے بھی ہیں جو اچھی بھلی صورت کو بگاڑ کر دکھاتے ہیں۔گورے چٹے رنگ کو کالا کر کے پیش کر دیتے ہیں۔“(انشائیہ **اپنا اپنا سچ** سے اقتباس مطبوعہ کلیات حیدر قریشی **عمرِ لاحاصل کا حاصل** صفحہ نمبر ۲۳۰)

پروفیسر نذر خلیق (خان پور)

”افکار“ کے سجاد ظہیر نمبر پر ایک نظر

سجاد ظہیر ایک شخصیت کا نام ہے۔شخصیت کے اوصاف ہر آدمی میں نہیں ہوتے۔شخصیت ہمہ جہت خوبیوں کے مالک آدمی کو کہا جا سکتا ہے۔شخصیت اس آدمی کو کہتے ہیں جو نظریے کا خالق، ایک تحریک کا سرخیل اور انقلاب کا داعی ہوتا ہے یا اقبال کے اس شعر کی عملی تعبیر ہوتا ہے۔

نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پر سوز　　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

سجاد ظہیر واقعتاً بلند نگاہ کے مالک تھے۔ان کی روح میں درد تھا جو استحصال زدہ طبقے کے لیے تھا۔سجاد ظہیر وہ شخص تھا جس نے سیاست اور ادب میں نئے نظریات کا اضافہ کیا۔سجاد ظہیر پر الزامات بھی لگائے گئے، پابندِ سلاسل بھی کیا گیا، طعن و تشنیع کے تیر بھی پھینکے گئے اور دلبرداشتہ اتنا کیا گیا کہ وہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان سدھار گئے لیکن چونکہ سجاد ظہیر دُھن کے پکے تھے اور اپنے نظریے میں سچے تھے اس لیے وہ جہاں بھی رہے اپنے نظریے کی ترویج کے لیے کوشاں رہے اور جب تک زندہ رہے تب تک ترقی پسند تحریک پھلتی پھولتی رہی اور جونہی دنیا سے رخصت ہوئے ترقی پسند تحریک کے تناور درخت کو بھی گھن لگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند تحریک میں وہ قوت باقی نہ رہی جو اسے تادیر قائم رکھ سکتی۔

”افکار“ کا سجاد ظہیر نمبر اس لیے اہم نمبر ہے کہ اس کے ذریعے سجاد ظہیر کی شخصیت اور اس کے سیاسی و ادبی نظریات کی ٹھیک ٹھیک انداز سے عکاسی کی گئی ہے۔”افکار“ کا سجاد ظہیر نمبر دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس نمبر کے مدیر صہبا لکھنوی تھے جو خود بھی اپنے دور کے ایک معروف ترقی پسند تھے۔اس نمبر میں ”سجاد ظہیر کی یاد میں“ صہبا لکھنوی کا اداریہ خاصے کی چیز ہے کیونکہ اس اداریے سے نہ صرف سجاد ظہیر کی شخصیت سامنے آتی ہے بلکہ ترقی پسند تحریک کے خدوخال بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔اس اداریے میں ترقی تحریک کے بہت اہم گوشے شامل ہیں۔صہبا لکھنوی اس اداریے میں لکھتے ہیں۔

”سجاد ظہیر۔۔ہمارے نئے ادبی عہد کی ایک فعّال شخصیت تھے جنہوں نے ساری عمر ادب کے تعمیری رجحانات، نئے خیالات، نئے تصورات اور زندگی کی بسیط پہنائیوں میں ادیب کو دیانت اور اظہارِ صداقت کا حوصلہ دیا۔

انہوں نے مسائلِ حیات کوادیب سے اس طرح وابستہ کیا کہ ادب و زندگی قدم بہ قدم اور پہلو بہ پہلوسفر کرنے لگے۔انہوں نے ترقی پسند انجمن قائم کر کے برصغیر کے ادبی ماحول کو یک سر بدل دیا۔ان کا یہی کارنامہ اتنا مقصدی اورعظیم ہے کہ وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔بعض لوگوں کوان کی سیاست سے اختلاف ہے۔بعض لوگوں کوان کے ادبی کارنامے ہیچ نظر آتے ہیں لیکن یہ دونوں پہلوان کی عملی اور مقصدی زندگی کے اتنے کامیاب پہلو ہیں کہ نہ ان کی سیاسی اہمیت کم کی جاسکتی ہے نہ ان کی ادبی عظمت۔انہوں نے جس خلوص،لگن اور جذبہ ایثار سے ساری عمر جدوجہد کی اور جتنا ادبی سرمایہ چھوڑا ہے،وہ ان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے''۔(۱)

سجادظہیر نمبر میں یوں تو تمام مضامین اورتخلیقات بہت اہم ہیں لیکن اس نمبر کے مندرجہ ذیل مضامین نہایت ہی اہم ہیں کیونکہ ان مضامین کے ذریعے سجادظہیر کی شخصیت اوران کی ادبی حیثیت سامنے آتی ہے۔قدوس صہبائی کا مضمون ''ترقی پسند ادب اورسجادظہیر''مختارزمن کا مضمون ''یادوں کے چراغ''،عتیق احمد کا مضمون ''سجادظہیر کی ادبی اہمیت''،فہمیدہ ریاض کا مضمون ''سجادظہیر سے دوملاقاتیں''،فیض احمد فیض کی نظم ''جامِ الوداع''،قمر ہاشمی کی نظم ''بیمار ادب کا مسیحا''،ساغرصدیقی کی نظم ''دلِ ایشیاء''،محسن بھوپالی کی نظم ''دشنام یار''اوراحمدرئیس کی نظم ''منزل کی روشنی''۔

سجادظہیر نمبر میں ''متاعِ لوح وقلم'' کےعنوان سے سجادظہیر کی تخلیقات کے کچھ حصے بھی شامل کیے گئے ہیں جوسجادظہیر کی ادبی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ان ادبی تخلیقات سے سجادظہیر ایک شاعر، ایک ناول نگار،ایک محقق،نقاداورافسانہ نگار کےطور پر سامنے آتے ہیں۔

مختارزمن ''یادوں کے چراغ''میں لکھتے ہیں۔

''میں نے سجادظہیر کوصرف دومرتبہ دیکھا ہے۔ایک دفعہ تقسیمِ ہند سے چندروز پہلے الہ آباد میں اوردوسری اورآخری مرتبہ پارسال لندن میں۔ان کا ناولٹ اورمضامین البتہ پڑھے ہیں اوران کی ادبی وسیاسی سرگرمیوں سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہے۔بلاشبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیادرکھ کرانہوں نے ادب کونئی جہت سے آشنا کیا''۔(۲)

عتیق احمد اپنے مضمون ''سجادظہیر کی ادبی اہمیت''میں لکھتے ہیں۔

''ان سب باتوں کوسامنے رکھ کر دیکھیے تو سجادظہیر کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ سماجی اورسیاسی کاموں میں اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجودانہوں نے ادب کومحض وقت گزاری یاقلم گھسنے کا مشغلہ نہیں جانا ، بلکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی عملی زندگی کے تجربات،اپنے مطالعے،مشاہدے اورنظریاتی عقائدکودوسروں تک پہنچانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے لیکن اس ذریعے کوانہوں نے کبھی بھونڈے تبلیغی انداز میں استعمال نہیں کیا بلکہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے وہ عدیم الفرصت ہونے کے باوجودادبی کام بھی بڑی دل جمعی اوریک سوئی کے ساتھ کرتے تھے،اس لیے کہ وہ تحریر کوبھی اپنی عملی زندگی کی دوسری مصروفیات اورذمہ داری سمجھتے تھے۔سماجی اورسیاسی کاموں اورذمہ داریوں کی طرح

ادب بھی ان کی۔COMMITMENT کا ایک جزوتھا۔بحیثیت مجموعی سجادظہیر کا ادبی رول ایک رہنما کا تھا۔بالخصوص ترقی پسند تنقید میں ان کا مرتبہ اوران کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ان کی نظریاتی اورعملی تنقید دونوں ہی نے ہمارے ترقی پسند نقادوں کوراہ دکھائی ہے۔یہ راہ عقل پسندی،اعتدال پسندی اور ماضی کی صحت منداور بیمار روایات میں فرق کرنے کی راہ ہے۔یہ راہ جذباتیت پسندی،بے جاجوش وخروش کا مظاہرہ کرنے اور بےسوچےسمجھے ماضی کو بیک قلم مستردکردینے کی راہ کی بڑی شدّت سے نفی کرتی ہے۔ان معنیٰ میں سجادظہیر ہمارے ایسے ادبی راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تحریروں کی علمیت،منطق،نقطۂ نظراورطریق استدلال کی اہمیت آج بھی ویسی ہی ہے جیسا کہ اب سے بیس پچیس برس پہلے والی نسل کے لیے تھی اورآج بھی ان کی تحریروں سے ہمارے نوجوان اپنے فکر وشعور کی جلا کا کام لے سکتے ہیں۔''(۳)

فیض احمد فیض اپنی نظم ''جامِ الوداع''میں سجادظہیر سے جدائی پر یوں اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِگُل کریں گے نہ اب مِل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شامِ غمگیں نہ گل گشتِ بُتاں کی صبحِ رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری نہ غم ہائے وطن میں اشک باری
سنیں گے نغمہ زنجیر مِل کر نہ شب بھر مِل کے چھلکائیں گے ساغر(۴)

قمر ہاشمی کی نظم ''بیمار ادب کا مسیحا'' بھی خاصے کی چیز ہے۔

''انگارے'' سے ہوئی یہ حقیقت بھی آشکار توڑا حصار حرف اسی دل شکستہ نے
ذہنوں کو آگہی کا وہ زہراب دے گیا جس میں کہ تلخیوں کا،حوادث کا تھا شعور
اب وہ ہمارے لفظ وبیاں میں ہے جلوہ گر اب وہ ہماری رزمِ گہِ شعر کی سپر(۵)

ساغرصدیقی نے سجادظہیر کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

نہ جانے تیری طرح اور آج کتنے ہیں زمانے بھر میں ہلاکِ نظامِ زرداری
مگر ہے خوں سے انہی کے ظہوررنگِ شفق کہ جلوہ گر ہے ہراک سمت صبحِ بیداری
نیا سماج ، نیا آدمی، نئی دنیا یہی ہے تیری متاعِ حیات وفکرونظر
بہ ایں سلاسل و زنداں یہ ہونہیں سکتا تری ضیا سے منوّر نہ ہو جبینِ سحر
نئے جہاں کے پیمبر، نئی سحر کے رسول مرے وطن کے درخشندہ آفتاب سلام(۶)

احمدرئیس اپنی نظم ''منزل کی روشنی''میں سجادظہیر کواداس نسلوں کا ہم سفر کہہ کرخراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

تمہیں یقیں تھا/کہ تم امر ہو/سدا جیو گے/سدا سلامت رہو گے/دنیائے علم وفن میں/تمہارا پیکر/حسیں گلِ تر

ہے رجس کی خوشبو رہزار صدیوں تلک رہے گی رتمہارا سایہ راداس نسلوں کا ہم سفر ہے رملول چہروں کا چارہ گر ہے ر
تمہاری آواز رایک تحریک بن گئی ہے رتمہارے عزم وعمل کی تاریخ بن گئی ہے رتمہیں یقیں تھا رکہ تم مسیؔح وخضؔر کے
ہمزادو ہم نواہو رزمیں کے دل کی رحسیں دعا ہو! ر۔ تمہارا یہ اعتماد ہی تو رہمارے خوابوں کی دل کشی کا بنا تھا ضامن ر
ہماری منزل کی روشنی ہے!!(۷)

شعراء کے ان جذبات واحساسات سے سجاد ظہیر کی شخصیت اوران کا ادبی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سجاد ظہیر واقعی ایک بلند شخصیت تھے۔ غالبؔ نے اس طرح کی شخصیت کا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے   گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

گو یا سجاد ظہیر پختہ عزم کی مالک شخصیت تھے جنہوں نے عمر بھر اپنے نظریے سے وفا کا ثبوت دیا تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخصیت اور کوئی بھی بڑا کارنامہ ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ بالکل غالبؔ کے اس شعر کی طرح ۔اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک   اک بات ہے اعجازِ مسیحا، مرے آگے

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سجاد ظہیر ایک نظریے کا نام ہے، ایک تحریک کا نام ہے، ہے، ایک سیاسی اور انقلابی راہنما کا نام ہے جس نے ادب اور سیاست کو نئے گوشوں سے واقف کیا۔ پسے ہوئے طبقے کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا۔ وہ ایک محقق، نقاد، شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار، اور گہری نظر رکھنے والے دانشور تھے۔ انہوں نے ادب کو جس نظریے اور جس جہت سے روشناس کرایا اس سے اختلاف کرنے کا حق محفوظ ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادبی دنیا میں ارتعاش اور مسابقت کی فضا بھی انہوں نے ہی پیدا کی اور''افکار'' کا سجاد ظہیر نمبر سجاد ظہیر کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افکار (سجاد ظہیر نمبر) سجاد ظہیر کی یاد میں، ص:۳۱، ۱۹۷۳ء
۲۔ ایضاً مختار زمن (یادوں کے چراغ) ص:۷۵
۳۔ ایضاً عتیق احمد (سجاد ظہیر کی ادبی اہمیت) ص:۶۰
۴۔ ایضاً فیض احمد فیض (جام الوداعی) ص:۱۹
۵۔ ایضاً قمر ہاشمی (بیمار ادب کا مسیحا) ص:۲۹
۶۔ ایضاً ساغر صدیقی (دل ایشیا) ص:۳۹
۷۔ ایضاً احمد رئیس (منزل کی روشنی) ص:۵۹

جمال نقوی (کراچی)

سجاد ظہیر کی تخلیقی جہات

برصغیر ہندو پاک میں ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالار اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والے کاروان ادب کے میر کارواں سید سجاد ظہیر عرف بنے بھائی کی دھنک رنگ شخصیت کی رونمائی ادب میں افسانوی مجموعے، انگارے سے ہوتی ہے جس نے اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کیا، روایات کو توڑا اور سماج کے گھناؤنے چہرے پر پڑی نقاب کو جلا کر راکھ دیا۔ جن چہروں سے پردہ ہٹایا گیا انہیں تکلیف ہوئی، اس لیے ہنگامہ برپا ہوا۔ آخر کار یہ طوفان تھما اور ادیبوں کو روشن خیالی اور خرد افروزی کی نئی راہ نظر آئی۔

بنے بھائی نے ۱۹۳۵ء میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پیرس میں ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں سے واپس آ کر لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ بیرسٹری کی تعلیم کے اختتام پر وہ پھر پیرس گئے جہاں انہوں نے اپنے ناول لندن کی ایک رات کو مکمل کیا۔ یوں انہوں نے ترقی پسند فکشن کے نمونے پیش کیے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد انہوں نے برصغیر کے ادیبوں کو اپنا ہمنوا بنایا۔ الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور اس کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۱راپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں عظیم فکشن نگار پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ادب کے اس کار عظیم میں انہوں نے اکیلے ہی قدم اٹھایا تھا مگر:

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس کارواں میں بزرگوں میں مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، پریم چند، نیاز فتح پوری، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر عابد حسین، رابندر ناتھ ٹیگور، جوش ملیح آبادی اور نوجوانوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، فراق گورکھپوری، احمد علی، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر عبد العلیم، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز سبط حسن، اختر الایمان، حیات اللہ انصاری، وامق جونپوری اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل تھے۔ اس طرح ترقی پسندی کا سورج ادبی افق پر چمکنے لگا۔

اپنی سیاسی اور تنظیمی مصروفیات سے انہیں جب بھی موقع ملا، اور یہ موقع زیادہ تر قید تنہائی میں نصیب ہوا، انہوں نے ترقی پسندی کی جانب ادیبوں کی رہنمائی کرنے کے لیے ادب کی مختلف اصناف میں چراغ راہ

روشن کیے۔ جن میں صنف افسانہ میں 'انگارے' فکشن میں 'لندن کی ایک رات' ڈرامہ میں 'بیمار' تنقید میں 'ذکر حافظ' رپورتاژ میں 'روشنائی' خطوط میں 'نقوش زنداں' جدید شاعری میں 'پگھلا نیلم' اور درجنوں مقالات، صدارتی خطبے اور اخبار قومی جنگ کے اداریے شامل ہیں۔

'نیا دور' کراچی کے شمارہ ۱۴، ۱۵ میں شامل راہل سانکر یتائن کے مضمون 'سجاد ظہیر۔ نئے نیتا' سے پتہ چلتا ہے کہ سجاد ظہیر نے اپنے ابتدائی افسانے ۲۶/۱۹۲۵ء میں لکھے تھے جو ان ہی برسوں کے مجلّہ 'زمانہ' کان پور میں شائع بھی ہوئے تھے لیکن لندن اور پیرس جانے کے بعد ترقی پسند فکر کے زیر اثر ان کی مقصدی تحریروں نے ادیبوں کو ایک نئی فکر اور جدید سوچ عطا کی۔ اور مغربی افسانوں میں استعمال ہونے والی جدید تکنیک stream of consciousness کے استعمال کو پہلی بار اردو ادب میں بڑی جرات مندی سے پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے اردو افسانے کو اسلوب اور فن کارانہ رویے کی نئی راہ دکھائی۔ انگارے کے افسانوں کے بعد ان کی مختصر افسانہ نگاری کی ایک اہم تحریر ان کا ایک one act play 'بیمار' بھی ملتا ہے۔ اس طرح ڈرامہ نویسی میں بھی انہوں نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک چراغ راہ روشن کر دیا۔

'لندن کی ایک رات' سجاد ظہیر کا وہ اہم اور منفرد ناول ہے جس میں پہلی بار stream of consciousness یعنی شعور کی رو، کی تکنیک کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں خود کلامی کے ذریعہ ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کا اظہار و ابلاغ ہوتا ہے اور کہانی کرداروں کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کشمکش کے گرد شعوری بہاؤ کے ذریعہ آگے بڑھتی جاتی ہے اور ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل سے آگاہی دیتی جاتی ہے۔ سجاد ظہیر کے اس ناول کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین تحریر کرتے ہیں:

''نئے انداز کا پہلا ناول 'لندن کی ایک رات' جس میں سجاد ظہیر نے یورپ کے کئی اسالیب کا تجربہ کیا ہے مگر اس کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کی تصنیف میں یورپ سے فیضان ملا ہے۔ بلکہ یہ پہلا ناول تھا جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کے تصورات اور خواہشات کو یہاں کے سیاسی پس منظر میں دکھایا گیا۔''

سجاد ظہیر ۱۹۳۶ء سے مسلسل مضامین لکھتے رہے جو نیا ادب، ادب لطیف، شاہراہ، نقوش، عالمگیر، عوامی دور اور حیات وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں بھی کیا ہے:

''میں نے سبط حسن سے وعدہ کیا تھا کہ میں نیا ادب' کے لیے باقاعدگی سے مضامین لکھ کر حتی الامکان 'نیا ادب' کی مدد کرتا رہوں گا۔ ادبی مضامین کی اشاعت پر زیادہ روک ٹوک بھی نہیں تھی اس لیے میرے لیے ایسا کرنا ممکن تھا چنانچہ میں نے جیل ہی میں 'یادیں' کے عنوان سے مضمون لکھ کر سبط حسن کو نیا ادب کی اشاعت کے لیے بھیجا

دیا۔ مرزا جعفر علی خاں نے ترقی پسند ادب کی تحریک پر جو اعتراضات کیے تھے اس کا جواب بھی لکھا تھا۔ جو سراج مبین کے نام سے نیا ادب میں شائع ہوا تھا۔ ہندی کے ترقی پسند شعراء سمترا نندن پنت پر شیو دان سنہ چوہان کے مضمون سے اخذ اقتباس کر کے اور ہندی سے کچھ ترجمے بھی لیے جو نیا ادب میں شائع ہوئے۔''

ان کے مضامین کا ایک انتخاب یوپی اردو اکادمی نے ۱۹۷۶ء میں 'مضامین سجاد ظہیر' کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے ان مضامین میں اپنے نظریات اور خیالات بہتر انداز میں پیش کیے ہیں۔ ان کے ادبی مضامین میں مارکسی نظریہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ بعض مضامین انہوں نے ترقی پسند نقطہ نظر کے وضاحت یا ادیبوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کے سلسلے میں تحریر کیے ہیں۔ ان کے مضامین کے علاوہ وہ مختلف سیمینار اور کانفرنسوں میں پڑھے گئے ان کے خطبات، رپورٹیں، اور مقالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بمبئ میں منعقدہ چوتھی کانفرنس میں ان کے خطبہ صدارت، جو بعد میں ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور میں بھی شائع ہوا، سے ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام تر اچھا ادب ترقی پسند ادب ہی ہے اور اسی طرح ہر ایک دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ چونکہ اردو میں جدید ترقی پسندی کی ابتداء محمد حسین آزاد، حالی، اکبر، اقبال، ظفر علی خاں وغیرہ اور نثر میں سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی اور ابوالکلام آزاد کی، اور افسانہ نویسی میں منشی پریم چند نے کی''۔

سجاد ظہیر نے اپنے مضامین میں اپنا رویہ معتدل، متوازن اور ہمدردانہ رکھا ہے اس سے ان کے تنقیدی رویے کا پتہ چلتا ہے کہ:

☆ ادب اور زندگی میں پائیدار ہم آہنگی ہونی چاہیے۔
☆ ادب کا مقصد سماجی ہونا چاہیے اور انقلاب کی جدوجہد میں ادیب و شاعر کو عملاً حصہ لینا چاہیے۔
☆ شاعر واعظ نہیں ہوتا۔ اسے اپنی شاعری میں وعظ کہنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔
☆ ادب کی تمام قدیم روایات کا احترام کرنا لازمی ہے۔

عملی تنقید کے نمونے کے طور پر سجاد ظہیر کی اہم کتاب 'ذکر حافظ' ہے جسے انہوں نے جولائی ۱۹۵۴ء میں مچھ جیل (پاکستان) کے ایام اسیری میں مکمل کیا۔ فارسی شاعر خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ سجاد ظہیر نے بڑی عرق ریزی سے تحریر کیا ہے اور ان کی شاعری پر عیش پسندی، زندگی سے فرار، ترک علم کی ترغیب اور مشائخ پر طنز و استہزا جیسے الزامات کا مدلل جواب دیا ہے جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ دنیادار علماء کے بارے میں حافظ کے اس شعر کو انہوں نے بار بار پیش کیا ہے:

ریا حلال شمارند و جام و بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

حافظ کے کلام پر سجاد ظہیر کی مارکسی تنقید سے متاثر ہوکر پروفیسر عتیق احمد نے اپنی تحریر ’سجاد ظہیر۔تخلیقی اور تنقیدی جہات‘ میں یوں تحریر کیا ہے:

’’یہ حقیقت بھی لائق اعتراف ہے کہ سجاد ظہیر جیسے معتبر (کمیٹڈ) مارکسی نقاد نے جس بصیرت، انصاف پسندی اور نقادانہ شعور کے ساتھ بڑی محنت سے حافظ شیرازی کے شعری اثاثے کو کھنگال کران کی ذہنی اور شاعرانہ پہنچ کے گرد صدیوں سے پھیلے ہوئے خس وخاشاک کے انبار سے نکال کر اردو ادب کے قارئین سے روشناس کرایا ہے وہ بھی اپنی جگہ اردو تنقید کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔‘‘

مچھ جیل (بلوچستان) میں جنوری ۱۹۵۴ء میں مکمل ہونے والی ان کی دوسری اہم دستاویز روشنائی ہے جو ذکر حافظ سے پہلے تحریر کی گئی ہے لیکن اشاعت کے اعتبار سے اسے فوقیت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ذکر حافظ کو انجمن ترقی اردو، لاہور نے نومبر ۱۹۵۶ء میں اور آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی وسکریٹری نے ترقی پسند ادب کی تاریخ ۱۶ ابواب میں پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں قلمبند کردی ہے۔جس سے اس تحریک کی ابتدائی منزلوں سے آشنائی اور نئے ادیبوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

سجاد ظہیر ایک پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ادب، سیاست، صحافت، اور مارکسی اشتراکیت ان کی شخصیت کے اہم پہلو ہیں۔وہ ایک بلند آہنگ، شخصیت، بیدار ذہن اور پختہ شعور کے مالک تھے۔فارغ بخاری ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

’’وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک تحریک تھے اور ایک مکتبہ فکر تھے۔انہوں نے اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا، نئی سوچ اور نئی روشنی دی اور قلم کاروں کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی جو نئے چراغ روشن کر رہی ہے۔جب تک چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے ان کا نام زندہ پائندہ رہے گا‘‘۔

ادب کی مختلف اصناف میں تخلیقی چراغ روشن کرنے کے بعد انہوں نے شاعری کی طرف توجہ دی۔ایام اسیری میں وہ شعری تخلیقات جیل میں منعقدہ ہونے والی نشستوں میں سنایا کرتے۔سینٹرل جیل حیدرآباد سندھ میں انہوں نے اپنے شعر میں جس طرف اشارہ کیا تھا:

وہ قتیل رقص و رم تھی، وہ شہید زیر و بم تھی

مری موج مضطرب کو نہ ملا مگر کنارا

اسی بات کو پروفیسر عقیل رضوی یوں لکھتے ہیں:

’’سیاست کی عملی زندگی نے سجاد ظہیر کی تخلیقی صلاحیتوں کو وہ موقع نہ دیا جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ اگر انہوں نے اپنا میدان عمل صرف تخلیقات تک محدود رکھا ہوتا تو اردو ادب کو ایک عظیم فن کار ان معنوں میں بھی ملتا کہ اور نہ معلوم کتنی تخلیقات اور حسرت تخلیق ان کے ذہن میں دفن رہ گئیں۔ان کے خطوط ’نقوش زنداں‘ کا مطالعہ کیجئے تو کتنی کتابوں کے خاکے اور تصنیفی خواہشات ملتی ہیں۔‘‘

سجاد ظہیر نے ایک حلقے کی مخالفت کے باوجود آخری دنوں میں نثری نظموں میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی اور ایک مجموعہ ’پگھلا نیلم‘ تخلیق کر کے شائع کردیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب میں نئے تجربوں کی قدر کرتے تھے اور خود بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔اس شعری مجموعے میں کل ۳۴ نظمیں ہیں جن میں سے زیادہ تر نظمیں سیاسی اور سماجی موضوعات پر ہیں۔اپنی اس شعری تخلیق کے بارے میں ان کی رائے دیکھئے جس کا اظہار انہوں نے ’پگھلا نیلم‘ میں کیا ہے:

’’یہ آہنگ اور ترنم ان معانی اور اس مکمل فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ ہے جو میرا مدعا ہے۔یقیناً آپ کو اس میں اجنبیت محسوس ہوگی اس لیے کہ یہ روایتی نہیں ہے۔
لیکن چوں کہ یہ آہنگ نیا ہے اس لیے میری نظر میں یہ کسی قدر زیادہ دلفریب بھی ہے۔
میں امید کرتا ہوں کہ میں یہاں پر جو کچھ پیش کر رہا ہوں آپ اس سے لطف اندوز ہوں گے‘‘۔

آخر میں اس مضمون کو میں ان کی ایک نظم ’کالا پھول‘ کی اختتامی لائنوں پر ختم کروں گا جس سے ان کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے جو ان کی جدوجہد حیات کا حاصل تھی یعنی سماجی امن ومسرت۔دیکھے وہ پرامید تھے:

کہ اس اچھی دھرتی میں/ایک ہی نہیں/ہزاروں، لاکھوں، لاتعداد/پھولوں کے نگینے پوشیدہ ہیں/
وہ سب نکلیں گے/اور اس سندگی مٹی کو ہی نہیں/سارے ایشیا کو رنگ و بو/اور سب کے دلوں کو/
امن ومسرت سے بھر دیں گے!

☆☆☆

سپاہِ شب نے تو اندھیر کردیا تھا بہت — سو آ گیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے
یہ عید آئی ہے کس قتل گاہ میں حیدرؔ — سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے

ڈاکٹر صالحہ زریں

لندن کی ایک رات 'ایک جائزہ'

منشی پریم چند کے ناول ''گئودان'' کے بعد سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول سے اردو میں جدید ناول نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ 'لندن کی ایک رات' میں صرف ایک رات کا ذکر ملتا ہے۔ اس ایک رات میں سارے کردار مکمل طریقے سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قاری صرف اُن کی نفسیات سے ہی واقف نہیں ہوتا بلکہ پورے ماضی سے واقف ہو جاتا ہے اور حال سے روشنی حاصل کر لیتا ہے۔ نعیم اور شیلا گرین کی ملاقات اور اُس کی گفتگو سے متاثر ہو کر خیالات کی رو میں بہہ نکلتا ہے۔ اور شعور کے پردے پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ وہ شیلا سے محبت کرتا ہے۔ اُس سے زندگی، ادب، سائنس، فلسفہ، شعریات سیاسیات غرض سبھی موضوعات پر دلچسپ گفتگو کرتا ہے۔ یہ گفتگو پڑھے لکھے اور سوچے سمجھے انداز کی ہوتی ہے۔

یوں تو کچھ ہندوستانی طلباء لندن تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے ہر طبقے کے نوجوان، ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ جن میں ہندو، مسلمان، بنگالی جین، پارسی وغیرہ شامل تھے۔ لندن جانے سے قبل وہ سوچتے تھے کہ وہاں پر خوب عیش وعشرت اور سیر و تفریح ہوگی۔ اور تقریباً سبھی لوگوں کا تعلق امیر طبقے سے ہوگا۔ لیکن اصلاً ایسا کچھ نہیں تھا۔ انہیں وہاں کے لوگوں میں بھی عمل و حرکت نظر آئی۔

یہ سارے نوجوان لندن کی چہل پہل چمک، دمک، رنگینیوں میں کھو جانے کے باوجود بھی ہندوستان کی تحریکوں میں شریک اور کروڑوں مزدوروں کسانوں عام انسانوں کے ساتھ ساتھ سانس لیتے ہیں۔ اور ان کی دل کی دھڑکن اور حرارت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ سبھی نوجوان الگ الگ نوکری اور پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی ساہوکار کے گھر سے تو کوئی دولت مند طبقے سے، کوئی وکیل، ڈاکٹر، انجینئیر وغیرہ۔ ان سبھوں کی نسل و قوم بھی مختلف ہے۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ مختلف طبقہ اور مختلف نسل، مختلف مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی وہ سبھی ایک ذہن ہو کر ہندوستان کے مسئلے پر ایک ہی طرح کی فکر رکھتے ہیں کہ ہندوستان کس طرح غلامی سے چھٹکارا پائے اور آزادی حاصل کرے۔

سجاد ظہیر اپنے اس ناول میں داخلی خود کلامی کے ذریعہ کرداروں کو نمایاں کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اعظم پوری طرح جین کی محبت میں گرفتار ہے اُسے کسی طرح کی فکر نہیں کہ وطن میں کیا ہو رہا ہے لیکن راؤ کے مل جانے سے وہ سیاست اور ملک کی طرف مائل نظر آنے لگتا ہے۔ وہ ہندوستان کے حالات کے بارے میں راؤ سے سیاسی گفتگو کرتا ہے۔

> ''وطن کی بھلائی کے لئے سب کوشاں ہیں۔ چرکھا کاتنے میں وطن کی بھلائی، مہاتما گاندھی کی سچ کی کھوج، اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی، سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی، ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ میں وطن کی بھلائی ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے----- ہر شخص پکار کر یہ کہتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لئے کام کر رہا ہے۔ حد ہو گئی دیکھا دیکھی انگریز گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ ہندوستان کی بھلائی ہے، اور ملک کی حالت کیا ہے۔ ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ دوسری طرح ظلم و جبر کا جال چاروں طرف ہم کو جکڑ رہا ہے۔''

اعظم ہندوستان کی بدترین صورتِ حال، نا قابلِ اعتنا سیاسی حالات، منتشر فضا پر گہرا طنز کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ انگریز حکمراں اور سامراج کو بھی نہیں بخشتا۔ سجاد ظہیر لندن میں موجود ہندوستانی نوجوانوں کے نفسیاتی اور ذہنی فکر کو ہی نہیں بلکہ وہ اُن کے ذریعہ ہندوستان کے نوجوان کی ذہنی کشمکش، اُن کے سوچنے کے انداز اور مختلف رجحانات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی آپس کی بحثوں سے ہندوستان کے مسائل بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

اُس وقت کا ہندوستان جن بدترین اور دشوار ترین انتشار کے حالات سے گزر رہا تھا۔ اور جو خیالات نوجوانوں کے دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے ناول میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں کہ کس طرح نوجوانوں کا ذہن انقلابی رجحان اور تشدّد کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ اور اشتراکی خیالات کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ اعظم اور راؤ ایک پب میں جاتے ہیں تو وہاں جم اور ٹام انگریز ہندوستان کی سیاست کو موضوع بحث بناتے ہوئے نظر آتے ہیں-- اس ناول کے ذریعہ سیاسی تبدیلی کی خواہش کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فلپ ہنڈرسن نے کہا ہے---

''اپنے المناک اور باغیانہ عہد میں جہاں سیاست، اخلاقیات اور مذہب پر چھا گئی ہے۔ ہم اپنے ناول نگاروں سے سوائے اس کے کوئی اور توقع نہیں کر سکتے کہ وہ سیاسی تبدیلی کو اپنا مطمع نظر بنائیں''

سجاد ظہیر اس ناول میں مختلف اور متضاد، رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کو پیش کرتے ہیں۔ راؤ قانون کی ڈگری لینے کے لئے لندن آتا ہے اور سیاست میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اپنے وطن ہندوستان سے اُسے گہرا لگاؤ ہے۔ انگریز حکومت کا غلام ہے، غلامی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ اس نفرت کا اظہار اپنی بحث میں بڑے

جوش وخروش سے کرتا ہے اور ہندوستانیوں کو کمزور، ذلیل اور بزدل خیال کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ راؤ کی نفسیاتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ راؤ اشتراکی رجحان تو رکھتا ہے لیکن وہ بنیادی طور پر تشکیک پسند ہے۔ لڑکیوں سے بہت جلد اس کی دوستی ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ اس کی نظر میں زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

راؤ بیسویں صدی کو جو گذشتہ جنگ میں ہونے والے، جنگ کے اثر سے اور جدید سائنسی نظریات کی وجہ سے انسانی عظمت کو ذلیل ترین شئے تصور کرتا ہے۔ کیوں کہ آئندہ زندگی میں وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کیا ہوگا۔ لیکن ان سب کے باوجود دوسری عالمی جنگ اور انقلاب نے بین الاقوامی سطح پر جو سیاسی اور سماجی اثرات مرتب کئے تھے۔ ان سے براہ راست ہندوستان متاثر تھا۔ راؤ، اعظم سے بات کرتے کرتے درمیان میں ہندوستان کے حالات اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ وہاں کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔۔

''راؤ کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آتی ہے جس میں زیادہ تر غریب میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ تھے جن کے چہروں پر دھوپ، ہوا، اور بھوک کے اثر سے جھرّیاں اور گڈھے پڑے ہوئے تھے۔ جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی جنکے کندھے جھکے ہوئے تھے جن کی ٹانگیں اُن کی میلی دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوئیں تھیں گورے بندوقیں لئے ہوئے سامنے کھڑے ہیں، مشین گنیں ہیں۔ سنگین دھوپ میں چمک رہی ہے سپاہیوں کے پیچھے گھوڑوں پر سوار انگریزی افسر، تیز دھوپ گرمی چہروں پر پسینے کے قطرے نمایاں ہیں--- آخر ہم لوگ آگے کیوں نہیں بڑھتے اتنی دور تک آئے اب رُکے ہوئے ہیں۔ ''آگے بڑھو'
''آگے بڑھو' کی آواز یکبارگی اُس کے کانوں میں آئی اور سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''

ایک طرف تو راؤ کے ذہن میں ہندوستان کے ستم رسیدہ لوگوں کے مرجھائے ہوئے اور مایوس چہرے غربت زدہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اُن پر ظلم کرنے والے انگریز حاکم ظالموں کی تصویریں گھوڑوں اور بندوقوں کی شکل میں پیش ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی انگریز اُن سے مقابلہ کر کے انہیں شکست دے کر آزادی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ پب میں انگریز جم اور ٹام ہندوستان میں پیدا کئے گئے ہندو مسلم تفرقہ اور وہاں کے کمزور لوگوں کے بارے میں طنز کرتے ہیں اور اخبار کے ذریعہ ہندوستان کے بگڑے ہوئے حالات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جم اور ٹام کی باتوں کو سن کر اعظم اور راؤ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہونے لگتا ہے۔

راؤ کے بالکل برعکس احسان ہے۔ جو پکّا اشتراکی ہے۔ احسان پنجاب کا رہنے والا۔ اس کی فکر انقلابی ہے لیکن سوچ اشتراکی ہے۔ اسے انگریز سامراج سے نفرت، غلامی سے عداوت، برائی سے چڑھ ہے۔

چاہے وہ ہندوستان کی ہو یا مغرب کی، وہ اندھی تقلید کے خلاف ہے۔ چاہتا ہے کہ جو ہندوستانی نوجوان تعلیم کی غرض سے یہاں آئے ہیں وہ یہاں کی رنگینیوں میں گم نہ ہوجائیں۔ بلکہ اپنی حیثیت کو پہچانیں اور ہندوستان کی پستی اور زوال پر نظر ڈالیں۔ ذاتی مفاد کو دور کر کے اصل مقصد کو ذہن میں رکھیں اور بڑی بڑی تحریکوں میں حصہ لیں۔ اپنی دور بین نگاہوں سے احسان ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھتا ہے، انگریز سامراج کے خلاف ہے اور کہتا ہے کہ سرمایہ داری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔

''تم رئیس، بنئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینیر، سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں کا اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک نہ رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے پس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے گا''

احسان کے خیال سے اتفاق رکھنے والا اُس کا دوست عارف بھی ہے جو آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اس کی زندگی کا مقصد تو امتحان کی تیاری کرنا اور کامیابی حاصل کرنا اور اس کی عقل بھی سرکاری ہے۔ اپنی زندگی کا ہر لمحہ وہ مقصد کے پیچھے لگا دینا چاہتا ہے اعظم کی طرح یہ بھی کسی لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے آخر کار دونوں کو اس کام میں ناکامیابی ہوتی ہے۔

یہ تمام نوجوان اپنے اپنے خیالات کا اظہار ہی نہیں بلکہ اُس دور کے ہندوستانی نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُن کے ذہنوں میں بیسویں صدی کا جدید ذہن کام کر رہا ہے جو کچھ تاریک ہے اور کچھ روشن بھی۔ پرانی قدروں کے چھن جانے پر جدید قدروں کی طرف سرگرداں نظر آتے ہیں۔ راؤ، عارف اور احسان سے کہتا ہے کہ تم اپنے ذاتی مفاد کو چھوڑ کر ملک اور دنیا کے مسائل کو سمجھو اور بڑی بڑی تحریکوں میں حصّہ لو۔ سچائی کے بوجھ کو برداشت کرنے کی قوت اپنے میں پیدا کرو۔ احسان کے جواب میں زیادہ سختی نظر آتی ہے۔ سرمایہ دار جن کا مقصد صرف روپیہ جمع کرنا ہے، عورت کے جسم کی خرید فروخت میں اپنا ذاتی ذہن بیچ دیتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں۔ جن کا استعمال یہ صحیح ڈھنگ سے نہیں کرتے۔ وہ روس کی اشتراکیت سے جلدی واقف نہیں ہوسکتے اور ان کا وجود نسلِ انسانی کی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ یہ تبدیلی اور سمجھ یکبارگی نہیں پیدا ہوسکتی۔ بلکہ آہستہ آہستہ ان کے دماغ اور جسمانی مشقت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس ناول کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ -----

''نئے انداز کا پہلا ناول ''لندن کی ایک رات'' جس میں سجاد ظہیر نے یورپ کی کئی ایک اسالیب کا تجزیہ کیا ہے۔ مگر اس کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ اس کی تصنیف میں یورپ سے فیضان ملا ہے۔ بلکہ یہ پہلا ناول تھا، جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کے تصورات اور خواہشات کی یہاں کے سیاسی پس منظر میں دیکھا گیا ہے''

ایک اور کردار ہیرن پاؔل جو بنگالی نوجوان ہے اور شیلؔا سے محبت کرتا ہے۔ یہ انقلابی فکر رکھنے والا نوجوان ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں ایک سال کی چھٹیاں گزارنے جاتا ہے۔ جہاں اُس کی ملاقات شیلؔا سے ہوجاتی ہے وہ دونوں پیار و محبت کی باتوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہندوستان کے کروڑوں غلام، محکوم عوام کو ذلّت، جہالت اور تاریکی کے گڈھے سے باہر نکالنے کا مقصد ہے۔ ہیرن پاؔل، شیلؔا سے گفتگو کے درمیان سیاسی اور سماجی مسائل، مادّیت اور روحانیت غرض کہ ہندوستان کے تمام موضوعات پر باتیں کرتا ہے۔

’’جو قوم غلام ہو جس میں ۸۰ فی صد انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا ہو جس میں مرض، وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے تندرست انسان نظر آتے ہوں۔ جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو جہاں بچے تک کمھلائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں۔ جہاں اکثر لوگوں کے چہروں پر بھوک، فاقہ، غربت، مصیبت لکھی ہو اور باقیوں کے چہروں سے، حماقت، جہالت اور ایک کلر وقسم کی خوشحالی نظر آتی ہو، وہاں زندگی کے ان رنگین تحفوں کی تلاش کرنا سراسر حماقت ہے۔‘‘

ہیرنؔ کا جسم تو سوئٹزر لینڈ میں ہے لیکن اس کی روح، ذہن، دل و دماغ ہندوستان کے زوال، پستی غلامی اور محکومی سے پیدا شدہ سماج مسائل و مشکلات سے الجھا ہوا ہے وہ اُسے سلجھانا چاہتا ہے اور اپنے مستحکم ارادوں سے ان برائیوں اور مسائل کے خلاف جہاد کرنے کا پختہ و مصمم ارادہ رکھتا ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر ممتاز حسینؔ صاحب کا خیال ہے کہ۔۔’’اس نے ہمارے ادبی فکر و شعور کا دھارا غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف موڑنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے‘‘

سجاد ظہیرؔ کا یہ مختصر سا ناول چند ہندوستانی طلباء کی جذباتی اور نفسیاتی زندگی کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کو پورے انہماک کے ساتھ اُس دور کے ماضی کی تاریک اور حال و مستقبل کو منعکس کرتا ہے اس ناول کے ذریعہ اُس وقت کے ہندوستانی زندگی کے مختلف رجحانات اور نفسیاتی حالات و کیفیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اُن حالات کو سازگار بنانے اور تبدیلی پیدا کرنے کی کشمکش اس ناول میں نظر آتی ہے۔۔

سجاد ظہیرؔ کا یہ ناول اگرچہ مختصر اور پتلا سا ناول ہے لیکن اپنی معنویت ہئیت اور فکر و فن کے حوالے سے اردو ناول کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تکنیک اور طرز ادائیگی میں اپنی مثال آپ تو ہے ہی، نیز نئی حقیقت نگاری اور گہرے سماجی و سیاسی اور طبقاتی شعور کی کچھ ایسی معرفت پیش کرتا ہے کہ اس ناول کے ذریعہ اردو ناول کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

☆☆☆

ممتاز انور

’لندن کی ایک رات‘ میں دن کا تصور

پوری اردو شاعری میں عام طور پر اور ترقی پسند شاعری میں خاص طور پر رات اور دن کا استعمال علامت کے طور پر خوب کیا گیا ہے۔ رات، غلامی پستی ظلم وستم اور بدحالی کی علامت اور دن آزادی، امن، چین، خوشحالی وغیرہ کی علامت۔ دن اور رات، علم اور جہالت، اندھیرا اور اجالا، صبح اور شام، تاریکی اور روشنی وغیرہ کا جن حالات کے پیش نظر جہاں کہیں بھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے ان حالات تک ہمارے ذہن کو پہنچنے میں کسی طرف کی دشواری پیش نہیں آتی۔ لندن کی ایک رات کے شروع میں ہی اگر دیکھا جائے تو اندھیرا اور روشنی کا بطور علامت بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔

’اندھیرے اور روشنی میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ لڑائی ہو رہی ہو‘۔ اب اگر آپ ۱۹۳۶ء کے ہندوستان اور پوری دنیا کے حالات پر نگاہ ڈالیں تو اس اندھیرے اور روشنی کے بیچ محسوس کی جانے والی لڑائی کا اندازہ خود بہ خود ہو جائیگا۔ شائد یہ ہی وجہ ہے کہ یہ ناولٹ محض کسی ایک رات کی پارٹی کا قصہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس میں رات کی تاریکی میں روشن خیال زندگی کا ایک اہم اور لمبا سفر طے کیا گیا ہے جو شام سے شروع ہوتا ہے اور صبح کی پھیکی روشنی پر آکر رکتا ہے۔

’’آسمان کے ایک کونے کی تاریکی سے پردوں کو پھاڑ کر روشنی جھانک رہی تھی۔۔۔۔
صبح کی پھیکی روشنی چور کی طرح کھڑکی کے راستے سے دبے قدم اندر آنے لگی۔‘‘

لندن کی ایک رات کا مصنف چونکہ ہندوستانی ہے لہٰذا لندن میں رہتے ہوئے اس نے ہندوستان کی تاریکی کا سفر طے کیا۔ تاریکی کا یہ سفر اس نے یورپ میں چلنے والی انقلابی ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناولٹ کافی جوشیلا اور دلچسپ ثابت ہوا ہے۔ اب اگر اس ناولٹ کے لکھے جانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کامیاب کانفرنس ہو رہی ہے اور ملک کی تحریک آزادی دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عوام انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارہ پانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ایک نئے جوش اور منظّم فکر کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لینا اپنا

فرض سمجھا۔ترقی پسند تحریک کیسے اور کیوں وجود میں آئی یہ جاننے کے لئے ایسا لگتا ہے کہ صرف روشنائی کا مطالعہ کافی نہیں۔ بلکہ یہ جاننے کے لئے ہمیں روشنائی کے ساتھ ساتھ لندن کی ایک رات کا بھی بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔

ناولٹ کی شروعات بڑی عمدہ منظر کشی کے ساتھ ہوتی ہے۔لندن ایک نہایت گھنے زردی مائل گاڑھے تاریک کہرے سے ڈھکا ہے۔دن کا تیسرا پہر بھیانک رات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اوس کی مہین مہین بوندیں ہر چیز پر جمی ہوئی ہیں۔اس اندھیری اور تکلیف دہ سردی میں زندگی کس طرح رواں دواں رہتی ہے، ناولٹ کی یہ منظر کشی قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔حالات کیسے بھی ہوں وقت کبھی نہیں رکتا۔جولوگ وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں انکی زندگی بھی وقت کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔برے حالات میں بھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ جملے دیکھئے:

''اس کیفیت کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہ تھی۔دوکانیں روشن اور سڑکیں موٹروں لاریوں اور بسوں سے بھری ہوتی ہیں۔کنارے کی پٹڑی جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں۔دفتروں سے نکلے ہوئے لوگ، منشی، محرر، کاروباری، ٹائپ کرنے والی لڑکیاں، طالب علم اور چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔''

آخر کیوں آج کی ترقی کی دوڑ میں یورپ سب سے آگے ہے۔کیوں کہ وہاں کے لوگ وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔وہاں جہالت بھی کم ہے۔وہ یہ جانتے ہیں کہ تاریک زندگی کو روشن اور رواں دواں کیسے بنایا جاتا ہے۔لہٰذا زندہ قومیں محنت و مشقت سے نہیں گھبراتیں اس کے برعکس جو قومیں مردہ ہوتی ہیں انھیں بالکل بھی وقت کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔وہ تاریکی سے مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے ڈر کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہیں۔ان کے اندر محنت و مشقت کا جذبہ بھی مر جاتا ہے۔لہٰذا ایسی قومیں زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔

یورپ کی آب و ہوا کو لے کر ایک اور سوال ابھرتا ہے کہ آخر وہاں کیا ہے اور وہاں کی آب و ہوا کی تاثیر کیا ہے۔اکثر وہاں جانے والے ہندوستانی طالب علموں کی فکر میں تبدیلی آ جاتی ہے۔علامہ اقبال بھی یورپ جانے کے بعد کہتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان بنا دیا۔آخر اس بیداری کی وجہ کیا ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ جب ہندوستان کا طالب علم یورپ کا سفر کرتا ہے تو اسے اپنے ملک و قوم کو دور سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔کچھ بے رحم حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو قریب سے نظر نہیں آتیں۔ہم جس زندگی میں جیتے ہیں اکثر اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔لیکن جب ہمیں دوسروں کی زندگی کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے تب ہمیں اپنی زندگی کا صحیح اندازہ ہو پاتا ہے۔یورپ جا کر ہندوستانی طالب علموں کو جو تلخ تجربے ہوتے ہیں وہ انھیں چونکاتے ہیں۔

ناولٹ کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے ادب میں رائج عشق و عاشقی کے روایتی تصور کو ہی بدل کر رکھ دیا جو آگے چل کر ترقی پسندوں کا سب سے بڑا وصف ثابت ہوا۔اس تصور نے عاشق کے دل میں ایک لڑکی کی جگہ ملک قوم اور پوری کائنات کی تصویر ابھار دی۔فیضؔ نے یوں ہی تو نہیں کہا تھا۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

ناولٹ سے مثال کے طور پر شیلا کی زبانی ہیرن کے یہ جملے ملاحظہ کیجئے:

''تم بار بار مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو کہ انسانی زندگی کا دائرہ صرف عشق و عاشقی تک محدود نہیں۔کیا اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل اور بہت سی دلچسپ اور غیر دلچسپ چیزیں نہیں ہیں جن سے ہم وابستہ ہیں؟''

ناولٹ میں 'پوری دنیا کے مزدور ایک ہوں' والا نظریہ بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔لندن کا انگریز مزدور جب ہندوستانی مزدور کی موت کی خبر سنتا ہے تو اسکے اندر بھی ایک بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔لندن کے مزدور کی عالمانہ گفتگو ناولٹ کا ایک روشن حصہ ہے۔لندن کے مزدور کا یہ سوچنا، جب ہم اپنے ملک پر کسی دوسرے ملک کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے تو پھر دوسروں کے ملک پر ہماری حکومت کیوں قائم ہو؟ کیوں نہیں ہندوستانیوں کو انکا ملک سونپ دیا جاتا؟ لندن کے یہ انگریز مزدور حکمران انگریزوں کے رویوں کی مذمت اور انکے ظلم کی مخالفت کرتے ہیں۔انگریز جو ظلم کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ میری وجہ سے ہی ہندوستان میں امن قائم ہے اس بات پر سوالیہ نشان ایک انگریز مزدور ہی لگاتا ہے اور دھوکے کی بنیاد پر قائم انگریزوں کی حکومت کا پردہ فاش کرتا ہے۔

اعظم، راؤ، نعیم، شیلا اور کریم جیسے طالب علموں کے بیچ مشرق اور مغرب میں پھیلی برائیوں کو لے کر ہونے والی دانشورانہ گفتگو ادب میں ایک نئی بحث کو جنم دیتی ہے۔دوران گفتگو یہ سوال بھی ابھرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ کون اس بات کا فیصلہ کریگا کہ فلاں رسم اچھی ہے اور فلاں رسم بری؟ ہر انسان کو اس بات کی پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرے۔اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر انسان کی پسند اور ناپسند اس کی تہذیب اور اس کی ثقافتی زندگی سے متاثر ہوتی ہے۔ظاہر طور پر کچھ لوگ کریم کی طرح دوسری تہذیب میں ڈھل جاتے ہیں پھر بھی ان کی ذہنیت اپنے کلچر سے جڑی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان کبھی ظاہر میں کچھ ہوتا ہے اور باطن میں کچھ۔اس بحث سے جو روشنی چھن کر آتی ہے وہ یہ کہ کسی چیز کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہئے۔عقل جس کام کے لئے اجازت دے بس وہی کام کرنا چاہئے۔

ناولٹ کے اس سفر کا ایک اور روشن پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی طالب علم اپنے بارے میں بھی باتیں کرتے ہیں۔ان طالب علموں کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ کس پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں وہ لوگ اسی لئے اپنی زندگی اور حرکت و عمل پر تنقید کرتے ہیں۔

"ہماری حیثیت کسی طرح چوروں اور ڈاکوؤں سے کم نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ
ہندوستان کی دولت جو ہم یہاں لٹا رہے ہیں ہم کو اس کا حق ہے۔ ہماری زندگی سے
ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔"

دراصل مصنف نے متوسط گھرانے کے نوجوانوں کے بدلتے ہوئے رجحان پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی وہ اس ناولٹ کے ذریعے نوجوانوں کی سوچ بدلنے کا کام لینا چاہتا ہے۔ مصنف نے ان نوجوانوں کی اور طالب علموں کی اصلاح اور حوصلہ افزائی کرنے کی بھی وکالت کی ہے کہ جن کے اندر ذرا سا بھی مظلوم اور غلام ہندوستانیوں کی بے بسی اور بے کیفی کا احساس کیا جاتا ہے۔

"ہم ان کو اس راستے کی طرف لانے میں مدد دیں جدھر زندگی کی روشنی ہے۔
جدھر تکلیف اور مصیبت اور مشکل تو ضرور ہے لیکن موت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا نہیں۔
جدھر ہر بیہودہ بے حسی کا نام خوشی نہیں ہے بلکہ جدھر مسرت کا ایک نیا احساس ہے۔
قدرت کی اندھی طاقتوں کو زیر کرنے کی مسرت۔ انسانوں کو بے شعوری، بدنظمی اور خود
غرضی کی بربریت سے نکال کر ایک منظّم، مہذب، متمدن دنیا بنانے کی مسرت، محنت
اور مشقت کی مسرت۔"

ہندوستان کی بے رحم اور تلخ حقیقتوں و تاریکیوں کے بیچ سے بھی مصنف نے ایک روشن و تابناک پہلو اجاگر کیا ہے جس میں ہندوستان کی حیات اور ثقافت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

"تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے وہاں بہت سی چیزیں بھی ہیں۔ شام کے وقت جب
برسات میں سورج ڈوبتا ہے اور آسمان پر آگ لگ جاتی ہے اور جب چاندنی نکلتی ہے
اور ہمارے ملک کے ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز میدانوں کے بیچ سے گذرتے
ہوئے دریا پگھلی ہوئی چاندی کی ایک تھرائی ہوئی درخشاں لکیر بن جاتے ہیں اور اس
ملک کے کروڑوں محنت کرنے والے انسان جو اپنی غریبی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ
دینا چاہتے ہیں یہ سب بیش بہا ہے۔"

اس مضمون میں لندن کی ایک رات کا مطالعہ سرسری اور خارجی سطح پر ہی کیا گیا ہے اور ناولٹ کے چند اہم روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ اس کا مطالعہ اس کی تہہ میں جا کر کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس ناولٹ کی تہہ میں ہی اس کے اصل راز پوشیدہ ہیں۔ آخر میں اپنے مطالعہ کی بنیاد پر عرض کروں کہ نا امیدی سے امید کا، جہالت سے علم و دانش کا، غلامی سے آزادی کا، شام سے صبح کا یہ لمبا سفر ناول میں بڑی خوبصورتی سے طے کیا گیا ہے۔ اس سفر میں زندگی کی چہل پہل بھی ہے اور سکوت و خاموشی بھی۔ فکر و فلسفہ بھی ہے اور عشق و محبت کی

داستان بھی، وصل کی خوشی بھی ہے تو جدائی کا غم بھی۔ زندگی کی بھیڑ بھاڑ بھی ہے اور اکیلا پن و سونا پن بھی۔ مغرب و مشرق کی تہذیب و ثقافت بھی اور مادیت و روحانیت بھی۔ اگر اس کے ماضی میں روس کا انقلاب ہے تو مستقبل میں ہندوستان کی آزادی ہے۔ اس میں اعلیٰ طبقے کی بے رحمی و بے حسی بھی ہے اور نچلے طبقے کی بے بسی و بے کسی بھی۔ بے روزگار نوجوانوں کی بے چینی بھی ہے اور متوسط طبقے کے نوجوانوں کی کش مکش بھی۔ اگر اس ناولٹ پر مغربی فن کے اثرات ہیں تو مشرقی فکر کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ کرداروں میں نیا پن ہے اور ناولٹ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں اشتراکی رجحان شروع سے آخر تک موجود ہے۔

☆☆☆

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین
سجاد ظہیر کا سب سے عظیم کارنامہ

"سجاد ظہیر کا سب سے عظیم کارنامہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ہے جس میں عصر حاضر کے تمام مشہور اور ممتاز ادیب شامل ہوئے اور نوجوان ابھرتے قلم کار بھی۔ اس تحریک کو ٹیگور، نہرو، اقبال، سروجنی نائڈو، پریم چند جیسی شخصیتوں کا آشیرواد اور نیک تمنائیں حاصل تھیں۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی ادبی تحریک تھی جو ملک کی تمام زبانوں کو اپنی آغوش محبت میں سمیٹے ہوئے تھی اتنا زبردست تہذیبی ابھار اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔" **(سردار جعفری)**

مارچ ۱۹۵۳ء میں دہلی میں ہوئی
کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس

"اس کانفرنس میں گوپال متّل شریک تو نہیں ہوئے لیکن وہ آس پاس گھومتے پھرتے یا لان میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ امریکی امداد سے ترقی پسندوں کے خلاف ایک رسالہ نکالنے جا رہے ہیں۔ میں نے یہی بات ان سے دریافت کی۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ کہنے لگے کہ جو بھی ترقی پسندوں کی آمریت کے خلاف کچھ بولتا یا لکھتا ہے اسے امریکی ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ دوسرے مہینے "تحریک" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ گیا"

(**مظہر امام** کے خاکوں کے مجموعہ **اکثر یاد آتے ہیں** سے اقتباس)

نور ظہیر

میرے حصہ کی روشنائی

ابّا کا مذہب سے، کسی بھی مذہب سے، کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہاں، تیوہاروں کو وہ کبھی کسی دھرم سے نہیں جوڑتے تھے۔ گھر میں عید ضرور منائی جاتی تھی لیکن صرف اس لئے کہ گھر پر بہت سارے لوگ آسکیں اور مزے مزے کے کھانے بن سکیں۔ اُسی طرح سے گھر پر دیوالی بھی منائی جاتی۔ ابّا بڑے شوق سے مٹی کے دئے خریدتے، پانی میں انھیں ڈبوکر رکھتے اور اندھیرا ہو جانے پر چار دیواری پر سجاتے۔ بعد کے سالوں میں دلّی میں رنگین بلب جلانے کا فیشن آ گیا تھا۔ ابّا کو ان سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ روشنی وہ ہوتی ہے، جو چونکاتی یا چکا چوندھ نہیں کرتی، بلکہ آہستگی سے دور تک پھیلتی ہے اور دیر تک اپنے دائرے کو روشن رکھتی ہے۔

عید اور دیوالی سے بھی بڑھ کر انھیں نیا سال منانے کا شوق تھا۔ سارا سال وہ دوستوں کی بھیجی ہوئی اور سفر کے دوران خود اپنی خریدی ہوئی شرابیں جمع کرتے۔ ہر بوتل کو، اپنی کپڑوں کی الماری کے سب سے پیچھے رکھنے سے پہلے وہ اسکی تاریخ، اسکو بنانے کا طریقہ، کہاں پر بہترین بنتی ہے، کیسے اور کب پی جانی چاہئے، یہ سب دریافت کر لیتے۔ آٹھویں کلاس میں اوّل آنے پر ابّا نے مجھے بیس جلدوں کا انسائیکلو پیڈیا انعام دیا تھا۔ اسے وہ خود بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے کیوں کہ اس میں دنیا بھر کی شرابوں کے اوپر ایک تفصیلی باب تھا۔

یہ ساری بوتلیں ایک ایک کر کے ۳۱ دسمبر کی شام کو نکلتیں اور کھلتیں۔ کچھ سال ہمارے خالو میجر جنرل حسنین دلّی میں پوسٹڈ رہے۔ اس سال تو نیو ائیر کی پوچھئے مت! پلاسٹک کی نئی بالٹی خریدی جاتی جس میں ملٹری کینٹین سے آئی رم کی بوتلیں، لائم کارڈئل، ایپل جوس، چینی اور نیبو۔ سنترے کے چھلکوں کے ساتھ بغلگیر ہوتیں۔ امّی کی سب سے بڑی کفگیر سے اس پنچ کو گھنٹوں چلایا جاتا۔ پھر رنگین کاغذ سے وہ بالٹی سجائی جاتی اور حوض خاص کی چھوٹی سی کھانے کی میز کے بیچ و بیچ اسکا آسن جمتا۔ پورے کمرے میں ڈوریاں باندھی جاتیں جن پر دنیا بھر سے ابّا کو آئی نئے سال کی مبارکباد کے کارڈ ٹانگے جاتے۔

شام سے لوگ آنا شروع ہوتے۔ گیارہ بجے تک کمرہ کھچا کھچ بھر جاتا۔ شعر و شاعری، لطیفوں، قصوں اور لیفٹسٹ نقطہ نظر کے مزید مسئلوں کا دور چلتا۔ پونے بارہ بجے ابّا ساری روشنیاں بجھا دیتے اور امّی سات آٹھ موم

بتیاں جلا دیتیں۔ محبت، رفاقت، دوستی، خواہشوں اور امیدوں کی شمعیں۔ پوری جھمکتی ہوئی محفل چند منٹ خاموش ہو کر نئے سال کا انتظار کرتی۔ نیا سال جس میں اس عہد کے میر، کبیر، میرا، غالب چمکیں گے آسمان پر اپنے، نیا سال جب امید آئیگی، نیا سال جب ملک ہمارا اونچا ہوگا۔ دور بہت دور سہی، آ جاتی تم اک رات کو تھوڑی دیر کو۔

ظاہر ہے کہ ابّا کو دور دور تک مذہبی روایتوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک بار ہماری چھوٹی پھوپھی، جو ابّا سے کوئی دو برس بڑی تھیں، پاکستان کا سفر پورا کر کے لکھنؤ لوٹنے سے پہلے ہمارے یہاں دلّی میں رکیں۔ سفر بخیریت پورا ہونے کے شکرانے کے طور پر گھر میں قرآن خوانی رکھی گئی۔ امّی تو خیر نند کی خدمت میں لگی رہیں مگر ابّا نے گھر میں ہونے والی چہل پہل میں کوئی دل چسپی نہیں دکھائی۔ شام کو کھانے پر ابّا ذرا شرارت میں بولے،''یہ کیا چھوٹی باجی، کچھ اچھے پکوان بنا کر شکرا دا کرتیں۔ ایک مولوی بلوا لیا، جسکا تلفظ تک درست نہیں تھا۔'' چھوٹی پھوپھی پہلے سے ہی ابّا کی اس بے رخی سے چڑھی بیٹھی تھیں۔ بگڑ کر بولیں،''تو بنّے میاں، آپ پڑھ دیتے کلام پاک۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں تو آپ تڑکے سویرے اذان دیا کرتے تھے، پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے اور حافظ قرآن تھے۔ ولایت جا کر نہ جانے کیا آپکو ہو گیا!'' ہم لوگوں نے ابّا کا یہ روپ کبھی دیکھا نہیں تھا۔ میں نے ابّا کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا،''ہیں ابّا! آپ ایسے تھے؟''

ابّا سنجیدہ ہو گئے، ہونٹوں سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولے،''یس، آئی واس اے کمپلیٹ ایڈیٹ۔''

مذہب، ابّا کی نظروں میں وہ نشہ تھا جس کی لت سماج کو اسلئے لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے حالات کی اصلی وجہ ڈھونڈھنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ جو کہیں اسے وجہ مل گئی تو وہ اسے مٹانے کی کوشش کریگا۔ اور اس کوشش میں، جو اسکے حق کی لڑائی ہے، وہ سرمایہ داروں اور سامراجیہ وادی طاقتوں کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ یہ انکا اپنا عقیدہ تھا جسے انھوں نے زندگی بھر قائم رکھا۔ اسکے باوجود انھوں نے اپنے خیالات کبھی کسی پر حاوی نہیں ہونے دئے۔ خاص کر کے امّی پر انھوں نے کبھی کوئی پابندی لاگو نہیں کی۔

امّی محرم کی مجلسوں میں بھی جاتیں، مرثیہ بھی پڑھتیں، کوئی پریشانی ہو تو دعائیں منّتیں بھی مانتیں، پریشانی لمبی کھنچ جائے تو حضرت نظام الدین کی درگاہ پر بھی ہو آتیں۔ امّی اور مذہب کا عجیب رشتہ تھا۔ اللہ ایک ہے اور اسکی کوئی شکل وصورت نہیں ہے۔ اس بات پر انھیں پورا یقین تھا۔ پھر بھی انھیں خواب میں اکثر کرشن جی اور سرسوتی جی دکھائی دیتے۔ کرشن جی کا تو خیر سمجھ میں آتا ہے۔ انھیں خوبصورت اور ذہین دونوں طرح کی عورتیں پسند تھیں۔ کم سے کم رادھا اور للتا سکھی سے ایک ساتھ عشق سے تو ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ امّی دیکھنے میں خوبصورت بھی تھیں اور ذہین بھی۔ مگر سرسوتی جی کا یوں بلا وجہ ڈولنا ذرا حیرانی کی بات ہے۔ وہ تو کافی سنجیدہ ہستی ہیں۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ انکی مصروفیت مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ بے چاری جب خالی بیٹھے بیٹھے تنگ آ جاتی ہونگی تو وزیر منزل کے آم کے باغ میں ٹہلنے چلی آتی ہوں گی۔ امّی سے انکی ملاقات اکثر وہیں ہوتی تھی۔

امّی کے یہ خواب ایسٹ مین کلر میں ہوتے تھے۔ سرسوتی ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں ہوتیں اور انکی صداقت دیکھئے کہ وہ صبح کی سیر پر بھی چار ہاتھوں میں دنیا اٹھائے رہتیں اور تیسرے میں کتابوں کا پلندہ تھامے رہتیں۔ شاید اس امید میں کہ بھولا بھٹکا کوئی سنگیت کار یا عالم مل جائے تو اسے آشیرواد دے ڈالیں۔ انکے پیچھے پیچھے لمبی گردن والا دودھیا سفید راج ہنس ہوتا۔ وہ بلا کی خوبصورت تھیں اور کافی ڈھیٹ بھی۔ دیکھئے نا، باغ میں ٹہلنے سے دل نہیں بھرا تو سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھتی اوپر صدر دروازے تک آ گئیں۔ یہاں پر امّی سے بھینٹ ہوئی تو مسکراتی ہوئی بولیں، ''تمھارے لئے سونے کے جھمکے بھیجے تھے۔ ملے یا نہیں؟'' امّی کے انکار میں سر ہلانے پر بولیں۔ ''ذرا انتظار کرو، ملیں گے۔'' تین دن بعد جب امّی کی ایک کہانی کو پانچ سو روپیہ انعام ملے تو امّی نے فوراً اس انعام کو سرسوتی جی کے بھیجے ہوئے جھمکے مان لیا۔ علم اور گیان کی دیوی کا ذخیرۂ الفاظ اتنا کم کیوں تھا کہ وہ روپیوں کو جھمکے کہہ رہی تھیں۔ ایسا نہ تو کوئی ان سے پوچھتا، نہ وہ خود اس پر غور کرنا ضروری سمجھتیں۔

بار بار کی ملاقاتوں سے امّی اور سرسوتی جی میں کافی قربت ہوگئی۔ سن اکہتر میں تقی حیدر صاحب نے، جنھیں ہم بہنیں تقی بھائی کہا کرتی تھیں اور جو خود ہمارے والدین کو امّی اور ابّا کہتے تھے، شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ امّی اس شادی سے خوش تھیں یا نہیں، کہا نہیں جا سکتا، کیونکہ جب میں نے ان سے پوچھا تو بس اتنا جواب ملا۔ ''سونا، جانے کسے اور آدمی جانے بسے۔'' مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ اس بات سے بہت خوش تھیں کہ دلہن کا نام سرسوتی ہے۔ بعد میں ہم سب تو انھیں چھوٹا کر کے سرس بھابھی بلانے لگے، مگر امّی انھیں سرسوتی ہی پکارا کرتیں۔

امّی نے سرسوتی کی پوجا نہ کبھی کی، نہ کہیں اور ہونے والی اس طرح کی پوجا میں کبھی شامل ہوئیں۔ بسنت پنچمی پر لگنے والے میلوں میں جانا انھیں بہت پسند تھا۔ سن ۶۴ء میں ہم لوگ، یعنی امّی اور میں ابّا کے پاس دلّی آ گئے۔ رہائشی مقام بدل لینے سے جہاں زندگی میں بہت سی خوشنما چیزیں شامل ہوئیں، وہیں روزمرہ کی زندگی میں رنگینی بھرنے والے چھوٹے چھوٹے میلے جن میں زیادہ تر مٹی، لکڑی اور بانس کی بنی ہوئی چیزیں ملتی تھیں، غائب ہو گئے۔ امّی پھر بھی دیوالی کی سجی ہوئی دکانیں دیکھنے بہت سے بازاروں کے چکر لگاتیں اور مٹی کی چیزوں کی دکانوں پر سرسوتی کی مورتی ڈھونڈتیں۔ دلّی کے کمہاروں سے انھیں یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ چار ہاتھ کی دیوی کو کچھ بھی تھما کر اسے سرسوتی کہہ دیتے ہیں۔ کئی بار دکاندار سے انکی بحث ہوتی۔ ''یہ دنیا تھوڑی ہے، یہ تو سنسار ہے!'' ''اور یہ کیا بھلا؟ اس مورتی میں تو ہنس ہے ہی نہیں۔''

حد تو تب ہوئی جب انھیں ایک دکان پر سرسوتی جی موڑ پر بیٹھی نظر آئیں۔ یہ تو غضب تھا! کچھ تو کرنا پڑیگا۔ اگلے اتوار، بڑے تڑکے سویرے، مجھے ساتھ لئے وہ شاہ پور گھاٹ کی طرف چلیں۔ ابّا کو ٹہلنے کا شوق تھا، سو وہ بھی ساتھ ہو لئے۔ نئی دلّی، آپکو معلوم ہی ہوگا۔ بہت سارے گاؤں کو ملا کر بسائی گئی تھی اور ان گاؤں کو لال ڈورے میں محفوظ رکھا گیا تھا۔ شاہ پور جٹ انھیں میں سے ایک گاؤں ہے جسکی آدھی سے زیادہ آبادی مسلمان، ان پڑھ اور

بے حد غریب تھی۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ کمہار تھے۔ حوض خاص اور آس پاس کے علاقے میں انھیں کی بنائی صراحیاں، مٹکے، گلّک، جھانوے اور دیوی دیوتا بکتے تھے۔ جس وقت ہم لوگ حوض خاص اور شاہ پور کے بیچ کے کیکر کے جنگل کو پار کرتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے، بھٹیاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور کمہارنیں ان میں سے برتن نکال کر رنگنے کے لئے رکھ رہی تھیں۔ ہوا میں جھلسی ہوئی مٹی کی عجیب سی مہک تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں جانی تھی۔ ابّا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائے اور بولے، ''یہ مٹی کی خوشبو ہے، آگ میں تپی ہوئی دھرتی کا ایک نیا روپ۔''

امّی وہاں پہنچیں جہاں سوکھی ہوئی مورتیاں رنگ چڑھا کر دوبارہ سکھائی جا رہی تھیں۔ ایک نہایت بوڑھا کمہار کل رات سے رکھی مورتیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ہم کو کوئی بڑا گاہک سمجھ کر پاس آیا۔

''بھیا، ذرا مجھے ایک اچھی سی سرسوتی جی کی مورتی دینا۔'' امّی کی فرمائش پر بوڑھے نے لپک کر ایک اوسط ماپ کی مورتی اٹھا کر بڑھائی۔ مورتی کئی رنگوں کے لباس پہنے، لال وینا تھامے، گلابی کمل پر ٹیک لگائے، سترنگی مور پر سوار تھی۔ امّی کو اور کیا چاہئے تھا۔ ''بھیا، سرسوتی جی تو سفید ہوتی ہیں اور یہ بھلا مور پر کب سے بیٹھنے لگیں؟''

کمہار ایک پل کو گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا ''بات یہ ہے بی بی جی، سفید سادی مورتیاں تو آجکل کوئی خریدتا نہیں ہے اور ہنس تو سفید ہی ہوتا ہے۔ اسے تو رنگین کیا نہیں جا سکتا، تو مور ہی ٹھیک ہے۔ جو بکے ہی نہ، وہ بھگوان کس کام کا؟'' یہ لاجک سنکر امّی تو سنجیدہ ہو گئیں مگر ابّا نے مسکراتے ہوئے جیب سے بٹوا نکال کر پانچ روپئے میں وہ مورتی خرید لی۔

شاہ پور جٹ سے واپسی میں ابّا نے میری، خدا، گاڈ یا بھگوان سے، جو بھی کہئے، پہلی سنجیدہ واقفیت کروائی، ''خدا، انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ اس ایجاد کے سہارے وہ ہر سوال کا آسان راستہ پا لیتا ہے، 'اللہ کی مرضی ہے'۔ جب ایجاد اس کی اپنی ہے تو ظاہر ہے کہ ضرورت کے حساب سے وہ اس کا روپ بھی بدلتا رہتا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کی ایک رباعی کے دو مصرعے ہیں:

اے بندۂ حق بات کو میری پہچان　　　انسان حقیقت ہے اور اللہ گمان

ابّا کے انتقال کے کئی سالوں بعد انکا ایک گیت میرے ہاتھ لگا۔ یہ گیت انھوں نے ۲۵ یا ۲۶ سال کی عمر میں آکسفورڈ میں لکھا تھا اور اپنی نظموں کے مجموعے 'پگھلا نیلم' میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس گیت کا ایک بند اس طرح سے ہے:

تعمیریں ہیں، خیراتیں ہیں تیرتھ اور حج بھی ہوتے ہیں
خون کے دھبّے دامن سے یوں دولت والے دھوتے ہیں
کیوں دان کے ٹکڑے کھائیں ہم، سارا سنسار ہمارا ہے
مزدوروں نے ملکوں ملکوں جھنڈا لال اٹھایا ہے

جو بھوکھا تھا جو ننگا تھا اب غصہ اس کو آیا ہے
سارا سنسار ہمارا ہے، سارا سنسار ہمارا ہے

شاہ پور گھاٹ سے لوٹتے ہوئے مجھے ناستکتا کا پہلا سبق پڑھانے کے وقت انکی عمر ۶۶ سال کی تھی، برابری کے فلسفے پر انھوں نے ۲۶ سال کی عمر میں جو عقیدہ تھا وہ ۶۶ سال کی عمر میں بھی اتنا ہی مضبوط اور اعتماد کے ساتھ قائم تھا۔

ایک بار حوض خاص کے اس گھر میں فراقؔ صاحب بھی آ کر ٹھہرے۔ ان کے آنے کی خبر پا کر امّی پر جیسے صفائی کا جنون سوار ہو گیا۔ باورچی خانے سے لیکر اپنی الماری تک سب کچھ الٹ کر پھر سے ترتیب سے لگایا۔ کیوں کہ فراقؔ صاحب، زیادہ تر وقت ابّا کے کمرے یعنی بیٹھک میں گذارنے والے تھے، اسلئے یہاں بھی جم کر جھاڑ پونچھ ہوئی۔ اس صفائی سے میں اور گھر میں کام کرنے والی لڑکی رسّو بھی نہیں بچ پائے۔ فراقؔ صاحب کے آنے کے ایک دن پہلے ہم دونوں کو دو بار نہلوا دیا گیا۔ ہم دونوں کو کانپتے ہوئے شام کی ڈھلتی دھوپ میں بال سکھانے کی کوشش کرتے ابّا نے دیکھا۔ کچھ دیر عادتاً چپ رہے، پھر باورچی خانے میں جھانک کر امّی سے بولے، ''ارے رضیہ، فراقؔ کے بارے میں ایک بات تو تمھیں کہنا ہم بھول ہی گئے۔۔۔'' امّی کے چہرے پر گھبراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب یہ نہ جانے کیا بھول گئے۔ جھنجھلا کر بولیں، ''تو کہو نا! اتنا بڑا پس منظر کیوں کھینچ رہے ہو؟''

ابّا اطمینان سے صدری میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے، ''دراصل یہ ہے کہ فراقؔ صاحب۔۔۔۔''

بیچ جملے کی خاموشی سے امّی چڑھ گئیں اور جھنجھلا کر بولیں، ''اللہ! کہہ چکو نا!''

''.....کہتے ہیں بھائی.....فراقؔ صاحب اصل میں شاعر ہیں۔''

''یہ کون نہیں جانتا؟'' امّی نے پوچھا۔

''او! ہمیں لگا تم انھیں میونسپلٹی کا انسپکٹر سمجھ رہی ہو۔'' امّی نے کھسیا کر جھاڑ پونچھ روک دی اور ابّا نے ہم دونوں لڑکیوں کو اشارہ کیا، ''اندر چل کر دونوں ایک ایک چمچ برانڈی پیو۔ نہیں تو کل ملوگی فراقؔ صاحب سے ناک سڑ سڑ کرتی ہوئی۔''

فراقؔ صاحب ایک عجیب وغریب شخصیت تھے۔ جہاں بیٹھتے، محفل کی جان ہو جاتے۔ شعر تو سناتے ہی، حاضر جوابی اور لطیفوں سے محفل لوٹ لیتے۔ مشاعروں میں بھی شعروں کے بیچ بیچ میں، نہ جانے کب اور کیسے سوچے ہوئے خاکے سناتے جاتے۔ ایسا سماں باندھتے کہ کے درباری بھی ان کے آگے پانی بھرتے۔ سب کے بعد مائیک پر آتے اور سارے لوگ انکے شعروں اور واقعوں کو سن کر جھوم جھوم اٹھتے۔ پھر وقت کیسے پنکھ لگا کر اڑ جاتا، پتہ ہی نہیں چلتا۔

ایسی ہی ایک محفل اس شام کو بجی، جب فراقؔ صاحب گھر پر ٹھہرے تھے، اور فراقؔ صاحب نے

نادانستہ ہی میرے لئے مذہب کے تنگ دائرے میں تخلیق کی پوری ایک دنیا کھول دی۔ ہوا یہ کہ جب فراقؔ صاحب کے سامنے شمع آئی، گھر پر ہونے والی محفلوں میں امّی۔ ابّا نے پرانی روایت کو زندہ کیا تھا۔ تو فراقؔ صاحب نے سب سے پہلے تو اپنا گلاس اٹھایا۔ اس میں آدھے سے کچھ زیادہ وہسکی کو بڑے غور سے دیکھا، پھر ایک گھونٹ میں اسے گلے سے نیچے اتارتے ہوئے بولے، ''لو بھیا، آ گئے واپس۔ اب یوں منہ پھاڑے کیا تاک رہے ہیں۔ پوچھئے کہاں سے؟''۔۔۔۔۔۔۔ محفل میں سے کسی نے پوچھا، ''کہاں سے فراقؔ صاحب؟''

''ارے انہائی سے جہاں سب کو جانا ہے، ہم پہلے ہو آئے۔ بھئی بڑے احمقوں کی محفل ہے۔ وہاں یعنی جنت سے۔ اماں جنت سے ہو کے آ رہے ہیں۔... پوچھئے گا نہیں، کیا دیکھا؟''۔۔۔۔۔۔۔۔۔

امّی کی سرسوتی جی میں دلچسپی یا فراقؔ صاحب کا خدا کا ایسا انسانی روپ تو سمجھ میں آتا ہے، غور طلب یہ ہے کہ ہندو دکانداروں یا کلاکاروں نے امّی سے پلٹ کر کبھی نہیں کہا کہ آپ تو مسلمان ہیں آپ کون ہوتی ہیں دخل دینے والی؟ ہمارے دیوی دیوتا ہنس پر بیٹھیں یا مور پر، آپکو کیا؟ یا فراقؔ صاحب کو قہقہے لگاتے ہوئے مسلمان شاعروں نے کبھی یہ کیوں نہیں یاد دلایا کہ خدا تو ایک غائبانہ ہستی ہے جس کا نہ کوئی وجود ہے نہ شکل وصورت، پھر یہ خدا کی خدائن کیوں کر آئیں۔ یہ شریعت میں دخل اندازی ہے اور وہ بھی ایک ہندو کی۔''

آج کے دور میں جیتے ہوئے، جب حسین جیسے فنکار کو ایک سرسوتی کی تصویر بنانے پر طرح طرح کی ملامتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں اور روملہ تھاپر جیسی تاریخ داں کو اکبر کی انتظامی قابلیت کی تعریف کرنے کے لئے ہر سرکاری عہدے سے ہٹایا جا چکا ہے، تو خیال آتا ہے کہ وہ مسلمان کیا ہوئے جنھیں ہندوؤں کی دیوی دیوتاؤں میں روپ ڈھونڈھنے کا شعور تھا، جو پھاگ میں رادھا اور کرشن کی چھیڑ چھاڑ کے گیت گاتے تھے اور بس دیوالی کی رات کو کاجل پارتے تھے؟ اور وہ ہندو کیا ہوئے جن کے تاشوں کی چمک اور شربت کے پیاؤ کے بغیر تعزیے نہیں اٹھتے تھے؟ انسانیت کی وہ روایتیں، جو ایک دوسرے کو سمجھ کر زندگی سے رنگینی بٹورنا سکھاتی تھیں۔ جو خود پر اور ایک دوسرے پر ٹھٹھولی کرنے کو مذہبی اصولوں پر وار نہیں مانتی تھیں اور مل کر ہنسنے یا خوش ہونے کا اپنا بنیادی حق اور زندگی کی طرف اہم فرض گنتی تھیں، کہاں کھو گئیں؟ آج جب فرقہ پرست طاقتیں ہمیں بار باران تنگ دائروں میں سمیٹ دینے کی کوشش کر رہی ہیں، جن کے وجود کو ہم نے کبھی نہیں مانا، تب اس دور کے بارے میں رک کر سوچنا ضروری ہے۔ کیا وہ بس ایک دور تھا جسے ہر فانی چیز کی طرح گذر جانا تھا سو گذر گیا اور اپنے پیچھے کچھ خوشنما یادوں کے سوا کچھ نہ چھوڑ گیا؟ یا وہ ہماری نسل کی کمزوری تھی کہ ہم اپنی بیش قیمتی وراثت کو سنجو کے نہ رکھ پائے؟

اگلے دن پھر شام کو گھر پر مشاعرے کا انتظام تھا۔ جھٹ پٹے کے وقت بہت سے شاعر اکٹھے ہوئے جن میں غلام ربانی تاباںؔ، رفعت سروشؔ، سلام مچھلی شہری، سردار جعفری اور نیاز چچا کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ امّی نے گھر کے سامنے کے دالان میں مشاعروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ شعروں، لطیفوں اور تذکروں

کے دور کے ساتھ شراب کا دور بھی بین بین تھا۔کوئی نو بجے فراقؔ صاحب کی طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے امّی نے اندر کے کمرے میں کھانا لگا دیا۔سردار (جعفری) چچا،اس محفل میں ساقی کا رول ادا کر رہے تھے۔کھانے پر جانے سے پہلے انھوں نے بڑے احتیاط سے وہسکی کی آخری بچی بوتل ایک کرسی کے نیچے رکھ دی۔

کھانے سے سب لوگ جلدی نبٹ لئے ،کیونکہ فراقؔ صاحب نے ابھی تک کچھ نہیں سنایا تھا اور ان کو سننے کی للک سب کے دل میں تھی۔سردار چچا نے بے حد مستعدی دکھاتے ہوئے سب سے پہلے ہاتھ دھو لئے اور شعروں کا دور دوبارہ شروع ہونے سے پہلے،سب کو ایک ایک جام تقسیم کر دینے کی نیت سے باہر حفاظت سے رکھی ہوئی بوتل کی طرف بڑھے۔جگہ پر رکھی بوتل غائب تھی۔سردار چچا سب سے پہلے امّی سے مخاطب ہوئے۔''رضیہ آپا،ہم کھانے سے پہلے یہاں ایک بوتل رکھ گئے تھے،اب مل نہیں رہی ہے۔آپ جانتی ہیں کہاں ہو سکتی ہے؟''

''لو بھلا!شعر سن رہے ہیں،کھانا دیکھ رہے ہیں،ہمیں آپ کی بوتل کی بھلا کیا خبر؟''

ٹکا سا جواب پا کر سردار چچا ذرا گھبرائے۔دو ایک اور لوگوں سے دریافت کیا اور پل بھر میں اطمینان سے شعر سننے والوں کی محفل بے قراری سے کھوئی ہوئے بوتل ڈھونڈھنے لگی۔گاؤ تکیہ،کشن الٹے گئے۔کرسیاں،میز کھسکائی گئیں،حد تو یہ کہ زمین پر بچھے گدوں کے نیچے بھی تلاشی ہوئی۔موجودہ لوگ،زیادہ تر بائیں بازو والے یعنی سرکار کے مخالف لوگوں میں سے اور کبھی نہ کبھی اپنے یا دوستوں کے گھروں پر پولس کی تلاشی جھیل چکے تھے۔یقین مانئے،تلاشی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی گئی۔

اس سب گڑبڑ کے بیچ فراقؔ صاحب باہر نکل آئے۔معاملے کی سنگینی سے انھیں بھی واقف کرایا گیا۔

ایک پل آنکھیں بند کر کے انھوں نے سوچا،پھر آنکھیں پھاڑ کر سب کو ڈرا دینے والے اپنے خاص انداز میں بولے ''اماں،آپ لوگ ایک بوتل کے غائب ہونے کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔دیکھتے نہیں ایک آدمی بھی تو غائب ہے؟''سب کو کھانے میں مشغول دیکھ کر نیاز چچا بوتل لیکر رفو چکر ہو گئے تھے۔فراقؔ صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولے''اب منہ کیا تاک رہے ہیں جناب؟ آئیے،اچھے شعر سن کر بھی کبھی کبھار جھوما جائے۔''

☆☆☆

''اپنی ذاتی زندگی میں کبھی کبھار میں مذہبی امور میں کسی حد تک شوخ بھی ہو جاتا ہوں۔بعض عقلی باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن خدا جانے کعبہ شریف کی دیواروں میں کیا بھید تھے کہ کعبہ کا سامنا ہوتے ہی میری ساری شوخیاں اور عقلی باتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔پھر میرے ساتھ وہاں ایسے ایسے اسرار رونما ہوئے اور اتنے انوکھے روحانی تجربے ہوئے کہ انہیں پوری طرح بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔''

(سفرنامہ **سوئے حجاز** از حیدر قریشی سے اقتباس)

ثروت خان

''ابّا کو غصّہ کیوں آنے لگا''

کسی رسالہ میں نور ظہیرؔ کا مضمون پڑھ رہی تھی۔اختتام تک پہنچتے پہنچتے سجاد ظہیرؔ کا سراپا حواس پر طاری ہو گیا۔میں سوچنے لگی۔اگر وہ دوسرا جنم لے لیں تو ہم انھیں کیسے لگیں گے اور وہ ہمیں کیسے لگیں گے؟

بس اس سوال نے ذہن پر دستکیں دینا شروع کر دیں۔نور ظہیر نے لکھا کی ابّا کو کبھی غصّہ نہیں آتا تھا۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے،محمد اسداللہ نے بھی یہی بات لکھی ہے۔واقعی میں یہ بہت بڑا وصف ہے۔لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ آج وہ بات بات پر غصّہ ہوتے،بلکہ لال پیلے ہو کر منہ سے جھاگ اگلنے لگتے۔رشید جہاں،محمود الظفر اور محمد علی سے کہتے:

''دوستو،اس زمانہ میں 'انگارے' کی نہیں بلکہ آتش فشاں کی ضرورت ہے۔جس کا پگھلتا ہوا لاوا اس غیر منظّم صورتِ حال کو جھلسا کر رکھ دے۔کاش ایسا ہو جائے اور ایک نئی دنیا پھر سے تعمیر ہو۔دوستو،تمھیں یاد ہے، ہم نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔بیداری لانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔اپنی تمام زندگی جھونک دی تھی۔اپنا مقصدِ زندگی تو انقلاب تھا،ہندوستان کو بدلنا تھا؛''لیکن آج ملک،سماج،تہذیب،اخلاق و ادب کی کیا صورت ہو گئی ہے،کیا حالت ہے۔میں سخت حیران ہوں۔ہم نے تو صدیوں سے متھے گئے ان خزانوں کو اپنے اسلاف کی جسمانی،ذہنی اور روحانی کاوش کا ثمر سمجھ کر اس کی حفاظت اور اس کے دانشمندانہ استعمال کے لئے تحریکیں چلائیں۔کیونکہ تہذیب کی یہی اقدار ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمجھنے اور اسے خوشگوار و بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔لیکن اقدار کی یہ پامالی۔اُف۔خدایا مجھے کیوں دوبارہ جنم دے دیا۔کیا یہی سب دیکھنے کے لئے۔میں نے تو کہا تھا کہ ادبی کاوش سے ہم عوام میں شعور،حس و حرکت،جوش و عمل اور اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔اور ہم نے کیا بھی۔اسی کے ساتھ ان تمام رجحانات کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کر دیا تھا جو جمود،رجعت،پست ہمّتی سے پیدا ہوتے ہیں۔لیکن جب میں پورے سو برس بعد آیا ہوں تو دیکھ کر حیران،پریشان و پشیمان ہوں کہ نہ ادب و اخلاق کے وہ دھارے،وہ آبشار رہے اور نہ انھیں پڑھنے والے رہے۔سچ کہتا ہوں،رشید۔میں نے کل ایک سیمینار میں دیکھا۔نئی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکنے کے بجائے ہاتھوں ہاتھ دی اور لی جا رہی ہیں۔

’’جی، ظہیر بھائی، بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اور کتابیں بھی ہوں نگوڑی۔ بس ہر کوئی فنکار، دانشور بنا بیٹھا ہے۔ اور شاعر تو لاتعداد دیکھے۔ اور ان کے اپنے نجی نقاد اور مخصوص مدّاحوں کی اپنی روایتیں بھی دیکھیں۔ ہر اک اپنا مجموعہ لئے آتا ہے کہ صاحب اس پر رائے دیجئے، تبصرہ کیجئے۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیا حماقت ہے۔ بھائی فیضؔ، تم نے سچ کہا تھا کہ دورِ حاضرہ کی تنقید، محبتوں کا ’’چمتکار ہے‘‘ بلکہ اب تو محبتوں کے ساتھ مروّتوں کا لفظ بھی جوڑ دیں تو نا کافی ہی ہوگا۔

یہ آج کے انسان کو کیا ہوگیا ہے۔ میری سمجھ سے باہر ہے محمود۔۔ یہ اپنے خلاف خود ہتھیار اُٹھائے کھڑا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں غصّہ، ہوس، دنیاوی رنگینیوں کا کیچڑ ہے جس میں لتھ پتھ ہو کر یہ اپنے آپ سے شدید جنگ کر رہا ہے۔ بڑے تذبذب میں ہے۔ باہر نکلنے کی سعی بھی کرتا ہے تو اور گہرائی میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ یہ غم وغصّہ آخر کیوں؟ مجھے جب اس سوال کا جواب معلوم ہوا تو میں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ مسائل ہی مسائل۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ مسائل پہلے نہیں تھے، لیکن محمد علی سنو تو! اُس وقت تو ہم غلام تھے، آزادی بھی کن شرطوں پر ملی، وہ بھی ہم نے دیکھا، بھُگتا۔ لیکن اب تو اپنی حکومت ہے، اپنا جہان، اپنا آسمان ہے۔ مگر معاشی وتہذیبی استحصال کا عروج بھی ہے۔ آخر کیوں؟ یہ نا قابل برداشت ہے، میرے بھائی!

’’تم یہ دیکھو کہ ہندوستان کی آزادی کے ۵۶ سال گزرنے کے باوجود ملک میں صرف ۳۰ فی صد زمین پر ہی کاشت ہوتی ہے۔ باقی بنجر زمین کو زرخیز بنانے کے لئے کوئی اقدامات ہی نہیں اٹھائے گئے۔ محمود، آج سویرے سویرے اخبار دیکھا تو ایک رپورٹ دیکھ کر اخبار ہاتھ سے تقریباً چھوٹ سا گیا۔ تم بھی سنو۔ رپورٹ یہ تھی! کہ سن ۲۰۰۵ء کے مدِ نظر ہندوستان میں دو کروڑ پچاس لاکھ بچّے پیدا ہوئے جن میں ایک تہائی کمزور اور ستوانسے تھے۔ امریکہ میں یہ دَر صرف سات فی صد ہے۔ ہماری مرکزی حکومت صحت یابی خدمات پر کُل بجٹ کا دو فی صد ہی خرچ کرتی ہے۔ آگے پڑھا تو آنکھیں اور پھٹیں۔ لکھا تھا۔ پیارے ہندوستان میں ایک ہزار بچوں میں سے ۷۶ بچے اپنی پہلی سالگرہ اور ۱۱۵ بچے اپنی پانچویں سالگرہ نہیں دیکھ پاتے۔‘‘

’’خواتین کی حالت تو اور بدتر ہوگئی ہے، رشید جہاں بہن۔ میں پہلے بھی دنیا گھوم کر دیکھا کرتا تھا۔ اب بھی ادھر اُدھر گیا۔ دیکھا سمُوچا ایشیاء ہی نہیں بلکہ یورپ بھی اس کی زَد میں ہے۔ عورت کی قدر کہیں نہیں۔ رشید۔ تم نے تو علم وعمل سے بڑے جرأت مندانہ اقدامات اٹھائے تھے تاکہ عورت کو سماج میں اس کا جائز مرتبہ مل سکے۔ مجھے یاد آرہا ہے رشید کہ اپنے ایک مضمون میں تم نے کہا بھی تھا کہ ’’صرف باہر کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرکے وہ جب مردوں کے دوش بدوش زندگی کے تمام مشغلوں میں شامل ہوں گی تبھی وہ آزاد کہلائیں گی۔‘‘ لیکن جانتی ہو، اس آزادی کی وہ کِس طرح قیمت چکا رہی ہے۔ تم تو اپنے کاموں کے لئے اکیلی باہر نکلا کرتی تھیں۔ اتنی سخت مخالفت کے باوجود تمھارا ماشاء اللہ بال بانکا نہیں ہوا۔ لیکن آج کی خاتون تمھارے ان نقشِ

قدموں پر چل کر گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلی تو جانتی ہو اُس کے ساتھ کیا مسائل پیدا ہوئے۔ بالغ ہو یا نابالغ، بچی ہو یا ضعیف۔ اس کی عصمت محفوظ نہیں۔ اور جہاں عورت محفوظ نہیں، وہ دھرتی بھی محفوظ نہیں، ملک بھی، معاشرہ بھی، انسانیت بھی محفوظ نہیں۔ ہمارے مہان بھارت میں جانتی ہو رشید۔ ہر روز زِنا بالجبر کے ۴۱ معاملے درج ہوتے ہیں۔ ۱۹ خواتین کو جہیز کی خاطر موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ ۳۱ کا اغوا کیا جاتا ہے اور ۸۴ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ یہی نہیں ہر ۵۴ ویں منٹ میں ایک عورت کی عصمت دری ہوتی ہے۔ جس میں ہر سال ۲۰ فی صد کی در سے اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ محفوظ بھی ہیں تو انھوں نے بھی بد اعمالیوں کی مثالیں قائم کر دیں۔ ابتدائی تعلیم اور پنچائت راج کی زمہ داریوں میں ان کی شمولیت کی گئی تو غیر ذمہ دارانہ رویّہ انھیں لے ڈوبا۔ اب بھلا تم ہی سوچو۔ جب پورا نظام ہی درہم برہم ہو تو ملک اور سماج کے لئے یہ صورتِ حال شرمناک اور تشویشناک نہ ہوگی تو کیا ہوگی؟

آج کئی دلاریاں چھٹپٹا رہی ہیں۔ کئی نسیمائیں فکر مند ہیں۔ کئی سِلوِیائیں، کئی گُجریائیں تلملا رہی ہیں، مضطرب ہیں۔ معاشی و معاشرتی نظام کی بدعنوانیاں، ناہمواریاں، جبر، طبقاتی کشاکش اور درجہ بندی کی صلیبیں، ذات کا کرب، احساسِ تنہائی، جنسی نا آسودگی اور داخلیت کی شکست وریخت۔ انسانی شخصیت کی مختلف جہات مثلاً جسمانی، ذہنی، اخلاقی، جذباتی، سماجی اور روحانی جہات میں توازن کا غیر متوازن ہونا۔ اور پھر ورکنگ مڈل کلاس کا مادّی وسیلوں سے زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش میں بے رحم بھاگ دوڑ، اس کے نتائج ومسائل۔ اخلاقی تہذیبی صورتوں میں تبدیلی، سماجی ایجاب وقبول اور افکار کے ادب وآداب کی نئی تشکیل اور اس میں توازن۔ یہ اور ایسے ہی اور نکیلے اور چبھتے ہوئے سوالات ہیں جو ہم سے، تم سے، تمام ادیبوں سے، تمام دانشوروں سے جواب مانگ رہے ہیں۔ میں نے تقریباً اپنی تمام تحریروں میں اس بات پر زور دیا تھا کہ:

> ’’فنکار کی ذمہ داری ہے کہ انسانوں اور دماغوں میں جو تناؤ پیدا ہوتا ہے، اُن کا تخلیقی طور سے اظہار کرے جس کے معنی یہ ہیں کہ سماجی ونفسیاتی ارتقاء اور زوال کے عمل کی ماہئیت اور اندرونی کیفیت اور نازک پوشیدہ عمل اور ردِعمل سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا شعور حاصل کرے اور اُس مستقبل کا بھی اندازہ کرے جو اس دور میں سماجی ارتقاء کی منزل ہے‘‘۔ اس لئے ضروری تھا کہ انسانی زندگی سے قریب ہو کر اس کے فکر و عمل کی تشریح وتعبیر ہوتی۔ لیکن یہ تو انسانوں کو چھوڑ کر صرف تھیوریاں بنانے یا اُن سے ادب کو آنکنے میں لگے ہیں۔ ایوارڈ حاصل کرنے کی آرزو میں نہ جانے کن کن حربوں کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ اکیڈمیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تعریفوں کے پُل بندھوانے میں ایڈیٹرس کو کریدر ہے ہیں۔ اور وہ بھی خوشی خوشی بک رہے ہیں۔ پکڑ پکڑ

کر مضمون لکھواتے ہیں۔اپنے اپنے نقاد بھی پیدا کر لئے ہیں، بلکہ پال لئے ہیں۔ چند سنجیدہ اہلِ نظر ہیں جو اپنی تحریروں ،کوششوں و کاوشوں سے اِس آلودگی کو صاف کرنے میں کوشاں ہیں۔انھیں کے فکر و عمل پر اب تک اردو ادب کی بنیاد قائم ہے۔ ورنہ عہد ساز بننے کی ہوس نہ جانے کیسی کیسی تحریکوں کو جنم دے چکی ہے۔اور تحریکیں بھی کیا ہیں۔'' چبائی ہوئی غذا کی جُگالی''۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ ادب کی فکر کِس کو ہے۔ میں تو باقاعدہ پوجا پاٹھ کا دور دورہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ ہُوا کیا۔کل ہی میں نے دیکھا۔کسی سنجیدہ اہلِ ادب اہلِ نظر نے حق کی بات کہی تو بے چارہ اکیلا پڑ گیا۔ مجھے اپنا پُرانا دور یاد آ گیا۔'' کہاں گیا ادیبوں ،شاعروں کے درمیان کا اتفاق و اتحاد۔ کہ ایک کے ساتھ کئی کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

مجھے اس ضمن میں سید محمد عقیل کی یہ بات اچھی لگی کہ :

'' کیا ایسے میں ہمارے ادیب کبھی زندگی کی پنہائی اور اس کی مختلف الجہاتی کو سمیٹ سکتے ہیں۔کیا ادب کے بطون اور آگہی کی مختلف الالوانی کے عارف ہو سکتے ہیں۔؟

۔۔نہیں کبھی نہیں۔حالانکہ اس منفی اور مصنوعی رجحانات کی فراوانی اور بے پناہ کثرت کے باوجود اردو شاعری میں ایسی تخلیقات بھی جاری ہیں جن میں شاعری کی اصل روح ہے، جو مُثبت ہیں اور جن کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے اچّھے اور حسّاس شاعر اپنی عظیم ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں ہیں۔''

یہی حال فکشن کا بھی دیکھ رہا ہوں۔شہر پھلا پھولا ہے۔عصری حسیّت سے پُر۔لیکن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں تو دیہات نظر نہیں آتا۔ثقافت سے ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔شہری زندگی کے غلبہ نے موضوعات کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔نہ محبت کی کہانی ہے، نہ نفسیات کے گہرے غاروں سے گُہر نکالنے کی سعی۔عُجلت ہی عُجلت ہے۔ نقل میں، عقل میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں نام آوری اور شہرت کی بے صبری۔نہ عملی اقدامات ہیں ، نہ حوصلوں میں عزم، استحکام نہ ولولہ نہ جذبات کی شیرینی۔مٹھی بھر فنکار ہیں ،جن کی جدوجہد، کشمکش جاری ہے۔لیکن اس سے کیا ہوگا؟

میں اب دوبارہ آیا ہوں، تو بہت کچھ کرنا ہے۔غیر منظّم کو منظّم بنانے کے لئے پھر سے ایک تحریک کی بنیاد ڈالنا ہوگی۔ پھر سے اپنا قلم ، کاغذ لے کر، لکڑی کا اپنا پُرانا پھٹات ، رچھا کر کے لکھنے بیٹھوں گا۔نور ظہیر کی امّی صفائی کرنے آئیں گی تو جھنجھلا کر کہوں گا۔

'' کتنے مضامین لکھے تھے۔کسی نے بھی سنبھال کر نہیں رکھے۔اب ان کاغذوں کو نہ

چھیڑو۔فائلوں میں ترتیب سے جمع کر رہا ہوں۔شاید آنے والی نسلیں انھیں سنبھال کر رکھیں۔اور کچھ سیکھیں۔''

میں نے دیکھا۔نور ظہیر کونے میں کھڑی ، والدین کے اس عمل کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہیں۔اور شاید یہی سوچ رہی ہیں کہ'' اب امّی تو مسکراتی رہتی ہیں لیکن ابّا کو غصّہ کیوں آنے لگا۔''

☆☆☆

مارچ ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے، دراصل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی جانب سے اردو کی بستیوں پر خصوصی سیمینار کرایا گیا۔اس میں نہ صرف کئی جعلی لوگ شریک ہوئے ، بلکہ کئی جعلی لوگوں پر خصوصی مقالات لکھوائے گئے (اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے)۔میں نے بوجوہ اس تقریب میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی ،البتہ نارنگ صاحب کی فرمائش پر اپنا مضمون لکھ کر بھیج دیا تھا۔اب حال ہی میں میری ان سے ای میل کے ذریعے کچھ بات چیت ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ یہاں تو اسی فی صد شاعر اور ادیب جعلی ہیں۔(باقی بیس فی صد میں بھی کتنے ہیں جو جینوئن لکھنے والے ہیں اور کتنے ہیں جو بھرتی کے لکھنے والے ہیں، وہ ایک الگ موضوع ہے۔) یہاں مورخہ ۷/جون ۲۰۰۵ء کو یعنی ایک ہی دن میں ہونے والی ہماری برقی خط و کتابت کا متعلقہ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔میں نے اپنی ای میل میں لکھا:

''میں اردو کی نئی بستیوں کا قائل نہیں ہوں، یہ صرف جعلسازی کے گڑھ ہیں۔یہاں دولت کے بَل پر 80% جعلی لوگ شاعر اور ادیب بنے ہوئے ہیں۔یہ صورتحال اردو کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی اور بعض لوگ شاید یہی چاہتے ہیں''............اس کے جواب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے لکھا:

AZIZ-E-MAN ! I AGREE WITH YOU ENTIRELY THAT MOST OF THE PEOPLE CLAIMING TO BE WRITERS ARE NOT WRITERS AND ONLY 20% ARE GENUINE WRITERS. THAT EXACTLY IS WHAT I MEAN TO HAVE SOME ARTICLES ON THOSE GENUINE WRITERS.

یہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا، ان کی اس ای میل کے جواب میں اسی تاریخ کو میں نے پھر انہیں لکھا:'' آپ کے سیمینار میں باہر سے شامل ہونے والوں میں سے، یا جن پر مقالے لکھوائے گئے تھے کئی لوگ یا تو جینوئن لکھنے والے نہ تھے یا ان کی چوری اور جعلسازی کھلی ہوئی حقیقت تھی''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ خود اکثر بیرون ممالک کے ادبی دوروں پر جاتے رہتے ہیں اور اسی حوالے سے سیمینار بھی کرا چکے ہیں اور کسی بھی پاکستانی یا ہندوستانی ادیب سے کہیں زیادہ وہ ان'' بستیوں'' کی اصل ادبی اور علمی حقیقت جانتے ہیں۔سو ان کا ماننا کہ ان بستیوں میں صرف بیس فی صد جینوئن لوگ ہیں، سند کا درجہ رکھتا ہے۔(مکتوب **حیدر قریشی** مطبوعہ دوماہی **گلبن** لکھنؤ شمارہ جولائی، اگست ۲۰۰۵ء)

عبدالقیوم شمسی

سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک

سجاد ظہیر کا نام آتے ہی فوراً جو خیال دل میں آتا ہے وہ ہے ترقی پسند تحریک۔ یوں تو ترقی پسند تحریک کی نشو ونما میں، اور اسے مستحکم کرنے میں بہت سے لوگوں نے اہم رول ادا کیا مگر سجاد ظہیر کا نام اس تحریک سے ایسے ہی جڑا ہے جیسے کہ ''ایک سکّے کے دو پہلو۔'' یہ نہ صرف تحریک کے بانی تھے بلکہ معمار بھی تھے اور محتسب بھی۔ محتسب ان معنوں میں کہ جب جب ترقی پسندوں نے ذرا بھی شدّت اختیار کی، ادب میں مقصدیت اور فکر کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی، فن کو مجروح کرنا چاہا، ایسے میں سجاد ظہیر نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں سے چابک لگایا، خبردار کیا اور نصیحت دی۔

ترقی پسند تحریک کیوں شروع ہوئی اور اس کی ضرورت کیا تھی یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس کے لیے ایک طویل مضمون الگ سے درکار ہے۔ بہر حال ہم سجاد ظہیر کو تحریک کے حوالے سے دیکھیں گے۔ سجاد ظہیر جنھیں بنّے بھائی کے نام سے جانا جاتا ہے ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ کے ایک رئیس اور بااثر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا تعلق مشرقی یو پی کے ضلع جونپور سے تھا۔ دادا سید نظیر حسن جو کہ ایک بڑے زمیندار تھے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں سکونت پزیر ہوئے اور یہاں بھی ان کا شمار معدودے چند اُمراء میں تھا۔ والد سید وزیر حسن وکیل تھے، بعد میں جج بنے اور انگریزی حکومت نے انھیں 'سر' کے خطاب سے نوازا۔ ایک بھائی سائنس دان ہوئے تو ایک بھائی منسٹر۔ یہاں مقصد سجاد ظہیر کے خاندان کا قصیدہ پڑھنا نہیں، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا شخص کس طرح اس کام میں دلچسپی لینے لگا جس سے اس کا تعلق ہی نہ تھا۔ نہ مفلسی کا اسیر، نہ ظلم کی آنچ اور نہ ہی استحصال کا شکار۔ مگر جب سجاد ظہیر حصولِ علم کے لیے یورپ گئے تو دماغ کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی روشن ہونے لگیں۔ جس بات کا احساس انھیں ہندوستان میں نہیں ہوا تھا اسے لندن میں محسوس کرنے لگے۔ جب تک اپنے وطن میں رہے زمینداری اور سرمایہ داری کے آہنی اصول وضوابط کے بیچ پلے۔ جہاں پہلے ہی سے طے ہوتا ہے کہ کن کن لوگوں سے ملنا ہے اور کن کن سے نہیں۔ کس طرح کے لڑکوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور کھیلنا ہے اور کس کے ساتھ نہیں۔ یہ تفریق شرافت اور ایمان وایقان کے مدّ نظر نہیں تھی بلکہ نسل اور حیثیت کے تابع تھی۔

ایسے ماحول میں اپنے آس پاس کی تکلیفیں، ظلم وجَور، فاقہ کشی اور طبقاتی فاصلے سے ہم آہنگی نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر قدرت نے مزاج اچھا دیا تھا، طبیعت میں حساسیت تھی اور سینے میں دردمند دلِ دھڑکتا تھا۔ ایسے میں جب یورپ گئے تو وہاں پر ان کا سابقہ جرمنی سے نکالے گئے ان مظلوموں سے ہوا جو فاشزم کے شکار تھے۔ حق گو تھے اور آزادی پسند۔ سجاد ظہیر نے وہاں کے اخباروں میں یہ بھی دیکھا کہ ظلم کے قصّے کس طرح لذت اور چاشنی کے ساتھ بیان کئے جا رہے ہیں۔ 'یادیں' میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''یہ جو (مجھے) معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ مِٹ رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کے پیدا ہونے کے آثار ہیں، اُس کا نقشہ ہر گھڑی رہتا تھا۔ یہ اِس لیے نہیں کہ میں کوئی غیر معمولی سمجھ کا نوجوان تھا، اس لیے بھی نہیں کہ میرا دل دنیا کے دکھ کو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔۔۔ وہ وقت، وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا۔۔۔۔ ہم کو لندن و پیرس میں جرمنی سے بھاگے یا نکالے ہوئے لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں، ہر طرف سُنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جس میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ خوفناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے، جلاّد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہونے کے بارے میں اخباروں میں چھپتے۔ وہ اندوہ ناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا، پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراؤنی پرچھائیں ڈال رہا تھا، ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔''

ایسے میں ان کا ذہن اپنے وطن ہندوستان کی طرف چلا جاتا تھا، جہاں یورپ جیسی حالت تو نہیں مگر کچھ ایسی ہی تصویر ضرور تھی۔ غلامی، مظلومیت اور غریبی۔ یوروپی اخباروں میں ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے ظلم کو خوشی خوشی اور بہ اندازِ فاتح لکھا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کی کوئی وقعت نہیں تھی اور انھیں بدتہذیب اور بدشعور تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی بہترین عکاسی سجاد ظہیر نے اپنے ناولِٹ 'لندن کی ایک رات' میں کیا ہے۔ بہر حال یورپ کے فاشزم اور ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے سامنے، اُس وقت محض ایک نظریہ تھا جو ان سب پریشانیوں سے لوہا لے سکتا تھا اور وہ تھا (۔۔۔۔) ''اشترا کی نظریہ''۔ اشترا کیت کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ اُس وقت یہ نظریہ بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور مفکروں میں خاصا مقبول تھا اور سرمایہ داری نظام اور اس کے مظالم کے خلاف لوگ اسے کار آمد ہتھیار مانتے تھے، اس کا اثر سجاد ظہیر پر بھی ہوا۔ وہ لکھتے

ہیں۔

''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اوران کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبت اورآفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم مطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔''

(یادیں)

اور پھر سوشلزم سے متاثر ہوتا یہ ذہن، اور روشن ہوتے دماغ نے اپنے ہی جیسے چندان طلباء کو جو یورپ میں ہی زیرِ تعلیم تھے اور کم از کم انسانی مساوات اور وطن کی آزادی کے متعلق ہم خیال تھے سب کو اکٹھا کیا اور ایک انجمن کی تشکیل کی جس کا نام Indian Progressive writers Association رکھا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اس کے صدر اور سجاد ظہیر سکریٹری چنے گئے۔ یہ ساری کاروائی لندن کے ایک چینی ریستوراں 'نانکنگ' میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر کے علاوہ محمد دین تاثیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا وغیرہ نے اس نشست میں منظور اعلان نامہ پر دستخط کیے۔ سجاد ظہیر کی کوششوں سے لندن میں اس انجمن نے کئی نشستیں منعقد کیں۔ انھوں نے اپنا ڈرامہ 'بیمار' یہیں پڑھا۔

سجاد ظہیر اُس بین الاقوامی کانگریس میں بھی شریک ہوئے جو 'کلچر کے تحفظ' کے نام پر جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ہوئی۔ یہ ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں کی ورلڈ کانفرنس تھی جس میں ہینری باربس، آندرے مارلو، ٹامس مان، میکسم گورکی، روماں رولاں اور والڈو فرینک جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ پیرس میں ہی سجاد ظہیر کی ملاقات لوئی آراگاں سے ہوئی۔ سجاد ظہیر نے اس سے ترقی پسند تحریک کو ہندوستان میں شروع کرنے کی بات کہی اور ادیبوں کی تنظیم کے تعلق سے سوال پوچھا۔ لوئی آراگوں نے جو جواب دیا اُسے ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے کہا۔

''یہ نہ پوچھئے! ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر دنیا میں اور کسی جماعت کی تنظیم نہیں۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ زمانے کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی حفاظت اور ترقی کے لیے تنظیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔''

(یادیں)

اور دُھن کے پکّے 'بنّے' بھائی نے اس مشکل کام کو کرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا کیونکہ آراگاں نے جو نصیحت کی تھی اس کا آخری حصہ یہ خوش خبری دے رہا تھا کہ اب وہ حالات ہیں کہ جس میں ادیب وشاعر اپنی انانیت پر دنیا کے مسائل کو ترجیح دیں گے۔ اور پھر سجاد ظہیر نے لندن میں منظور مینی فسٹو کو ہندوستان میں اپنے دوستوں کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیا کہ -- ''اسے بزرگ اور معتبر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے سامنے پیش کر کے ان کے خیالات جانے جائیں اور کوشش کی جائے کہ لوگ اس سے اتفاق کریں اور اس پر دستخط کر دیں۔'' اس نیک کام میں سجاد ظہیر کو مایوسی نہیں ہوئی۔ مینی فسٹو پر سب سے پہلے جن تین بہت اہم اور بزرگ شخصیتوں نے اپنی مُہر لگائی وہ تھے مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی۔ انھیں لوگوں کے ساتھ ''زمانہ'' کانپور کے مدیر منشی دیانارائن نگم نے بھی اس پر رضامندی درج کی۔ یہ سارے کام الہ آباد میں سجاد ظہیر کی موجودگی میں طے پائے اور اس کے بعد سجاد ظہیر، رشید جہاں کے ساتھ پنجاب کے لیے روانہ ہو گئے کہ اُس ادب خیز زمین پر بھی تحریک کا پودا لگایا جائے۔ الہ آباد میں انھوں نے اپنے پیچھے احمد علی، فراق گورکھپوری اور پروفیسر اعجاز حسین کو بطور نائب سمجھا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر اشرف، امرتسر میں محمود الظفر، کلکتہ میں ہیرن مکھرجی اور حیدرآباد میں سبطِ حسن اس کام کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

سجاد ظہیر کی کوششوں سے اپریل ۱۹۳۶ کا وہ تاریخی دِن بھی آیا جس روز ادب نے اپنا رشتہ سماج اور سیاست سے جوڑا اور ادیب سے کہا گیا کہ وہ اپنے انفرادی مسکن سے باہر نکلے اور بذریعہ قلم وفکر عوام اور سیاست کی رہنمائی کرے۔ ایسا نہیں ہے کہ ابھی تک ادیب وشاعر بے حس و بے نوا تھا، انفرادی طور پر ہر دور میں اور بیشتر زبان میں ایسی کوششیں ہوتی رہی تھیں، مگر ہندوستان میں جو کہ مختلف اللسلان ملک ہے کسی ایک بینر کے نیچے منظم اور شعوری طریقے سے یہ کام پہلی بار ہو رہا تھا جس کا سہرا سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء کے سر پر بندھتا ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ادب کو عوامی مسائل کا ترجمان بنایا جائے۔ ابھی تک ادب خیالی دنیا کی سیر کراتا تھا، آہیں بھرتا اور بھرواتا تھا، قصیدہ خوانی کرتا اور حیرت انگیز واقعات کو مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعہ کرتب دکھا کر قاری کو مسحور کرتا تھا۔ یہ رجحان ادب پر غالب تھا مگر اس تحریک نے اس کا رُخ موڑا اور اب اسے غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور مظلوموں کی بھی طرف دیکھنا تھا۔ ان کے فاقوں کو دیکھ کر سسکنا تھا اور ظلم کے گھاؤں کو دیکھ کر سہرنا تھا۔ یہ محض نقل اتارنے کی بات نہ تھی بلکہ اسے دل سے محسوس کر کے، اس سے نجات پانے میں فکری طور پر اُن کی مدد کرنی تھی۔ اپنی تخلیق اور شاعری میں اسے جگہ دینی تھی، اور ہوا بھی یہی لیکن یہیں ادب، برائے ادب ہو کہ برائے زندگی کے مسئلے پر اختلاف بھی شروع ہو گیا۔ ترقی پسندوں پر یہ الزام عائد ہونے لگا کہ وہ مقصد کو پورا کرنے کے لیے فن کا ریزہ ریزہ کر رہے ہیں۔ میں نے شروع ہی میں کہا کہ سجاد ظہیر صرف بانی ہی نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً محتسب بھی تھے اور بوقت ضرورت تنبیہ بھی کیا کرتے تھے۔ جب ترقی پسندوں میں

مقصدیت نے زور پکڑا تو سجاد ظہیر نے لکھا کہ۔

''شاعر کا پہلا کام شاعری ہے۔ واعظ دینا نہیں۔ اشتراکیت وانقلابیت کے اصول سمجھانا نہیں۔ اصول سمجھانے کے لیے کتابیں موجود ہیں، اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔ شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے۔ اگر وہ اپنے تمام ساز وسامان تمام رنگ وبو، تمام ترنم وموسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا، اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا، اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے سے قاصر ہوگا تو اچھے سے اچھے خیال کا بھی وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر زمین میں ہوتا ہے۔'' (غلط رجحان شاہراہ)

یہ ہے سجاد ظہیر کا وہ خیال جس کے لیے غیر ترقی پسند بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ فن اور مقصد کو لے کر سجاد ظہیر انتہا پسند نہیں تھے وہ دونوں کا خوبصورت امتزاج چاہتے تھے۔ ان کا بہترین اخلاق، انکسار اور خوش گفتاری انھیں ہر دل عزیز رکھتی تھی اور یہ ہر دل عزیزی تنظیمی امور میں ان کی مددگار ثابت ہوئی۔

بہر حال سجاد ظہیر نے اپنی کوششوں، قربانیوں اور اپنی صلاحیت سے تحریک کو ایک مالی کی طرح سینچا اور عوام الناس کی بھلائی کے لئے جدو جہد کرتے رہے۔ یہ غریب کسانوں اور مزدوروں سے محبت ہی تھی کہ مصیبتیں برداشت کرتے رہے، جیلوں میں بند ہوتے رہے، نئی نویلی دلہن اور معصوم بچوں سے جدا ہوتے رہے مگر اپنے علم، اپنے عمل اور تنظیم وتحریک کے ذریعہ ان کی فلاح کے لیے کوشاں رہے۔ ہمیشہ لوگوں کے آنسو پونچھنے کی خواہش رکھنے والے ہر دل عزیز بنے بھائی، ترقی پسند تحریک کے جسم یعنی سجاد ظہیر ۱۳ستمبر ۱۹۷۳ء کو خود دوسروں کو رُلا گئے۔

☆☆☆

''بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے اور جب حالؔی، شبلؔی، اقبالؔ بھی ترقی پسند ہیں تو پھر آخر ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سوال ایسا ہے کہ جب دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک پھول کھلتے رہے ہیں تو باغ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس انجمن کی ضرورت اس وجہ سے پیدا ہوئی جس وجہ سے تمام دوسری انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی یہ کہ افراد اجتماعی طور سے ادبی مسائل پر گفتگو اور بحث کریں، فرد اور جماعت کی ضرورت کو سمجھیں، سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ کیا یہ اجتماعی کوشش انفرادی کوشش سے بہتر نہ ہوگی؟

(سجاد ظہیر کا خطبہ

ترقی پسند مصنفین کانفرنس، حیدرآباد ۱۹۴۵ء)

بات چیت: علی احمد فاطمی (الہ آباد)

فراقؔ سے انٹرویو

سجاد ظہیر کے حوالے سے

فراقؔ گورکھپوری سے انٹرویو لینے جب میں ان کے دولت کدہ پر پہنچا تو خلاف امید وہ اس دن کچھ زیادہ ہی بشاش نظر آرہے تھے۔ مجھے قدرے تسکین ہوئی۔ کیوں کہ فراقؔ صاحب سے اس طرح کی باتیں کرنے کے لئے ان کے موڈ کو دیکھنا اور پھر اس کو بنانا پڑتا ہے۔ وہ گدے دار کرسی پر دراز تھے۔ کنگ سائز سگریٹ ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھی ہوئی تھی اور اخبار زانوں پر پھیلا ہوا تھا۔

حسب عادت انھوں نے شعبہ انگریزی کی خیریت پوچھی، الہ آباد یونیورسٹی کا حال جانا اور پھر ادھر اُدھر کی باتوں میں گم ہوگئے۔ میں نے ماحول خوش گوار پایا اور مقصد کی طرف رجوع ہوتے ہوئے بات چھیڑ دی۔

حضور! آپ سے سجاد ظہیر کے سلسلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ کو اگر زحمت نہ ہو تو-----''

''کیوں بھئی خیریت تو ہے--- کیا ریسرچ کا موضوع بدل دیا ہے۔''

نہیں نہیں دراصل بات یہ ہے کہ حیاتؔ کا سجاد ظہیر نمبر نکل رہا ہے اسی نمبر کے لئے سجاد ظہیر کے بارے میں آپ کے کچھ تاثرات جاننا چاہتا ہوں۔

''ارے بھئی-- اب یاد رفتگاں کی بھی طاقت نہیں رہی--- اسی ۸۰ سال کا ہو گیا ہوں، میرا بھائی تو ۶۱ سال میں چل بسا، دوسرا بھائی بیمار چل رہا ہے۔'' انھوں نے یہ جملے بڑے دکھ کے ساتھ ادا کئے اور پھر بولنے لگے۔

سجاد ظہیر، سر وزیر حسن کے لڑکے تھے۔ ان کے والد کچھ طبقاتی کمزوریوں کے باوجود ایک عظیم آدمی تھے۔ الہ آباد کے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کے یہاں سے آمد و رفت تھی۔ بس انھیں کے ذریعے سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی۔ شروع شروع میں سجاد ظہیر سے کم ان کے دوسرے بھائیوں سے زیادہ اچھے تعلقات رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اپنے آپ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرا ذہنی جھکاؤ سجاد ظہیر کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ بعد میں تو سجاد ظہیر سے ایسے تعلقات ہوگئے کہ میں انھیں کلیجے کا ٹکڑا سمجھتا رہا۔-- بڑا افسوس ہوا مجھے ان کے انتقال کا۔''

سوال:۔ ''جی ہاں، سجاد ظہیر کا انتقال یقیناً ایک سانحہ تھا۔ آپ کو سجاد ظہیر صاحب میں کیا پسند آیا۔ ان کی شخصیت یا

تحریر---؟''

کانپتے ہوئے ہاتھ پیالی کی طرف بڑھے۔ چائے تھرتھرا اٹھی اور آخری گھونٹ ان کے حلق تک جا پہونچا، سگریٹ بجھ چکی تھی، انھوں نے اس کو دوبارہ جلایا اور ایک طویل کش فضا میں تیر گیا۔ اور وہ کہنے لگے۔

جواب:۔ ''بھئی-- سجاد ظہیر کی شخصیت ان کی تمام چیزوں پر بھاری تھی۔ ظہیؔر میں ایک عجیب مقناطیسی کشش تھی، اتنا پیار، اتنا اخلاص اور اتنی مسکراہٹ میں نے آج تک کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی-- ایک عجیب شکل میں لوگ ان کے بارے میں محسوس کرتے اور سوچتے تھے کہ کیا دلکش چیز ہے یہ سجاد ظہیر بھی۔ سجاد ظہیر نے اگر چہ لکھنے پر زیادہ زور نہ دیا۔ مگر مجھے ان کی تحریر زیادہ پسند ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سجاد ظہیر ایک نہ تھے بلکہ دو تھے۔ پہلے Lover اور دوسرے Lover Worker وہ ادیب کی حیثیت سے زیادہ رہے اور Worker وہ عوام میں رہے۔

سوال: فراقؔ صاحب، جب آپ ان کی تحریر کو اس قدر پسند کرتے ہیں تو آپ کو ان کی تخلیقات میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند آئی ؟''

جواب: ''حافظؔ پر ان کی کتاب میرے خیال میں سب سے اچھی ہے جو ان کی شعر فہمی اور سخن فہمی کی صلاحیتوں کی زبردست مثال ہے۔''

سوال: ایک بات اسی سلسلے میں آپ سے اور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے ان کی شعر فہمی اور سخن فہمی کی صلاحیت کو تسلیم کیا ہے تو آپ کی شاعری کے بارے میں کبھی سجاد ظہیر صاحب نے اپنی ناقدانہ رائے اپنی تحریر یا تقریر میں ظاہر کی یا آپ سے کبھی اس بارے میں زبانی بات چیت کی ہے۔ انھوں نے کیا رائے دی ؟''

شاید یہ سوال دلچسپ تھا بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔

جواب:۔ ''مجھے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کے اتنے بڑے قدر شناس اور قدر دان شاید ایک دو ملے ہوں جتنے بڑے قدر دان سجاد ظہیر تھے۔ میرے ایک مصرعہ کو ایک بار میرے ہی اوپر چسپاں کر دیا

ع میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن

اور سجاد ظہیر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا۔ ''فراقؔ تم ایسا وقت ہو جس کا گھٹنا ممکن نہیں۔'' سخن فہمی میں بنے کے برابر کم ہی لوگ ہوئے ہیں۔ حافظؔ پر ان کی کتاب اس بات کا ثبوت ہے۔ بہت سے ترقی پسندوں میں، میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ وہ ہر ادبی تخلیق میں کوئی پیغام یا سیاسی تحریک ڈھونڈتے ہیں۔ سجاد ظہیر اس نقطۂ نظر سے بہت بلند تھے اور اسی بات نے ان کو حافظؔ کا اتنا پرستار بنا دیا۔ خود میری شاعری میں کہیں پیغام ہے اور وہ مقصدی بھی ہے لیکن زیادہ تر خالص جمالیاتی ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا ہے میری نظم ''شام عیادت'' کا سب سے پہلا ریویو ظہیر نے اپنے اخبار میں کیا۔ اسی سے ان کی سخن فہمی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے میری شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ ''فراقؔ کے بعض اشعار نشتر ہوتے ہیں اور بعض بلا وجہ استادی کے لئے کہے

ہیں۔'' میں نے یہ جملہ پڑھا تو چالیس ۴۰ شعر کہہ کر بھیج دئے اور لکھ دیا کہ جو چاہو کاٹ دو جو چاہو چھاپ دو۔ انھوں نے پوری غزل چھاپ دی۔ ایک شعر اسی غزل کا یاد آرہا ہے، لکھ لو۔

کسی نے نیم نگاہی سے مجھ کو دیکھا تھا یہ زندگی ہے اسی زخم نا تمام کی یاد

اس کے علاوہ میری بعض دوسری غزلیں بھی ان کو بہت پسند تھیں۔ خاص طور سے میری اس غزل کو بہت پسند کرتے تھے۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اور یہ شعر تو ان کو بہت ہی پسند تھا

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں

سوال:۔ سجاد ظہیؔر کے بارے میں کچھ اور بتائیے آپ تو ان سے بہت قریب رہے ہیں۔''

جواب: سجاد ظہیر میں کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ وہ کسی معاملے میں چھوٹے پن کے ساتھ قطعی نہ سوچتے تھے۔ آج تک کوئی خوردبین ایجاد نہیں ہوئی جس سے ان کی شخصیت میں، ان کے عمل میں، ان کے نظریے میں چھوٹا پن نظر آسکے۔ لڑکپن میں لیڈری اور دلفریبی کی ہر آن ان کی پیشانی پر تھی۔ ذرا سی دیر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کرنا ان کے لئے بہت آسان تھا۔ لکھنؤ کی راتیں سجاد ظہیر کے سلسلے میں یادگار رہیں گی۔ آج تک میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس سے اچھا آدمی میں نے اپنی زندگی میں دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ میرے اچھے دوستوں میں مجنوںؔ اور جوشؔ رہے لیکن اتنی کشش ان دونوں میں بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ جواہر لال نہرو، موتی لال نہرو، یا کسی بڑے آدمی میں بھی میں نے ایسی بلا کی کشش نہیں پائی۔ ایسی ہر دل عزیز شخصیت کا دشمن ہونا اس آدمی کے لئے بھی ممکن نہیں جو اس کا دشمن ہو۔''

''بس حضور! ایک چھوٹا سا سوال اور عرض ہے۔''

''پوچھو بھئی۔'' انھوں نے کچھ مخمور انداز میں کہا۔

''جس وقت آپ نے سجاد ظہیر کے انتقال کی خبر سنی تو آپ کا کیا ردعمل رہا۔''

''جب میں نے سجاد ظہیر کی موت کی خبر سنی تو بہت غمگین ہو گیا۔ بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا، ایک نہایت قابل قدر ہندوستانی اور ایک بہت اچھا دوست اور ایک Born and Highly gifted Leader اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔

باتیں تو شاید اور بھی ہو سکتی تھیں لیکن اب میں ان کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ کیوں کہ اب وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آرہے تھے۔ اس لئے اجازت لے کر رخصت ہوا۔ ☆☆☆

جگن ناتھ آزاد

بنے بھائی

کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
نہ مرا بھائی نہ رشتے کا عزیز
نہ ملاقات تھی ہر روز کی اُس سے

اُس کو جس رنگ میں دیکھا وہ بھلا لگتا تھا
کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
کیوں مرے دل پہ ہے اک بوجھ سا اس وقت آزاد
جنس نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں
لوگ کہتے ہیں شرافت میں وہ لا ثانی تھا
اور انساں بھی ہیں جن میں اسی خوبی کی فراوانی ہے
لوگ کہتے ہیں وہ سچّا تھا کھرا تھا دل کا
اور انساں بھی ہیں سچّے بھی کھرے بھی دل کے
لوگ کہتے ہیں سخنور تھا وہ تھا نثر نگار
اس کا تھا مشرق و مغرب کے ادیبوں میں شمار
لیکن اس دور میں

شاعر ہو کہ ہو نثر نگار
جس میں ہو اسکی کمی کون سا ایسا ہے دیار
کس لئے اُس کا تبسم مجھے یاد آتا ہے
مسکراتا ہوا چہرہ اس کا
بات کیا ہے کہ مری آنکھوں سے ہٹتا ہی نہیں
اس کے چہرے سے حسیں تر چہرے
دیکھے ہوں گے مری آنکھوں نے نہ جانے کتنے
مگر اس وقت کوئی یاد نہیں
فقط اس وقت وہی چہرہ مرے سامنے ہے
کیا وہ یاد آتا ہے لہجے کی حلاوت کے سبب
اپنے بہتے ہوئے دریائے محبت کے سبب
یہ محاسن مگر اوروں میں بھی اکثر ہوں گے
بات کیا ہے کہ تصور اس کا
چشم مشتاق سے ہٹتا ہی نہیں
اتنی باتوں میں کوئی بات یہ مانا نہ سہی
پھر بھی کوئی بات تو ہے
جو سمجھ میں میری آئی ہی نہیں
اور میں سوچتا ہوں
کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
کیوں مرے دل پہ ہے اک بوجھ سا اس وقت آزاد
جنس نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں

☆☆☆

سجاد ظہیر

آج رات

آج رات تم آئی ہوتیں
جاڑا اور اندھیرا ہم نے،
چھوٹے سے کمرے سے اپنے
بالکل باہر پھینک دیا تھا
ویسے جیسے روز صبح کو
جھاڑو دے کر،
مٹی، گرد اور ایش ٹرے کی
راکھ نکالی جاتی ہے
دوستوں کی سانسوں کی گرمی
باتوں کی رو
پگھل رہی تھی
سگریٹ کے خاموش دھوئیں میں
ذہن ہمارے جھمک رہے تھے
اپنے کو ہم بھول گئے تھے
کب آخر کب
دیس ہمارا اونچا ہوگا؟

ہندی، اردو، پنجابی کب
دودھ میں شکر ہو جائیں گی؟
بھارت ماں کی ممتا
کب پروان چڑھے گی؟
کب انمول انوپ رتن
ساہت کے ہم
چرنوں میں اس کے بھینٹ کریں گے؟
اس یگ کے کب
کالی داس، کبیر، میر
میرا، تلسی
وارث، غالب
چمکیں گے آکاش پہ اپنے؟
گھونگھٹ کاڑھے، آنکھ چرائے، چھم چھم کرتی
سب کے دل کی رانی، کوتیا،
کب آئے گی؟
نوجیون کی اوشا کی لالی
برکھا بن کر
برسے گی کب
دھرتی پر؟
دور بہت ہی دور سہی تم،
بس ایک رات کو،
تھوڑی دیر کو،

دوستوں سے،ہم پھر یہ کہتے

''ان سے ملئے

یہ آشا ہیں،

آج ہمارے پاس رہیں گی،

کل بھارت کے ہر آنگن میں

ان کے گیت کا رس ٹپکے گا

اوران کے گھنگھرو کی چھن چھن

سب کے من میں سنائی دے گی!

اوران کی بانی کا امرت

ہم سب کو پینے کو ملے گا

اور یہ دکھ کی ماری دھرتی

کروٹ لے کر جاگ پڑے گی

دیس ہمارا اونچا ہوگا!''

آج رات تم آئی ہوتیں

دور بہت ہی دور سہی تم

آجاتیں،بس ایک رات کو

تھوڑی دیر کو!

☆☆☆

سجاد ظہیر

ویتنام-----زخموں کا باغ

جب تم اپنے پھول جیسے بچوں کو

سکھ کی نیند سوتے دیکھو

جب پرسکون دل سے

فرصت کے اوقات میں

دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر

تم ادھر ادھر کی/غیر اہم دلچسپ گفتگو کرو

جب تمہارے دل کی دھڑکن کی گونج

دنیا جہان کے/سب سے اچھے

سنگیت کی طرح

اس دوسرے سینے سے بھی

سنائی پڑے/اور تمہیں ایسا لگے

کہ سب آسمانی دروازے/کھل گئے

اوراچانک تم پرنور کی بارش

ہونے لگی

اور جب تم امن واماں کے

روپہلے ماحول میں

محنت کے خون کی گردش کو

دور دور تک پھیلی ہریالی
اور کنک کی سنہری بالیوں
کارخانوں فیکٹریوں اور ملوں
اور راتوں کی تنہائی میں
کام کرنے والے سائنس دانوں کی
بنائی ہوئی چیزوں میں/ بدلتے دیکھو
اور شاعروں، ادیبوں اور کلاکاروں کی
رچناؤں سے
تمہارے سپنے میں
رنگ سنگیت اور خوشبو کی لہریں
اٹھنے لگیں/ تب اس سے
ایشیا کے اس چھوٹے سے ملک
ویت نام کے بارے میں سوچو
جہاں ہمارے ہی دیش سے
شاکیہ منی کے بھکشو
اس مشقت، محنت اور سنگھرش
کے پسینے سے نمی حاصل کرتے ہیں
جو گرے ہوئے مظلوم انسانوں کو
آسمانی بلندیوں تک
پہونچانے کے لئے/ رکی جاتی ہے
وہاں۔ اس زخموں کے باغ میں
آج ایسے ہی لہو رنگ پھول کھلے ہیں

فولادی ارادوں کی
سخت اور مشکل چٹانوں کی
تلوار سے زیادہ تیز بلندیوں پر نکلے
نایاب پھول!
مہیب، اندوہناک، اندھیروں کی ہار
اور انسان کے طربناک/ عروج۔ ضمانت!
پریم اہنسا اور کرونا کا سندیش
لے کر گئے تھے
اور جہاں آج
ہزاروں میل سے آئے
منحوس فوجی قدموں نے
ماؤں سے ان کی مسکراہٹ
اور سب لوگوں سے
ان کی خوشی چھین لی ہے
اور جیون کے سوتوں میں
زہر گھول دیا ہے/ لیکن سینے کے زخم
کبھی کبھی پھول بھی بن جاتے ہیں
بیش بہا، پاک پھول
جب وہ آزادی کے سورج سے روشنی
رفاقت اور محبت کی
دہکی آگ سے گرمی (پاتے ہیں!)

☆☆☆

سجاد ظہیر

سر آمد روزگارے

انسان کے کردار کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا رخ کس طرح متعین ہوتا ہے یہ بے حد پیچیدہ سوال ہے، جبلت اور پیدائشی خصلتیں، تعلیم و تربیت، سماجی ماحول، قومی، طبقہ داری اور خاندانی روایات و ثقافت، شعور و تحت الشعور کا عمل، ہمارے کردار ان سب کا مرکب اور ان سب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس بھول بھلیاں میں کیسے متعین کیا جائے کہ کسی شخص نے زندگی کی ایک راہ کیوں اختیار کی اور دوسری کیوں نہیں؟ بہر حال اس قسم کا تجزیہ اور تشریح ماہروں کا کام ہے۔ بالوجی، نفسیات، سماجیات اور تعلیم کے ماہروں کا کام، ورنہ عام طور پر ہم انسانوں کو ان کے کردار، افعال اور اعمال اور ان سب کے نتائج سے ہی جانچتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح جانچنے میں خود جانچنے والوں کے ساتھ ساتھ یہ پیمانے بھی بدلتے رہتے ہیں، زندگی کے متعلق ان کے اپنے نکتۂ نظر اور نصب العین کی بھی اہمیت ہوتی ہے، نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مخصوص تاریخی عہد یا دور میں سماج کے مختلف طبقوں یا گروہوں کے بالکل مختلف بلکہ متضاد پیمانے یا نصب العین ہوں۔ مثال کے طور پر ہم اردو، فارسی ادب پر ہی نظر ڈالیں تو اس میں صدیوں سے یعنی تقریباً آٹھ سو سال سے، یہ بات نظر آتی ہے کہ احمق، جاہل اور ظالم حکمرانوں، قاضی، کوتوال، سنگدل ناصحوں، کوڑھ مغز عالموں اور مدّرسوں، ریاکار عابدوں اور زاہدوں کی سخت مذمت کی گئی ہے، ان کا مذاق اڑایا گیا ہے، اس پورے گروہ کے ماخوذ کئے ہوئے قوانین اور ان کے عائد کئے ہوئے اخلاقی اصولوں کو برتنے کی نہیں بلکہ توڑنے کی ترغیب دی گئی ہے، شریعت کی جگہ طریقت، ظاہری علم کی جگہ اندرونی و باطنی علم و عرفان، ظاہرداری کی جگہ سچائی اور اصلیت تک پہونچنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ قیصر روم کے قوانین کی مذمت کی گئی اور عزت اور پرورش کی گئی رومی قانون کے مطابق صلیب پر چڑھا دیئے جانے والے عیسیٰ ابن مریم کی۔ حسین ابن علی نے خلیفۂ وقت یزید ابن معاویہ کی بیعت کرنے سے انکار کیا اور وہ اس ''جرم'' کی سزا میں قتل کر دیئے گئے لیکن عام مسلمان اب بھی شہید کربلا کا سوگ مناتے اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔۔ منصور حلاج، انا الحق کا نعرہ لگانے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا لیکن ہمارے شاعروں کی نظر میں وہی آج تک سچائی کے لئے جان دینے والوں کی سب سے درخشاں مثال ہے۔

زندگی کے یہ متضاد اور مختلف پیمانے کیوں اور کیسے بنتے ہیں اور ہم اپنے لئے ان پیمانوں کو کیسے اور

کیوں چنتے ہیں، کیوں ہم ایک خاص ہی راستہ انتخاب کرتے ہیں اور دوسرا نہیں، سماجی اور انفرادی عمل کے محرکات کیا ہیں اور کیسے۔ انسانی تاریخ کی رفتار کا بھی کوئی قانون ہے یا یہ محض حادثات کا مجموعہ ہے، یا پھر کوئی انجانی غیبی، الوہی یا شیطانی قوت، پردے کے پیچھے تمام تاروں کو اپنے ہاتھ میں سمیٹے، ہمیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی رہتی ہے؟

ایک بات ظاہر اور صاف ہے کہ ہر حساس اور سمجھدار انسان کے شاہراہ حیات پر گزرتے وقت، بار بار اور مسلسل ایسے موقع آتے رہتے ہیں۔ جب اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مختلف اور نو بہ نو مسائل کے پیش آنے پر وہ کون سا رخ اختیار کرے، کس پیمانے سے اپنے یا دوسروں کے اعمال و افعال کو جانچے اور خود اپنے لئے آگے بڑھنے کی لئے کون سا راستہ اختیار کرے۔ اکثر یہ راستے واضح نہیں ہوتے، یا ہم خود اپنے ماحول، عادات، طبقات تعصّبات اور جبلتوں کے زیر اثر، جیسے آنکھ بند کئے، بغیر شعوری طور پر ایک خاص ڈھرے پر چلتے چلتے زندگی کا سارا سفر طے کر جاتے ہیں اور یہ احساس تک نہیں کر پاتے کہ ہمارے سامنے ایسے موقع بھی آئے تھے جب کہ ہم شعوری طور پر اپنا راستہ خود چن سکتے تھے، لیکن ہم نے اسے اختیار نہیں کیا۔

میں جب اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس عمر میں جب کہ میرا شعور تھوڑا تھوڑا بیدار ہونا شروع ہوا تھا، میں اسکول میں پڑھتا تھا اور میری عمر پندرہ سولہ سال تھی، تب ہمارے ملک میں آزادی کی ایک بڑی لہر اٹھی تھی، نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک ابھری اور پھر حب وطن کی اس لہر نے مقناطیس کی طرح مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں نے اوپر چند سطریں اپنے گھرانے کے ماحول کے متعلق لکھی۔ اس سے شاید پڑھنے والوں کو یہ گمان ہو کہ ہمارے گھر کا ماحول بالکل امیرانہ اور سرکاری تھا لیکن واقعہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے ہندوستانی مختلف ذہنی اور نفسیاتی سطحوں پر زندگی بسر کرتے تھے یعنی ایک طرف انگریزی سرکار کی ملازمت لیکن ساتھ ہی اس کے کالے کرتوتوں سے سخت بیزاری بھی۔۔۔ جب نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکیں دھیمی ہوتی ہوتی ختم ہوگئیں اور انگریزی راج ویسا کا ویسا ہی بنا رہا، ہندو مسلم اتحاد کی جگہ ملک میں فرقہ پرستی کا زور ہوا، شدھی اور تنظیم کی زہریلی تحریکیں ابھریں تو مجھ پر اور میرے ایسے بہت سے نیشنلسٹ نوجوانوں پر سخت غم اور غصہ طاری ہوا۔ ہم اب لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور یہ سوچنے لگے تھے کہ گاندھی جی کا بتایا ہوا راستہ غلط تھا، بنگال کے نوجوانوں نے انقلابی تشدد شروع کر دیا۔ نوجوان انقلابی انگریز افسروں پر بم پھینکنے اور گولیاں چلانے لگے۔ کانپور میں ڈانگے، مظفر احمد، شوکت عثمانی، ایم این۔ رائے کمیونسٹ سازش کے مقدمے میں ماخوذ ہوئے، ہم ان کی خبریں اخباروں میں پڑھ کر سوچنے لگے شاید آزادی حاصل کرنے کا یہی صحیح راستہ ہے، کوئی چیز صاف نہ تھی، خیالات، تصورات، نظریئے، سب آپس میں گڈمڈ تھے، سمجھ کی افق پر دھندلکا تھا۔ صرف ایک چیز یقینی تھی کہ دل میں ایک جوالا سی بھڑک رہی تھی۔ لیکن آزادی کی اس منزل پہ کیسے پہنچا جائے جو اس تمام دکھ درد کا علاج تھی!

یہ تھی میری کیفیت جب میں ۱۹۲۷ء میں انگلستان پہنچا---- رفتہ رفتہ میری ملاقات لندن میں رہنے والے ان ہندوستانیوں سے ہوئی جو وہاں کی انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ سے متعلق تھے، زندگی میں پہلی بار مجھے بغیر کسی رکاوٹ کے مارکس اور لینن کی کتابیں اور دوسرا انقلابی لٹریچر خریدنے اور پڑھنے کو ملا، ہندوستان میں یہ چیزیں غیر قانونی تھیں--- اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ آکسفورڈ میں ہندوستانی طلبا کی انجمن آکسفورڈ مجلس کا میں صدر تھا اور اس حیثیت سے مجھے برلن سے ایک خط ملا کہ گرمیوں میں جرمنی کے شہر فرانکفرٹ میں عالمی اینٹی امپریالسٹ عالمی سامراج مخالف کانگریس ہونے والی ہے، اس کانگریس کے منتظمین نے آکسفورڈ کے ہندوستانی طلبا کی انجمن سے دو نمائندوں کو شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ جب میں نے اس خط کو مجلس کے ایک جلسے میں پیش کیا تو سب کو سانپ سونگھ گیا کیونکہ زیادہ تر طلبا خوفزدہ ہو گئے کہ اس کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد ہندوستان میں ان کو سرکاری نوکری ملنے کے امکانات پر تو بالکل ہی پانی پھر جائے گا۔ جب سب چپ رہے تو میں نے کہا کہ میں مجلس کا نمائندہ ہو کر اس کانگریس میں شریک ہونے جرمنی جاؤں گا، کسی کو کوئی اعتراض ہے؟ سب پھر بھی چپ رہے۔ چنانچہ میں نے اپنے تئیں خود کو ڈیلیگیٹ نامزد کیا!

آکسفورڈ میں ولیمسن نام کا ایک ریٹائرڈ آئی سی ایس ہندوستانی لڑکوں کی نگرانی کے لئے تھا، میرے جرمنی جانے سے پہلے اس نے مجھے بلایا اور سختی سے کانگریس میں جانے سے منع کیا اور کہا کہ میں اس میں شریک ہوں گا تو میرا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ میں نے ان کو نہائت سنجیدگی سے جواب دیا کہ ولیمسن صاحب کو میرے مستقبل کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں مجلس کا نمائندہ چنا گیا ہوں اور اپنا فرض پورا کروں گا۔ ان کا چہرہ لال ہو گیا، زیرِ لب کچھ بڑبڑائے، میں اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد مجھے اپنے والد کا ایک خط ملا، انھوں نے مجھے لکھا کہ انھوں نے سنا ہے کہ میں فرانکفرٹ کی کانگریس میں شریک ہونے جا رہا ہوں تو بہتر ہے کہ میں نہ جاؤں، میں سمجھ گیا کہ یہ ولیمسن صاحب کی کارستانی ہے، لیکن اب اپنے مستقبل کے متعلق ان مشفقانہ مشوروں سے آگے نکل چکا تھا۔

حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرش راہ
پر کوئی مجھ کو یہ سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ؟

☆☆☆

''میرے ایک مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ ترقی پسندوں نے ادبی مارشل لا نافذ کیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ویسا ہی طرزِ عمل بعض دینی ادب والوں نے بھی اپنا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور بولے بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اسے مارشل لا کی جگہ ماشاءاللہ کہتے ہیں۔'' (اقتباس از انشائیہ **یہ خیر و شر کے سلسلے** بحوالہ کلیات حیدر قریشی **عمرِ لا حاصل کا حاصل** ص ۲۲۷)

سجاد ظہیر

شعرِ محض

شاعری کی دُنیا جذبات، تخیل، تشبیہ، تمثیل، استعارے، واہمے، اور خواب کی دُنیا ہے، یہاں الفاظ صرف اپنے معمولی، عملی، بیّن اور منطقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے، یہاں مناسبت الفاظ، توازن بحر، قافیہ، ردیف، اشاروں اور محاکات سے الفاظ اور جملوں میں نغمگی اور موسیقیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ شعر ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر ہمارے اُن جذبات کو جگاتا ہے، اور احساسات کے اُن تاروں کو چھیڑ دیتا ہے جن کے وجود کا ہم کو علم تک نہیں ہوتا۔ شعر ہم میں وہی محسوسات اور تاثرات پیدا کر دیتا ہے جو شاعر کے اپنے ہوتے ہیں، اس حد تک گویا شعر پڑھنے یا سننے والا خود شاعر کی طرح ہو جاتا ہے، شعری تجربہ ہر ایک انسان کو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ شاعر وہ ہے جو اس تجربہ کو اس طرح سے الفاظ کے سانچے میں ڈھالے، کہ ان الفاظ کو پڑھنے یا سننے اور سمجھنے والے بھی ویسا ہی جذباتی یا محسوساتی تجربہ کر سکیں جیسا کہ خود شاعر کو ہوا تھا۔

شعر کی یہ خصوصیت، یعنی عقل و فہم اور عملی منطق کی سرحدوں سے ایک حد تک اس کی ماورائیت اس کے امکانات پیدا کرتی ہے کہ بعض لوگ اور بعض گروہ شاعری کو انسانوں کی خارجی زندگی اور اجتماعی حیات یعنی اس زندگی کی جد و جہد سے قطعی الگ اور علیٰحدہ سمجھیں جو انسان زندگی کے قیام و تسلسل اور مہذب و متمدن ہونے کے لئے کرتے ہیں۔

یہ کوشش دراصل اُس فلسفیانہ اور مذہبی تخیل سے علیٰحدہ نہیں ہے جہاں خیال و تصور کو خارجی حقائق سے الگ کر کے ایک مستقل اور مابعد الطبیعاتی حیثیت دی گئی ہے، اور جس کے نتیجے کے طور پر ایک ابدی روح اور تمام کائنات پر جاری و ساری الوہیت کا تصور بعض لوگوں کے نزدیک اصلِ حقیقت ہے۔

لیکن ---- جیسے مابعد الطبیعاتی عینیت کا یہ فلسفہ جو خیال، ادراک، احساس اور شعور کو خارجی یا مادی حقیقت سے بالکل الگ کر کے انہیں ایک مستقل حیثیت دیتا ہے غلط اور گمراہ کن ہے ------------ اور اس حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے کہ

''یہ مادی دُنیا ہے جو اس کے ذریعہ محسوس کی جا سکتی ہے اور جس میں ہم لوگ بھی شامل

ہیں اکیلی حقیقت سے ہمارا ادراک اور فکر جو بظاہر احساس سے بہت ماورا معلوم ہوتے ہیں، دراصل ایک مادّی جسمانی آلے یعنی دماغ کی پیداوار ہیں، مادّہ ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ ذہن خود مادے کی اعلیٰ ترین پیداوار ہے۔'' (انیگلس)

بالکل اُسی طرح شاعری کا یہ نظریہ بھی بے بنیاد اور گمراہ کن ہے جو شاعری کو محض ماورائی یا مابعد الطبیعاتی حیثیت دے کر ہماری معمولی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے دور ایک ایسی موہوم باطنی سطح پر لے جانے کی سعی کرتا ہے جو اس نظریہ کے ماننے والوں کے نزدیک سچائی اور حسن سے زیادہ نزدیک ہے اور اس لئے اصلی اور حقیقی ہے۔ یہ نظریہ ''شعر محض'' کا نظریہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں شعر محض کے پرستار ابھی تک بہت کم ہیں۔ لیکن جس طرح اور بہت سی باتوں میں ہمارا ملک پچھڑا ہوا ہے، ممکن ہے کہ شاعری کے معاملے میں بھی وہ نظریئے اور تصورات جو فرانس میں تقریباً سو برس پہلے انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئے جنہوں نے ستّر اسّی برس میں گونا گوں شکلیں اختیار کیں۔ اور جو بیسویں صدی میں اس جنگ کے قبل ہی تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ ہمارے یہاں کے بعض جدّت پسند خود پرستوں تک اب پہنچیں اور ان کے لئے تقریباً الہامی انکشاف کی حیثیت اختیار کر لیں۔ کسی سچائی کی خبر اگر ہم تک دیر میں پہنچے اور ہم اس وجہ سے اُس سے دیر میں بہرہ مند ہوں، تو اس میں کوئی عیب نہیں۔ اس لئے مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ شعر محض کے نظریے ایک یا نصف صدی پُرانے نظریے ہیں۔ مجھے اعتراض اس پر ہے کہ وہ سکّے جو کھوٹے سمجھ کر ترک کر دئے گئے، انہیں بعض لوگ چمکدار کھرے سونے کا جتا کر ہم بیچارے مشرقیوں پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اعتراض اس پر ہے کہ جدید مغربی ادب کے عظیم الشان دھارے پر تو ان لوگوں کی نظر نہیں پڑتی لیکن وہ مغرب کے ان ادبی نالوں کے کنارے بیٹھ کر سر دُھنتے ہیں جن میں شاید عفونت تو باقی ہے لیکن ان کا پانی خشک ہو چکا ہے۔

شعر محض کے ابتدائی نظریے ہمیں فرانس میں ورلین اور ریمبو کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ دونوں شاعر فرانس کے اُس عہد میں پیدا ہوئے جب کہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی ادبی روحانیت اور حقیقت نگاری کا زور کم ہونے لگا تھا۔ فرانسیسی سرمایہ دار طبقے نے انقلاب فرانس کی تمام جمہوری روایات کو ترک کر کے زر پرستی اور ملک گیری کی ہوس اختیار کر لی تھی۔ مزدور طبقہ ابھر رہا تھا لیکن ابھی تک اس نے مستقل اور آزادانہ حیثیت اختیار نہ کی تھی ۷۱۔۱۸۷۰ء میں ایک طرف فرانس کی شکست نے درمیانی طبقے میں سخت مایوسی کے آثار پیدا کئے۔ سائنس اور صنعت وحرفت کی ترقی سے دلوں میں جو ابھار پیدا ہوا تھا، وہ دبنے لگا تھا۔ لیکن دوسرے طرف وکٹر ہیوگو، ژولا موپاساں، فلوبیر کے قلم، حکمراں سرمایہ داروں کی بدمعاشی اور نچلے درمیانی طبقے کی بزدلی کا پردہ چاک کر رہے تھے اور ملک کی اخلاقی حالت کی سچی تصویر پیش کر کے ایک جمہوری ذہن اور معاشرتی انقلاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ

لوگ دراصل ایک نئے انقلابی طبقے کے عروج کا مطالبہ کر رہے تھے، جو حالانکہ پیرس کمیون میں شکست کھا چکا تھا لیکن جس نے جمہوریت پسندوں کے دلوں میں امید کے چراغ جلا دئے تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ورلین (۱۸۹۶۔۱۸۴۴) اور ریمبو جنہوں نے شعر محض کے سبب سے ابتدائی نظریے، یعنی اشاریت SYMBOLISM کی بنیاد رکھی وہ بودلئیر کی شاعری سے متاثر تھے۔ بودلئیر نے (۱۸۶۷۔۱۸۲۱) جسے خود تو اشاریت پسند نہیں کہا جا سکتا، جس کی شاعری کی روح دل گرفتگی، تھکاوٹ، خودکشی کی خواہش، بیماری، موت، لاش، ناامیدی اور ایک عام بیزاری سے بھری ہوئی ہے، سب سے پہلے اشاریت پسند شاعروں (ورلین اور ریمبو) پر اثر ڈالا۔ اور بودلئیر رومانی دردانگیزی، غم پسندی، اور موت پرستی کو عجیب اور طرفہ ہولناک لیکن دلکش طریقوں سے اپنے اشعار میں پیش کرنے پر قادر تھا۔ اشاریت پسندوں کے نزدیک بودلئیر کا یہ انداز دراصل اس اندرونی کرب والم کی نشانی تھا جو اس کی اپنی اور دنیا کی زندگی میں اُسے نظر آتا تھا، یہی درد اس کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی، بودلئیر کے اشعار میں پھانسی پر لٹکی ہوئی لاش، اس کی معشوقہ کے جسم میں رینگتے ہوئے کیڑے، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں حقیقت کی جانب اشاروں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مثلاً وہ ایک جگہ کہتا ہے:-

''یہ دنیا سپاٹ اور چھوٹی آج
کل، پرسوں، ہر روز ہمارا عکس ہم کو دکھاتی ہے
بیزاری کے ریگستان میں ہولنا کی کا ایک نخلستان!

اشاریت پسندوں نے بودلئیر سے بھی آگے ایک قدم بڑھایا ورلین نے کہا کہ کلاسیکی یا رومانی شاعری میں تخیل دراصل ذہنی تخیل ہے۔ اس نے کہا کہ تخئیل تو فی الحقیقت تمثیل وتشبیہ کے ذریعہ سے اس خیال کی ترجمانی ہے جو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ یا جو سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی تخئیل شاعری کے لئے مضر ہے۔ اس لئے ورلین نے کوشش کی کہ وہ اپنی شاعری میں ایسے تصوری عکس پیش کرے، جنہیں صرف وہ محسوس کرتا ہو۔ اس قسم کے عکس روح کی ایک خاص کیفیت کا اظہار کرتے ہیں، یہ اظہار محض اتفاقیہ ہوتا ہے، جس کی منطق یا جس کے مطلب کو دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گویا اس کی شاعری بے مقصد احساسات کے خواب کی مانند ہوئی، اگر بظاہر ان میں منطق نہ ہو تو نہ سہی۔ یہ دُھندلے، بغیر سوچے ہوئے خاکے، باطنی زندگی کے ترجمان ہیں اور وہی منطق ان کی بھی ہے جو کہ اس باطنی زندگی کی ہے۔

ریمبو نے اس تصور کو اس کی منطقی حد تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک زندگی کی تمام چیزیں جو بظاہر معلوم ہوتی ہیں، بیکار اور فضول ہیں، ''میں نے تو واہمے کی دُنیا میں رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔'' اس کے نزدیک اصلی احساس ہمیں شاذ و نادر اور اتفاقیہ طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ جب ہم دریا کی لہروں میں ایک پتھر پھینک

دیتے ہیں تو موجیں تھرّ ا اٹھتی ہیں، یہی تھرتھراہٹ اصلی احساس ہے۔ ہمارے اندر ایک پرستان ہے، جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں، ایک اندرونی خواہش ہمیں اس کی جانب لے جاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح ہم کوئی خواب دیکھتے ہوں، اگر ہم ظاہری دنیا کی تصویر کھینچنے کی کوشش کریں گے تو یہ ایک غلطی ہوگی، ایک جست لگا کر ہمیں اس دنیا سے نکل جانا چاہئے۔ اور اُس دوسری شاعری کی دنیا میں جا کر زندہ خواب دیکھنے چاہئیں۔ اس قسم کے تصور کے راستے پر چلتے چلتے ریمبو بہت جلد اس منزل پر پہنچ گیا کہ اس نے کہا کہ مروّجہ الفاظ اور زبان خوابوں کی اس دنیا کا نقشہ نہیں کھینچ سکتے اس لئے اس نے زبان میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش ناکامیاب ہوئی۔ ریمبو نے برسوں کے لئے شاعری ترک کردی۔ اس کی زندگی نہایت ہیجانی اور نیم جنونی حالت میں گزری۔ اس نے بہت کم لکھا اور اس میں بھی اکثر ایسا ہے جو مشکل سے کسی کی سمجھ میں آسکے۔

ورلین اور ریمبو کے بعد اشاریت پسندوں کا باقاعدہ ایک ادبی گروہ قائم ہو گیا۔ ان لوگوں نے روائتی شاعری پر سخت حملے کئے۔ ہنری دریئے۔ جول لافورگ اور گستاف کان، اشاریت پسند گروہ کے خاص شاعروں میں سے ہیں۔ ورلین اور ریمبو کے یہاں جو چیزیں صاف نہ تھیں اب انہوں نے شاعری کے ایک باقاعدہ نظریہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے نزدیک شاعری، شعور کا نہیں، ذہن یا سمجھ کا نہیں بلکہ احساسات کا اظہار ہے، لیکن ابھی تک شاعری کا اظہار ذہن یا سمجھ کے وسیلے سے ہی ہوتا آیا ہے۔ شاعر پر ایک جذبہ طاری ہوا، اس نے ایسی زبان میں اس کا اظہار کیا جسے پڑھنے یا سننے والے کی فہم نے قبول کیا۔ یہی زبان، گویا سمجھ کے ذریعہ سے پڑھنے یا سننے والے کے جذبات کو متحرک کر کے اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اشاریت پسندوں نے کہا کہ اس عمل میں شاعری کی روح تباہ ہو جاتی ہے۔ اصلی شاعری کو احساس کے وسیلے سے ہی احساس پر اثر ڈالنا چاہئے۔ اس لئے شاعری میں اظہار خیال یا بیان نہ ہونا چاہئے۔ ان طریقوں کو ترک کر کے اُسے اشاروں اور نشانات سے کام لینا چاہئے۔ فصاحت اور بلاغت کے تمام وسیلوں کو ترک کر دینا چاہئے۔ اُسے اشاروں کی مدد سے خواب دکھانا چاہئے۔ رموز، اشارے ابہام (نہ کہ تشبیہ، استعارے، تمثیل، جنہیں ہم اپنی سمجھ کی بنا پر استعمال کرتے ہیں) چھپے ہوئے مطالب، اصل شاعری کے وسائل ہیں۔ غیر ارادی طور پر جو عکوس اُبل پڑیں بغیر جانے ہوئے کہ کیوں ایسا ہوا، جو ترجمانی نہیں بلکہ احساسات کا اظہار کریں۔ اس طرح شاعرانہ تخئیل نمودار ہونی چاہئے۔ یہ شاعرانہ تخئیل اُس پھول کے مانند ہونی چاہئے جو کہ اس پیڑ کا اظہار تو کرتا ہے جس کا وہ پھول ہے، پھر بھی وہ اس پیڑ کے مشابہ نہیں ہوتا۔ اس طرح ظاہری اور بیّن مطالب سے دور ہو کر شاعری اپنے تاثر کے لحاظ سے موسیقی سے زیادہ قریب ہوتی گئی۔ چنانچہ ایک اشاریت پسند شاعر پال کلاویل نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''ہمیں شاعری کا مطلب دریافت کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔'' بلکہ اس کے موسیقانہ اشاروں کو محسوس کرنا چاہئے۔'' ایک دوسرے مقام پر کلاویل نے کہا:-

''ہمارے نزدیک زبان کی وقعت اظہار مطلب کے لئے کم اور نشان و اشارہ کے لئے زیادہ ہے۔ وہ بے فائدہ الفاظ جو دماغ کی سطح پر اُبھر آتے ہیں۔ قافیہ۔ ایک جملے کا بار بار دہرایا جانا۔ ایک طرح کی سنگیت ہے جو رفتہ رفتہ ہمارے شعور کو ایک مقام پر لا کر ٹھہرا دیتی ہے۔ چیزوں کا عکس ہمارے تخیل پر براہ راست پڑتا ہے۔ اور ہر طرف اپنی چمک پھیلا دیتا ہے۔''

انھیں خیالات اور نظریوں کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد نظم وجود میں آئی۔ گستاف کان نے ورلین، ریمبو اور دیگر اشاریت پسندوں کے قدموں پر چل کر آخر میں روایتی شاعری کے تمام قواعد توڑ دیئے۔ قافیہ، وزن، بحر، سب کچھ رکھا جا سکتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی شعر کے لئے ضروری نہیں ہے، کان کے نزدیک شعر کے لئے صرف ایک قانون ہے، اندرونی موسیقیت کا، اور یہ موسیقیت ہر شاعر کے وجدان پر منحصر ہے۔

اشاریت پسندوں کے گروہ سے کسی قدر علیٰحدہ ہو کر استیفان ملارمے نے شعر محض کو ایک نئے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ ملارمے اشاریت پسندوں سے اس امر میں متفق تھا کہ شاعری انسان کے لئے اسی قدر ضروری ہے جتنی کہ نظم۔ ہر انسان میں منطقی عقل ہوتی ہے، جس سے نثر پیدا ہوتی ہے۔ اس منطقی عقل سے بالکل مختلف اس میں جذبات بھی ہوتے ہیں جن کی ترجمانی وہ الفاظ نہیں کر سکتے جو نثر میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس لئے شاعری میں عقلی اظہار یا بیان نہیں بلکہ اشاریت کی ضرورت ہے۔ ملارمے، اشاریت پسندوں کی طرح یہ بھی کہتا تھا کہ اشاریت اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ الفاظ کو موسیقیاً اظہار کے لئے، ان کے مطالب سے آزاد ہو کر استعمال کرنا ضروری ہے لیکن اس منزل تک اشاریت پسندوں کا ساتھ دینے کے بعد ملارمے کی راہ ان سے الگ ہو جاتی ہے۔ ملارمے کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا سے جہاں انسان کھاتے پیتے، سوتے، بحثیں کرتے، کتابیں لکھتے اور زندہ رہتے ہیں۔ ایک دوسری دنیا بھی ہے جو اس دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تصوّراتِ محض کی دنیا ہے۔ اشاریت پسند واہمے اور محسوسات کی ایک ایسی دنیا کے قائل تھے جو دھندلی اور ہیجانی تھی اور جو الفاظ کے احاطہ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کے برخلاف ملارمے ظاہری دنیا اور ظاہری زندگی کے علاوہ تصوّرِ محض کی صاف و شفاف ماورائی، دنیا کا قائل تھا۔

اشاریت پسندوں کی تخئیل اگر دھندلی تھی، ان کے واہمے پر اگر جنون کا دھواں چھایا ہوا تھا تو ملارمے کی اندرونی واہمہ کی دنیا آئینہ کی طرح بے داغ تھی۔ خیال محض کی اس ماورائی دنیا کا اظہار شاعری کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس دنیا تک کیسے پہونچا جائے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ظاہری اور بین حوادث اور واقعات سے ''شاعر درگزر کرے'' ''بیچاری ظاہری زندگی'' کو ترک کر کے خود کو اندرونی تصور کے کیف میں ڈبونے کی کوشش کرے۔ ان تصوری واہموں اور تصوری وجدان کو اپنے اوپر طاری ہونے دے، خود کو ان تک کھینچ جانے دے۔

بالکل اس طرح جیسے کہ ایک ہلکا سا یہ رباب کے متحرک تاروں پر دھیرے دھیرے پھسلے اور آخر میں رباب کے تاروں سے نکلتے ہوئے نغموں کی لہروں پر بہنے لگے ارپھران میں مدغم ہو جائے۔

ملارمے کا تصور محض کا نظریہ افلاطون اور ہیگل کی تصوریات سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔لیکن بحیثیت شاعر کے ملارمے کے سامنے اب یہ سوال اٹھا کہ اس تصور مطلق کا اظہار کس زبان میں کیا جائے؟ معمولی زبان کی روایات سے شعر محض کے ماورائی تصورات کی ترجمانی کس طرح ہو سکتی تھی؟ الفاظ کے مطلب تو عملی زندگی کی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں وہ بھلا خیال محض کی فضا میں کس طرح پرواز کر سکتے ہیں؟ مطلق تصورات کے لیے کون سی زبان استعمال کی جائے؟ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ملارمے نے سنگیت کی طرف رجوع کیا۔جس طرح مختلف نغموں کی ہم آہنگی میں ترجیحی سُر ہوتے ہیں۔اور یہ سُر پورے آہنگ میں کبھی پہلے اور کبھی بعد کو ادا کئے جاتے ہیں، کبھی ایک سُر ختم ہو تو دوسرا پیدا ہوتا ہے، کبھی ایک دھیما پڑ جاتا ہے اور دوسرا اُبھر آتا ہے، اور اُن سب کے اجزا سے مل کر ہم آہنگ سنگیت مکمل شکل میں پیدا ہوتی ہے، اسی طرح شاعر کے وجدان سے ایک شعری ترجیعی سُر یا کئی سُر پیدا ہوتے ہیں۔مکمل نظم اس کی مکمل روحانی کیفیت کی ترجمانی کرے گی۔مثلاً اس جدوجہد کی ترجمانی شاعری کی آزاد فضا میں پرواز کی کوشش کرتی ہے اور زندگی کی ظاہری حقیقت اُسے اُڑنے سے روکتی ہے۔اب نظم میں الفاظ اور جملے ہم آہنگ سُروں کی طرح ابھریں گے، دبیں گے، اور پھر اُبھریں گے۔وہ معمولی منطق کے پابند نہ ہوں گے، اس لئے کہ وہ ہم آہنگ سنگیت کے اصول کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔ایک جملہ یا لفظ کسی اندرونی اہم آہنگی کے اظہار کی خاطر بظاہر بے جوڑ اور غیر منطقی طور سے استعمال کیا جا سکے گا۔اس وجہ سے ملارمے کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کے مطلب کو سمجھنے کے لئے جملوں کی ترتیب بدل دی جائے تو ساری نظم کا موسیقیانہ ربط غائب ہو جاتا ہے۔

ملارمے نے الفاظ میں نئی خصوصیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔اُس نے یہ تو نہیں کیا کہ الفاظ کو ان کے لغوی معنوں سے بالکل مبرّا کر دے، لیکن الفاظ کی صوتیت اور آہنگ پر، ان کی اشاراتی کیفیت پر توجہ کر کے، ملارمے نے یہ ضرور کیا کہ لفظوں کو ان کے معمولی مطلب کے علاوہ نئی کیفیت سے بھر دیا اور الفاظ کی ان اشاراتی کیفیات کے اجتماع سے پوری نظم کا وجود ہوا۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملارمے کی شاعری رفتہ رفتہ بہت زیادہ مبہم اور غیر واضح ہو گئی، ملارمے کو اس کا علم تھا لیکن اس نے کہا کہ شاعر کو سمجھنے کے لئے خود شاعر ہونا ضروری ہے، شاعری سے اثر پذیر ہونا کافی نہیں، سننے یا پڑھنے والے کو اس کی تخلیق بھی کرنی چاہئے ایسی صورت میں اس کا امکان ہے کہ پڑھنے والے اور شاعر کی تخلیق یکساں نہ ہو۔اس لئے کہ یکساں ہونے کے لئے شعر کا ذہنی طور سے سمجھنا ضروری ہوگا۔اور ایسا کرنا ممکن نہیں، اس لئے پڑھنے والا خود اپنے ''شعر'' کی تخلیق کرے گا۔ایسی صورت میں نظم کی حیثیت ایک اجتماعی

مرکز کی سی ہوئی جو ہمیں تصورِ محض کی آفاقی فضا میں پرواز کرنے میں مددگار ہو۔

ملارمے کی شاعری اور اس کے تصورات نے جن لوگوں پر اثر ڈالا ان میں سب سے زیادہ اہم شخصیت پال والیری کی ہے۔(۱۹۴۵۔۱۸۷۱) والیری نے شعر محض کے تصور کو ایک نئے انداز سے پیش کیا۔والیری احساسات، جذبات، وجدان، واہمہ اور شعری خواب سب کا سختی سے منکر تھا۔اس نے شاعری کی بنیاد تصور محض پر رکھنے کی کوشش کی۔ایسا تصور جس میں جذبات و محسوسات کی ''آلایش'' مطلق نہ ہو جو کسی دوسرے ذہن کی پیداوار نہ ہو، اور جسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی تعلق نہ ہو! دے کارت کے مشہور مقولے ''میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں''، کے صرف پہلے حصہ کا والیری اقرار کرتا تھا۔دوسرے حصّے میں زندگی کا اقرار ہے اس لئے والیری کو یہ قبول نہ تھا۔چنانچہ والیری نے ایک مرتبہ لکھا کہ: ''میں سوچتا ہوں اس سے کیا مطلب؟ زیادہ سے زیادہ ایک ناقابلِ بیان حالت کی ترجمانی'' اس نے یہ بھی لکھا:۔

> ''جب ایک سوچنے والا اپنے وجود کا اقرار کرتا ہے تب اگر یہ ممکن ہوتا کہ اس لمحہ جو کچھ وہ سوچتا ہے اُسے قطعی طور سے معلوم کیا جا سکتا (بجائے اس کے کہ اس کی فلسفیانہ تاویل کی جائے) تو ہم کو کیا معلوم ہوگا''

والیری نے کوشش کی کہ اپنی شاعری اور فکر کی تعمیر کسی گرفت میں نہ آ سکنے والے تصور سے کرے۔وہ اپنے تصّور کو حرکت میں لاتا ہے جس کی وجہ سے بعض خاکے وجود میں آتے ہیں، وہ ان خاکوں کو دیکھتا ہے، لیکن ان کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔یہی ناقابل بیان تصوری خاکے، ایک ناقابل بیان انبساط پیدا کرتے ہیں۔اصلی فنی مسرت یہی ہے۔اگر کہیں ایسا ہو کہ اس عمل کے دوران میں اس کے ذہن میں جوش اور قلب میں حرارت پیدا ہو جائے، اور وہ زندگی کی شاہراہوں سے گزرنے لگے تو پھر والیری فوراً اُس کیفیت کو غلط سمجھ کر اسے مسترد کرنے کی کوشش کرتا تھا، وہ دوبارہ خیال محض کی ریاضیانہ اور الجبرائی دُنیا میں واپس آنا اپنے فن کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔اُس کا قول تھا کہ:۔

> ''میں تمام اُن خیالات اور جذبات کو صرف بیزاری کی نظر سے دیکھ سکتا ہوں جو آدمی میں اُس کے آلام یا خوف کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں یا حرکت میں آتے ہیں۔''

والیری یونانی دیومالا کی اُس تنہا، ہستی نرگس کی طرح تھا جس نے اپنے عکس کو ایک حوض میں دیکھا اور اسی پر عاشق ہو گیا۔والیری اپنے اس عمل میں یہ بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ آسمان پر اُڑتے ہوئے بادلوں اور کناروں پر لگے ہوئے پھول کے درختوں کے عکس کی طرف توجہ کرے، وہ صرف اپنے خیالات کے عکس پر نظر جمانا پسند کرتا تھا، اُسے انسانیت یا بنی نوع انسان سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔وہ غم ہو یا خوشی، انسانی جذبات کے ہر ایک مظاہرے کو مسترد کر کے خیال مطلق اور تصور محض بن جانا چاہتا تھا۔رونے اور ہنسنے کے بارے میں ایک جگہ

اُس نے لکھا:-

''خوشی اور رنج کے اظہار کی یہ مشینیں کتنی عجیب ہیں، خیال کو برداشت کرنے کے لئے بے چارگی کے آلے!''

اب اس کے بعد یہی باقی رہ جاتا ہے کہ خیال محض کا یہ پرستار صرف اپنے شعور کی دنیا میں اپنے کو بند کرلے، کسی قسم کے جذبے یا اپنی خودی سے باہر کی دُنیا سے اس شعور کو ملوث نہ ہونے دے، کسی بھی راستے سے خارجی دُنیا اور خارجی زندگی کو اپنے خیالوں کے اس بلوریں محل میں داخل نہ ہونے دے، کیسا عجیب وغریب نصب العین ہے، یہ جہاں خیال کائنات اور اس کے ہر ایک مظاہر سے مطلق بے تعلق ہوکر وجود میں آتا ہے۔ والیری نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے:-

''وہاں اوپر نصف النہار، بے حرکت نصف النہار، خودی کا تصور کرتا ہے، اور خودی پر ہی محمول ہے۔''

والیری انسانوں کے احساسات وجذبات کا منکر اس لئے ہوا کہ وہ خودی کے جوہر تک پہنچے، خودی کو معلوم کرے، لیکن آخر میں اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اس نے اعتراف کیا:

''اگر ایک موقع ایسا آئے کہ ذہن مکمل طور سے حاوی ہوجائے تو دوسرے ہی لمحے میں ہم فنا ہو جائیں گے۔''

تو گویا تصور محض کی کامیابی ہمیں فنا یعنی نفیٔ محض کی منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ والیرؔی نے تقریباً اس کا اعتراف کیا، لیکن اُسے خود آزادی میں لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے ایک مقام پر لکھا:

''مجھ پر رنجیدگی کی روح طاری رہتی ہے۔ جسے کبھی اس کا یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ سمجھا بھی ہے یا نہیں---- میں صاف اور مبہم میں مشکل سے فرق کرسکتا ہوں۔ میں تمام الفاظ کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں، کیونکہ ذرا سی فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پر بھروسہ کرنا مہمل بات ہے۔''

ملارمؔے نے الفاظ کی معنوی بندش سے نکلنے کے لئے موسیقیت پر بھروسہ کیا تھا، والیری نے بھی موسیقیت کی پناہ لی، اس نے کہا: ''شاعری کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ اسے نثر پر ترجیح دی جائے اس لئے کہ اُسے موسیقی پر قربان کردیا جائے۔''

والیرؔی اپنے شعور کے تہ خانوں میں سے گزرتے ہوئے الفاظ کی گرفت کرتا ہے، وہ انہیں لطیف تمثیلوں، عکوس، اور تشبیہات کے سانچوں میں ڈھال کر اچھوتے جملوں اور مخصوص اوزان میں پیش کرتا ہے۔ الفاظ کا معنوی لوچ ایک فلسفی اور مفکّر کے لئے مشکلیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن شاعر خیال کو الفاظ کے ابتدائی خاکے میں محسوس کرنے کے بعد، اُسے تشبیہوں، صوتی اور معنوی آواز، بازگشت، تلازم، توازن، اور ترنم سے مملو کر کے جب

شعر کی تشکیل کرتا ہے، تو ذہن کے دھندلکے میں پیدا ہونے والے خیالات کی آہٹ زیادہ اچھی طرح سنائی دینے لگتی ہے۔ شاعری والیرؔی کے لئے اس کے لفظوں میں ''جنت زبان'' ہے جذبات ومحسوسات، اور تخئیل کی جنت نہیں جو ہمارے دل ودماغ میں گہرائی، وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرے، بلکہ زبان سے بنا ہوا ایک ایسا جوہر جو صرف شاعری کی مخصوص ذہنی کیفیت کے اظہار کے لئے نکالا گیا ہو، اور جو صرف اسی کو طمانیت بخشتا ہو، اسے کسی دوسرے شخص سے کوئی مطلب نہیں۔ شاعری خودی کی خودی سے گفتگو ہے، اس لئے کسی شخص کے لئے اس کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ شعر محض کے کوئی ''معنے'' نہیں ہوتے۔ لفظی توازن، حسین جملے، تشبیہوں کی پچی کاری، اصوات، ان سب کے امتزاج سے والیرؔی اپنے نغموں کی تخلیق کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا ''لوگ جسے صوت کہتے ہیں، وہی میرے لئے معنی ہیں۔''

والیرؔی کی شاعری کا زمانہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اور اس کے فوراً بعد کا زمانہ ہے، تقریباً اُسی زمانے میں فرانس، یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں آرٹ اور شاعری کی وہ تحریک بھی جاری ہوئی جسے شروع میں دادا اور بعد کو ماورائیت (Sunrelism) کی تحریک کا نام دیا گیا۔ والیرؔی اگر تصور محض اور شعور محض کے خاکوں میں رنگ بھر کے شاعری کرتا تھا، تو ماورائیوں نے تحت الشعور کی اندھیری طوفانی اور غیر منطقی دنیا میں شاعری کے سرچشموں کی جستجو شروع کی۔

دادا تحریک کے رہنماؤں نے جن میں آندرے بَرتوں اور لُوئی آراگوں خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہا کہ ان کا مقصد آرٹسٹ کو مکمل آزادی دینا ہے۔ تمام قواعد اور فارمولوں سے آزادی'' وہ مروجہ آرٹ ہو، مصوری ہو، موسیقی ہو، یا شاعری سب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مروّجہ اخلاق، سماج، مذہب غرض کہ ہر چیز کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ ان کی نظموں اور ان کے آرٹ کی خصوصیت بے ربطی، عام ادبی مذاق کا استہزا، مستقل ہیجان اور مہملیت تھی۔ حالانکہ ماورائیت کے ناخداؤں نے ریمبو کے تخئیل شعری سے خود کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن بنیادی طور پر وہ اُس سے قریب تھے اور ریمبو کا یہ مقولہ کہ ''بالآخر میں نے اپنے ذہنی انتشار کو قابلِ تقدس پایا'' ان پر بھی صادق آتا تھا۔ ماورائیے فرائڈ کے تحت الشعوری نظریوں سے متاثر تھے۔ وہ عقل اور شعور کی جگہ نیم بیداری کے عالم میں تحت الشعور کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کر کے، بالکل غیر ارادی اور غیر شعوری طور سے شعری تخئیل کا شکار کرتے تھے۔ وہ والیرؔی کے شعورِ محض سے آگے نکل کر تحت الشعور کے اندھے غار میں اُفتاں وخیزاں گھومنے لگے۔

ماورائیوں کے گروہ کے کئی ممتاز افراد نے اس تاریک نفی پرستی سے علیحدگی اختیار کی۔ لُوئیؔ آراگوں اور پاؔل ایلوران میں سب سے ممتاز ہیں۔ آراگوںؔ نے ماورائیوں کے بارے میں لکھا ہے:-

''وہ ایک طرح سے مغالطے کے سمندر میں کود پڑے۔ اور اس کا خطرہ ہے کہ ماورائیت

دھو کے کے سمندر کی طرح انھیں بیچ دھارے میں بہالے جائے جہاں جنون کی آدم
خور مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔''

یہ ہے نہایت مختصر ساخا کہ شعر محض کے اُن مختلف نظریوں کا جو فرانس میں انیسویں صدی کے وسط کے بعد شروع ہوئے اور تاریخی اعتبار سے اپنی جنم بھومی میں موجودہ جنگ کے شروع ہونے کے پہلے پہلے متروک ہو کر اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ شاعری اور آرٹ کے یہ نظریے کن حالات میں وجود میں آئے، دراصل انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپ کا سرمایہ دارانہ سماج ایسے مقام پر پہونچ گیا تھا جب کہ سرمایہ داری، بین الاقوامی سامراج یا امپریلزم کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ جنگ، کمزور ملکوں کی لوٹ کھسوٹ، بینکی سرمایہ کا بے پناہ اقتدار، جمہوریت کے تمام ان دعوؤں کو کھوکھلا ثابت کر رہا تھا جو اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں انقلاب فرانس کے بعد سارے یورپ میں پھیلائے گئے تھے۔ عوام الناس کے ووٹ سے چنی ہوئی پارلیمنٹیں، رائے عامہ کو بیدار کرنے والے اخبارات، سیاسی پارٹیاں، تعلیمی اور مذہبی ادارے، یہاں تک کہ فلسفی، شاعر، ادیب اور آرٹسٹ سب کے سب کسی نہ کسی طرح سرمایہ داروں کی زرگری کے آلہ کار بن گئے تھے۔

سائنس کے انکشافات اور میکانکی ترقی سے انسانیت کے مادّی بہبود کی جو امیدیں وابستہ تھیں، وہ غلط ثابت ہو رہی تھیں، اس لئے کہ اُن سے بھی سرمایہ داروں کی دولت بڑھانے اور کمزور اقوام کی آزادی سلب کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اِن حالات میں لازمی تھا کہ ایسے فلسفیانہ نظریے وجود میں آئیں، جن میں انسانیت سے مایوسی، زندگی کی حقیقتوں سے (جو اکثر تلخ تھیں) گریز، کسی نامعلوم اور ہوائی مادرائی حقیقت میں پناہ گزینی، کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ بالکل اس طرح جیسے ازمنۂ وسطیٰ کی قاتلانہ سفاکیوں، اور حکمراں طبیعتوں کی بے تکی چیرہ دستیوں نے رہبانیت پیدا کی، اسی طرح بے روح کٹھور، بے درد اور بے حس سرمایہ داری نے درمیانی طبقے کی بعض حساس اور مغرور طبیعتوں کو ایک طرف سرمایہ دارانہ سماج کے روایتی تصوّرات اخلاق اور معاشرتی اصول کی جانب سے بیزاری اور دوسری طرف خود پرستی نراجیت، نفی پسندی، انکاریت، یا اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر مابعد الطبیعات میں یقین اور ماورائیت کے جذبات پیدا کئے۔ سرمایہ دار حکمراں طبقے اور ان کے نمائندوں نے درمیانی طبقے کے ان ''ذہنی اور جذباتی باغیوں'' کو پہلے تو پریشان ہو کر اور شک کی نظر سے دیکھا، اس لئے کہ انھیں ان لوگوں کا انکار اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن جب انھیں معلوم ہو گیا، کہ یہ انکار نی الحقیقت اُن پر اور اُن کے قائم کئے ہوئے نظام پر کوئی چوٹ نہیں لگاتا۔ بلکہ انکاریوں کو اُن کے خود ساختہ واہمے کے سراب میں لے جا کر بیکار بنا دیتا ہے، تو انھوں نے ایک حد تک درمیانی طبقے کے ان افراد کی سرپرستی اختیار کر کے اپنے کو جدّت پسند اور ترقی نواز ثابت کرنے کی

کوشش کی۔ جوں جوں سرمایہ داروں اور ان کے نمک خواروں، اور ان جدید فن کاروں میں میل ملاپ بڑھا توں توں ان کا فن زندگی اور اس کی حقیقتوں سے اور زیادہ دور، اس کا انکار کا پہلو کمزور اور ماورائیت کی بے حقیقت اور بے بنیاد خیالی دنیا میں فرار کا پہلو مضبوط ہوتا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نچلے درمیانی طبقے کے یہ پڑھے لکھے افراد ایک معاشرتی اور معاشی اور رومانی برزخ میں گرفتار تھے۔ وہ سرمایہ داری کے جہنّم سے علیٰحدہ اپنی دنیا بنانے کی تمنّا ضرور کرتے تھے۔ لیکن ابھی تک ان میں اتنی فکری، علمی، اور اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اس زمانہ میں جب کہ مزدور طبقہ کمزور اور غیر منظّم تھا، انسانی مستقبل کو اس طبقے کی جدو جہد سے وابستہ کر سکیں، ان میں یہ شعور پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ طاقتور سرمایہ داروں اور مظلوم و محروم مزدور طبقے کی مضبوطی کا اندازہ کر پائیں، اسے مزدور انقلاب اور مقصد کے لئے محنت کشوں کی جدو جہد کو سارے سماجی ارتقا کی کنجی سمجھیں۔ اب اگر سماجی پس منظر میں شعر محض کے مختلف نظریوں کی خصوصیت کو دیکھیں تو ہمیں، انھیں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

فکری، اعتبار سے اشاریت پسندوں سے لے کر والیرؔی تک قنوطیت، یاس پسندی، تنہائی کا شدید احساس، اس شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، ظاہر ہے کہ ایک ایسے سماج میں جس میں زیادہ تر انسان بے حد و انتہا مصیبت اور مظلومی کی زندگی بسر کرتے ہوں، جس میں انصاف نام کو نہ ہو۔ جس میں بھلائی کو پے در پے شکست اور برائی کو فتح ہوتی ہے۔ جس میں عشق کا نام غم پڑ جائے۔ اور محبت اکثر رنج سے بدل جائے، ایسے سماج میں درد انسانی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، فن کاروں کے کارناموں سے ضرور جھلکے گا اور اسے جھلکنا بھی چاہئے۔ چنانچہ گوئٹے نے کہا ہے:

''قدرت نے ہماری قسمت میں آنسو دیئے ہیں، درد کی کراہ، جب وہ انسان کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے، مجھے اُس نے سب سے زیادہ نغمہ اور گفتار ودیعت کی ہے، تاکہ میں اپنے آلام کی ساری گہرائیوں کا اظہار کر سکوں، اور جب انسان کی زبان شدّت کرب سے بند ہو جاتی ہے، مجھے خدا کی طرف سے ایک ایسا عطیہ ملا ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنے درد کا اظہار کر سکتا ہوں۔''

مولانا رومؔ نے اسی جذبے کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے:-

بشنو از نئے چوں حکایت می کند   در جدائی ہا شکایت می کند

سینہ خواہم شرح شرح از فراق   تا بگویم شرح درد اشتیاق

از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند   دز نفیرم مرد و زن نادیدہ اند

اور کیٹس کہتا ہے:

''جب مجھے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ میں نہ رہ جاؤں گا، میرا قلم میرے بھرے دماغ سے خوشہ چینی نہ کر

سکے گا، اور کتابوں میں لفظ جمع نہ ہوسکیں گے، جیسے بھری فصل میں کھلیان لگائے جاتے ہیں جب میں رات کے تاروں بھرے چہرے پر گہری محبتوں کی بڑی بڑی ابر آلود نشانیاں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اتفاق کے جادو بھرے ہاتھوں سے ان کا نقش نہ کھینچ سکوں گا''۔۔۔۔۔''اور جب میں، اے گھڑی بھر باقی رہنے والے حُسن محسوس کرتا ہوں کہ میں اب تجھ کو اور نہ دیکھ سکوں گا، اور بے سمجھی بوجھی محبت کے طلسمی اثرات سے لطف اندوز نہ ہو سکوں گا، تب اس وسیع دنیا کے کنارے پر میں اکیلا کھڑا ہوتا ہوں اور خیالات میں غرق ہوجاتا ہوں۔ یہاں تک کہ محبت اور شہرت نیستی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔''

اور میر تقی نے کہا ہے:

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا   دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

ظاہر ہے کہ وہ دردانگیزی، وہ کرب، وہ حُزن جو ان اشعار میں ہے اس میں گہری انسانیت ہے، ان اشعار میں غم کی شدت ہم کو انسانوں سے دور نہیں لے جاتی بلکہ ہمارے دلوں میں گداز پیدا کر کے ہمارے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ایسا غم اور اس قسم کی مایوسی کا اظہار جس کی بازگشت ہمارے دل میں ہو، جو اسے اس طرح پگھلائے کہ ہم بہتر انسان بنیں۔ شاعری کے بہترین منصب کو ادا کرتی ہے۔ ارسطو نے کہا ہے کہ ٹریجڈی کا اثر 'کتھارسس' ہے، یعنی اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کو اسی زمرہ میں شامل سمجھنا چاہئے۔

لیکن ہمیں اس دردانگیزی اور اُس قنوطیت اور یاس پرستی میں فرق کرنا چاہئے جو شعر محض کے فن کاروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ قنوطیت ہمیں انسانیت سے دور لے جاتی ہے۔ انسانوں سے ہمدردی نہیں بلکہ ان سے تنفر اور بیزاری کا جذبہ ہم میں پیدا کرتی ہے۔ قنوطیت انسان کی شکستوں کو لازمی اور ضروری سمجھ کر دلوں میں گداز نہیں بلکہ مردنی پیدا کرتی ہے۔ یاس پرستی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو ہمدردی کے آنسوؤں سے جوڑتی نہیں' وہ ہمارے دلوں میں انسانیت کے سوتوں کو خشک کر کے انھیں خشک بنجر ریگستان بناتی ہے۔ غالباً شعر محض کہنے والوں کو اس کا احساس تھا، اسی وجہ سے وہ کبھی یہ کہتے ہوئے نہ تھکتے تھے کہ وہ شعر صرف اپنے لئے کہتے ہیں، چاہے یہ بیان کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان کی یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ان کی شاعری بہت مرتبہ جنون اور مہملیت اور بے معنی باطنیت کی سرحدوں میں داخل ہوکر بےفیض اور بےکار ہوجاتی تھی۔

شعر محض کی دوسری خصوصیت اس کا خارجی حقیقت سے انکار ہے۔ اشاریت پسندوں نے احساسات کے غیر شعوری وجدان کو شاعری کی اصل سمجھا، ملارمے اور والیری نے محض تصور پر اس کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی، اور ماورائیوں نے تحت الشعور کے سمندر سے شعر کے موتی نکالنا چاہے۔ ان سب کو ظاہری زندگی، بین جذبات و احساسات اور معمولی انسانوں کے معمولی باتوں میں شاعری کا مسالہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اس تمام سلسلے سے بیزار تھے۔ وہ اپنے چاندی سونے کا محل اور موتی کے خیمے واہمہ کی ان دیکھی اور ان سلجھی دنیا میں بنانا چاہتے تھے، ایک

اچھوتی، دلکش اور دل آویز دنیا جہاں ان کا اور ان کی تخئیل محض کا راج ہو، جہاں وہ آزاد ہوں ان پر کوئی دید نہ ہو اور وہ خوش ہوں۔ یہی ان کے لئے حُسن تھا، یہی صداقت، اسی کی جستجو اور اسی کا اظہار اصلی اور واحد فنی مسرت۔

اس کوشش کی ناکامی یقینی تھی۔ شعر محض والے الفاظ کی بندش سے نکلنے کی بار بار کوشش کرتے تھے۔ لیکن ایک شاعر کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے؟ اور اگر الفاظ استعمال کئے جائیں گے، تو پھر انسانی سماج اور اجتماعی معاشرت سے تعلق قائم ہونا لازمی ہے علم اللسان ہم کو بتاتا ہے، کہ انسانی گفتگو اور زبان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک بامعنی آواز جو ہمارے مُنہ سے نکلتی ہے، قرنوں اور صدیوں کی معاشرتی زندگی اور اجتماعی تجربات کا نتیجہ ہے، زبان اور اس کا ایک ایک لفظ نطق اور گویائی (جن کے ذریعہ ہم خیالات ہوں یا جذبات دونوں کا اظہار کرتے ہیں) ہم پر کہیں سے نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ وہ مدت دراز کی عملی زندگی کا صوتی عکس ہے، اور رفتہ رفتہ اس کا ارتقا ہوا ہے، جب ہم بغیر الفاظ کی مدد کے سوچ تک نہیں سکتے۔ اور جب اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بھی ہم کو لفظوں کی ضرورت ہے، تو ظاہر ہے کہ لفظوں اور منطق اور معنی کی بندش سے شاعری کو نکالنے کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ وہ یا تو موسیقی ہوجائے (الفاظ سے مبرّا) اور اس صورت میں شاعری نہ رہے یا پھر اس کے معنی غائب ہوجائیں۔ اور وہ شاعر کے حسنِ محض یا خیالِ محض کا اظہار کرے اور دوسرے کے لئے بیکار ہو۔ کیونکہ وہ اندرونی کیفیت جس کا وہ اظہار کرے گی، صرف اسی صورت میں دوسروں کی سمجھ میں آسکتی ہے اور ان پر اثر ڈال سکتی ہے جب کہ وہ ایسے ایسے لفظوں میں اور اس طریقہ سے شاعر کے جذبات کا اور خیال کا اظہار کرے کہ وہ شاعر اور شعر سُننے یا پڑھنے والوں کے دلوں کے درمیان پُل بن جائے اور دونوں کے جذبات کو ایک دوسرے سے ملا دے اور دل سے دل میں راہ پیدا کردے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی زندگی سے شاعری کو الگ کردینے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے ایک پودے کو زمین سے نکال کر زندہ اور ہرا بھرا رکھنے کی کوشش۔ جب تک زندگی، اس کی جدوجہد، اس کے ارتقاء سے شاعری وابستہ نہیں ہوگی، اس وقت تک، اس میں جان، اثر، تازگی اور تنوّع پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور جب تک حیات کی جدوجہد میں شاعر ابھرتی ہوئی عوامی انقلابی قوتوں کا شعور نہیں حاصل کرے گا۔ اور کائنات کا ایک تنومند نظریہ نہ رکھے گا۔ اس کی شاعری اضمحلال وتنزل کی جانب مائل ہوگی۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر محض کے ماننے والوں میں اشاریت، موسیقیت، واہمہ وتخئیل کی عملی منطق سے علیحدہ صورت گری، یا شعور کو ایسے الفاظ اور جملوں کی حسین تشکیل کے ذریعہ سے پیش کرنا جو اچھوتے ہوں، یہ سب کچھ اُن کی غلطی نہ تھی۔ بلکہ فرانسیسی شاعری میں ان کی اس قسم کی کاوشوں سے ٹیکنکل اعتبار سے کسی قدر اضافہ بھی ہوا۔ ان کا یہ کہنا بھی صحیح تھا کہ شاعری کو اس پھول کی طرح ہونا چاہئے جو درخت کا اظہار تو کرتا ہے لیکن پھر بھی درخت سے مختلف ہوتا ہے، ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ درخت اور اس کے پھول دونوں کو حیات بخشنے والی زمین، فضا، ہوا اور دھوپ سے بے نیاز سمجھتے تھے، شاعری وجدان، واہمہ اور خواب ضرور ہے، لیکن واہمہ، خواب، وجدان،

خود بخود شاعری میں پیدا نہیں ہوتے، یا کوئی مابعد الطبیعاتی یا ماورائی طاقت شاعر کے ذہن پر ان کا نزول نہیں کرتی، خواب بھی حقیقت اور جدو جہد حیات سے پیدا ہوتے ہیں، اور حقیقت اور حیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور انھیں بدلنے میں مدد دیتے ہیں۔ شعر محض کے زوال کا سبب یہ نہیں کہ وہ خواب و واہمہ، نغمگی اور وجدان کی شاعری تھی، اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے خواب جھوٹے تھے۔ وہ انسانیت کے نہیں بلکہ یا نجوذ د پرستی کے خواب تھے۔ سچی شاعری بھی ہمیں خواب دکھاتی ہے۔ وہ واقعہ نگاری نہیں، بقول ارسطو: ''شاعر کا کام جو کچھ ہوا ہے اس کا بیان کرنا نہیں بلکہ ہونے والی چیز یا جسے ہونا چاہئے اس کا بیان کرنا ہے۔''

جدید شاعری کو اگر ایک طرف مذہبی واہمہ پرستی سے بچنا ہے (جس کا نتیجہ تصور تھا) تو دوسری طرف تصورِ محض اور حس محض کے واہمہ سے بچنا ہے، اس کی جڑیں عقل، فہم، علم، شعور اور تجربہ حیات کی ٹھوس سرزمین میں پیوست ہونی چاہئے۔ صرف اسی طرح سے موجودہ زمانہ میں اس کا ارتقا ممکن ہے۔ صرف اسی طرح ہم شاعری کے باغ میں ایسے پھول کھلا سکیں گے، جو ہماری زندگی کو حسن اور ہماری روح کو بالیدگی بخش سکیں۔

☆☆☆

''نظریاتی میدان میں دنیا کا جمہوری اور اشتراکی انقلاب آج اس کا متقاضی ہے کہ ہم انسان کی اس نفسیاتی بیگانگی کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو انسان کی اجتماعیت اجتماعی عمل اور عوامی انقلاب سے ذہنی اور روحانی طور پر دور کرتی ہے۔ جو انسان کو صرف ہلاکت، مایوسی، شکست اور موت کا پیغام دیتی ہے اور ان رجحانات کے بر خلاف جو استحصال کرنے والے حکمراں طبقوں اور ان کے حواریوں کے ذریعے عوام میں بے دلی انتشار اور شکست خوردگی پھیلانے کے لئے منتشر کئے جاتے ہیں ان میں انسان کی عظمت، وقار، رفاقت اور یگانگت کے ایسے جذبات اور حوصلوں کو پیدا کریں جنکی انفرادیت اس طرح ابھرے کہ وہ من و تو کے فرق کو بھول کر انسانی شرافت کی بلند تر سطح پر پہنچ سکیں۔'' **(سجاد ظہیر)**

''ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد سماجی انجماد کو توڑ کر فرد کو صدیوں پرانے اور ظالم استحصالی نظام سے نجات دلانا تھا تا کہ وہ ایک آزاد اور باعزت شہری کی طرح بسر اوقات کر سکے۔ یوں دیکھئے تو ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر ایک اخلاقی تحریک بھی تھی۔ مگر اس کا اخلاقی نظام کسی خاص مذہبی نظام کے حوالے سے نہیں بلکہ عمومی انسانی اقدار کے حوالے سے مرتب ہوا تھا۔ اصولی طور پر اس تحریک کا تعلق سیاست اور معیشت ہی کے ساتھ قائم ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس میدان میں یہ تحریک سرگرم رہنا چاہتی تھی وہ اس عقبی دیار سے خاصا دور تھا جہاں ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت سدا مسلط رہتی ہے۔'' (**ڈاکٹر وزیر آغا** بحوالہ مضمون ''بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں'')

سجاد ظہیر

جنّت کی بشارت

لکھنؤ اس زوال کی حالت میں بھی علوم اسلامیہ کا مرکز ہے۔ متعدد عربی مدارس آج کل کے پُر آشوب زمانے میں شمعِ ہدایت روشن کئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے حرارت ایمانی رکھنے والے قلوب یہاں آ کر تحصیلِ علم دین کرتے ہیں اور اسلام کی عظمت قائم رکھنے میں معین ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ دو فرقہ جن کے مدارس لکھنؤ میں ہیں ایک دوسرے کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ مگر اگر ہم اپنی آنکھوں سے اس فرقہ بندی کی عینک اُتار دیں اور ٹھنڈے دل سے ان دونوں گروہ کے اساتذہ اور طلبا پر نظر ڈالیں تو ہم ان سب کے چہروں پر اُس ایمانی نور کی جھلک پائینگے جس سے اُن کے دل و دماغ منوّر رہیں۔ ان کے لمبے کرتے اور قبائیں ان کی کفش اور سلیپر، ان کی دو پلّی ٹوپیاں، ان کا گھٹا ہوا گول سر اور ان کی متبرک داڑھیاں جن کے ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی، ان سب سے ان کا تقدس اور زہد ٹپکتا ہے۔ مولوی محمد داؤد صاحب برسوں سے ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے اور اپنی ذہانت کیلئے مشہور تھے۔ عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ ماہِ مبارک رمضان میں رات کی رات، تلاوت و نماز خوانی میں گزر جاتی تھی اور انھیں خبر تک نہ ہوتی۔ دوسرے دن جب دورانِ درس میں نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو طالب علم سمجھتے تھے کہ مولانا پر کیف روحانی طاری ہے اور خاموشی سے اُٹھ کر چلے جاتے۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہر مسلمان کے لئے رحمتِ الٰہی ہے۔ علی الخصوص جب رمضان مئی اور جون کے لمبے دن اور تپتی ہوئی دھوپ کے ساتھ ساتھ پڑے۔ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر تکلیف برداشت کرتا ہے اسی قدر زیادہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ ان شدید گرمی کے دنوں میں اللہ کا ہر نیک بندہ مثل ایک بپھرے ہوئے شیر کے ہوتا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہو۔ اس کا خشک چہرہ اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ: ''اے وہ گروہ جو ایمان نہیں لاتے اور اے بدنصیبو! جن کے ایمان ڈگمگا رہے ہیں، دیکھو! ہماری صورت دیکھو! اور شرمندہ ہو۔ تمھارے دلوں پر، تمھاری سماعت پر اور تمھاری بصارت پر اللہ پاک نے مہر لگا دی ہے، مگر وہ جن کے دل خوفِ خدا سے تھرّا رہے ہیں، اس طرح اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔''

یوں تو ماہِ مبارک کا ہر دن اور ہر رات عبادت کے لئے ہے مگر سب سے زیادہ فضیلت شبِ قدر کی ہے۔ اُس رات کو بارگاہِ خداوندی کے دروازے اجابتِ دعا کے لئے کھول دیے جاتے ہیں، گناہ گاروں کی توبہ

قبول کر لی جاتی ہے اور مومنین بے حد وحساب ثواب لوٹتے ہیں۔خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اس شب مسعود کو نماز خوانی اور تلاوتِ قرآن مجید میں بسر کرتے ہیں۔مولوی داؤد صاحب کبھی ایسے اچھے موقعوں پر کوتاہی نہ کرتے تھے۔انسان ہر ہر لمحہ اور ساعت میں نہ معلوم کتنے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔اچھے بُرے ہزاروں خیال دماغ سے گزرتے ہیں۔قیامت کے ہولناک دن جب ہر شخص کے گناہ اور ثواب تولے جائیں گے اور رتّی رتّی کا حساب دینا ہوگا تو کیا معلوم کیا نتیجہ ہو۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ جتنا زیادہ ثواب ممکن ہو حاصل کر لیا جائے۔مولوی داؤد صاحب کو جب لوگ منع کرتے تھے کہ اس قدر زیادہ ریاضت نہ کیا کریں۔تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے۔

مولانا کا سن کوئی پچاس سال کا ہوگا، گو کہ پستہ قد تھے مگر توانا۔گندمی رنگ، تکُنّی داڑھی، بال کھچڑی تھے۔مولانا کی شادی اُنیس یا بیس برس کے سن میں ہوگئی تھے۔آٹھویں بچّے کی ولادت کے وقت ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔دو سال بعد اُنچاس برس کے سن میں مولانا نے دوسرا نکاح کیا۔مگر ان نئی منکوحہ کی وجہ سے مولانا کی جان ضیق میں رہتی۔ان کے اور مولوی داؤد صاحب کے سن میں قریب بیس برس کا فرق تھا۔گو کہ مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چند بال بلغم کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں، لیکن ان کی جوان بیوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کرتیں اور مولانا کو چپ ہو جانا پڑتا۔

ایک سال کے شدید انتظار کے بعد شبِ قدر پھر آئی۔افطار کے بعد مولانا گھنٹے آدھ گھنٹے لیٹے، اس کے بعد غسل کر کے مسجد میں نماز و دعا خوانی کے لئے فوراً روانہ ہوگئے۔مسجد میں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔اللہ کے عقید تمند اور نیک بندے، تہبندیں باندھے، لمبی لمبی ڈکاریں لیتے ہوئے مولانا داؤد صاحب سے مصافحہ کرنے کے لئے لپکے۔ مولانا کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا، اور اُن کا عصا گویا اُن کے ایمان کی راستی کا شاہد بن کر سارے مجمع کو مرعوب کر رہا تھا۔عشا کے بعد ڈیڑھ دو بجے رات تک اکتساب ثواب کا ایک لگاتار سلسلہ رہا، اس کے بعد سَحر گہی کی حاضر لذّت سے جسم نے نمو پائی اور مولانا گھر واپس چلے۔جماہی پر جماہی چلی آتی تھی، شیر مال، پلاؤ اور کھیر سے بھرا ہوا معدہ آرام ڈھونڈھ رہا تھا۔خدا خدا کر کے مولانا گھر واپس پہونچے۔۔روح اور جسم کے درمیان سخت جنگ جاری تھے۔لیلۃ القدر کے دو تین گھنٹے ابھی باقی تھے جو عبادت میں بسر کئے جا سکتے تھے۔مگر جسم کو بھی سکون اور نیند کی بے انتہا خواہش تھی۔آخر کار اس پرانے زاہد نے روحانیت کا دامن تھام لیا اور آنکھیں مل کر نیند بھگانے کی کوشش کی۔

گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔لالٹین بجھی پڑی تھی۔مولانا نے دیا سلائی اِدھر اُدھر ٹٹولی مگر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔صحن کے ایک کونے میں ان کی بیوی کا پلنگ تھا، مولانا دبے قدم، ڈرتے ڈرتے، اُدھر بڑھے اور آہستہ سے بیوی کا شانہ ہلایا۔گرمیوں کی تاروں بھری رات، اور پچھلے پہر کی خنکی میں مولوی صاحب کی جوان بیوی گہری نیند سو رہی تھیں۔آخر کار اُنھوں نے کروٹ بدلی، اور آدھے سوتے ہوئے، آدھے جاگتے، دھیمی آواز سے پوچھا: اے کیا ہے؟''

مولانا اس نرم آواز کے سُننے کے عادی نہ تھے ہمت کر کے ایک لفظ بولے: ''دیا سلائی!'' مولوی صاحب کی بیوی پر ابھی تک نیند غالب تھی مگر اس نیم بیداری کے عالم میں، رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خنکی نے شباب پر اپنا طلسم کر دیا تھا۔یک بارگی اُنھوں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اُن کے گلے میں دونوں باہیں ڈال کر، اپنے گال کو اُن کے منہ پر رکھ کر، لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا: ''آؤ لیٹو۔''

ایک لمحہ کے لئے مولانا کا بھی دل پھڑک گیا۔مگر دوسرے لمحہ میں انھیں حوا کی آرزو، آدم کا پہلا گناہ، زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی پوری فہرست یاد آ گئی اور اپنے پر قابو ہو گیا۔ چاہے یہ سن کا تقاضہ ہو، یا خوفِ خدا، یا روحانیت کے سبب ہو، بہر حال مولانا فوراً اپنی بیوی کے ہاتھ سے نکل کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور پتلی آواز سے پھر پوچھا: دیا سلائی کہاں ہے؟

ایک منٹ میں عورت کی نیند اور اُس کی بے ساختہ خواہش کی اُمنگ، دونوں غائب ہو کر طنز آمیز غصّہ سے بدل گئیں۔مولانا کی بیوی پلنگ پر اُٹھ بیٹھیں، اور زہر سے بجھی ہوئی زبان سے ایک ایک لفظ تول تول کر کہا: ''بڈھا موا! آٹھ بچوں کا باپ! بڑا نمازی بنا ہے! رات کی نیند حرام کر دی۔دیا سلائی، دیا سلائی! طاق پر پڑی ہوگی۔''

ایک مُسن مرد کا دل دُکھانے کے لئے اِس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ نہیں کہ اُس کی جوان بیوی اُسے بُڈھا کہے۔مولانا کانپ گئے مگر کچھ بولے نہیں۔اُنھوں نے لالٹین جلا کر ایک تخت پر جانماز بچھائی اور قرآن خوانی میں مشغول ہو گئے۔مولانا کی نیند تو اُڑ گئی تھی مگر تقریباً آدھے گھنٹہ کے بعد بھرے ہوئے معدے کے بخارات نے جسم کو چور کر کے آنکھوں کو دبانا شروع کیا۔سُورہ رحمٰن کی فصاحت اور مولانا کی دلآویز قرأت نے لوری کا کام کیا۔ تین چار مرتبہ اونگھ کر مولانا جانماز ہی پر'' فَبِاَیِّ۔اَیِّ کہتے کہتے سو گئے۔

پہلے تو ان پر نیند کی گم شدگی طاری رہی، اس کے بعد اُنھوں نے یکا یک محسوس کیا کہ وہ اکیلے، تنِ تنہا، ایک تاریک میدان میں کھڑے ہوئے اور خوف سے کانپ رہے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد یہ اندھیرا روشنی سے بدلنے لگا اور کسی نے اِن کے پہلو سے کہا: ''سجدہ کر تو بارگاہ باری تعالیٰ میں ہے۔'' کہنے کی دیر تھی کہ مولوی سجدے میں گر پڑا اور ایک دل دہلا دینے والی آواز، بادل کی گرج کی طرح، چاروں طرف گونجتی ہوئی مولوی کے کان تک آئی: ''میرے بندے ہم تجھ سے خوش ہیں! تو ہماری اطاعت میں تمام زندگی اس قدر محو رہا کہ کبھی تو نے اپنی عقل اور اپنے خیال کو جنبش تک نہ دی جو دونوں شیطانی طاقتیں ہیں اور کفر و الحاد کی جڑ ہیں! انسانی سمجھ ایمان و اعتقاد کی دشمن ہے۔تو اس راز کو خوب سمجھا اور تو نے کبھی نورِ ایمان کو عقل کے زنگ سے تاریک نہ ہونے دیا۔تیرا انعام جنت ابدی ہے۔جس میں تیری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔'' آواز یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

تھوڑی مدت تک تو مولوی پر رعبِ خداوندی اس قدر غالب رہا کہ سجدے سے سر اُٹھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔کچھ دیر بعد جب دل کی دھڑکن کم ہوئی تو انھوں نے لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے اپنے داہنے، بائیں نظر ڈالی۔

اِن آنکھوں نے کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ سنسان میدان ایک عظیم الشان گول کمرے سے بدل گیا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں جواہرات کی تھیں، جن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سُرخ، سبز، زرد، سنہرے اور روپہلے، جگمگاتے ہوئے پھول اور پھل، معلوم ہوتا تھا در دیوار سے ٹپکے پڑتے ہیں۔ روشنی دیواروں سے چَھن چھن کر آ رہی تھی، لیکن ایسی روشنی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے، مولانا اُٹھ بیٹھے اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔

عجب! عجب! ہر چہار طرف کمرے کی دیوار پر کوئی ساٹھ یا ستّر قدِ آدم کھڑکیاں تھیں اور ہر کھڑکی کے سامنے ایک چھوٹا سا دریچہ۔ ہر ایک دریچہ پر ایک حور کھڑی ہوئی تھی۔ مولانا جس طرف نظر پھیرتے حوریں اُن کی طرف دیکھ کر مسکراتیں اور دلآویز اشارے کرتیں۔ مگر مولانا جھینپ کر آنکھیں جھکا لیتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دفعتہً مولانا نے اپنے جسم پر جو نظر ڈالی تو وہ خود بھی اس نورانی جامے میں تھے۔ گھبرا کر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ہنس تو نہیں رہا ہے، مگر سوا ان حوروں کے اور کوئی بھی نظر نہ آیا۔ دُنیا کی شرم گو کہ بالکل غائب نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے وجود کی سب سے بڑی وجہ یعنی اغیار کا طنز و تمسخر جنّت میں کہیں نام کو بھی نہ تھا۔ مولانا کی گھبراہٹ کم ہوئی۔ اُن کی رگوں میں جوانی کا خون از سرِ نو دوڑ رہا تھا۔ وہ جوانی جس کا زوال نہیں!

مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے۔ حور آگے بڑھی اور اُنھوں نے اُس پر سر سے پیر تک نظر ڈالی۔ اُس کے جسم کا دہکتا ہوا چمپئی رنگ، اُس کی کٹیلی آنکھیں، اُس کا دل فریب تبسم، اِس جنّتِ نگاہ سے مولانا کی آنکھیں ہٹتی ہی نہ تھیں۔ لیکن انسان ایک اچھی چیز سے بھلا کب سیر ہوتا ہے۔ مولانا کے قدم اُٹھے اور وہ دوسرے در کی طرف بڑھے۔ اسی طرح وہ ہر در پر جا کر تھوڑی تھوڑی دیر رُکتے، ان بہشتی ہستیوں۔۔۔ کو غور سے دیکھتے اور مسکرا کر درود پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ کسی کے گھونگھر والے بالوں کی سیاہی انھیں سب سے زیادہ پسند آتی، کسی کے گلابی گال، کسی کے عنابی ہونٹ، کسی کی متناسب ٹانگیں، کسی کی پتلی انگلیاں، کسی کی خمار آلود آنکھیں، کسی کی۔۔!

آخر کار ایک حور کی پیاری ادا نے مولانا کا دل موہ لیا۔ وہ فوراً اُچک کر اُس کے حجرے میں داخل ہوئے اور اُسے بے ساختہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر ابھی لب سے لب ملے ہی تھے کہ پیچھے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اس بے موقعہ ہنسی پر مولانا کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ سُورج نکل آیا تھا۔ مولانا جانماز پر پیٹ کے بَل پڑے ہوئے قرآن کریم کو سینے سے لگائے تھے۔ ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔ ☆☆☆

''مشکوٰۃ صفحہ ۳۰ میں حضرت علیؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ اسلام کا نام رہ جائے گا اور قرآن کا رسمِ خط، اس وقت کے مولوی آسمان کے تلے بدترین مخلوق ہوں گے۔ سارا فتنہ فساد انہی کی وجہ سے ہوگا۔'' (مطبوعہ اخبار **اہلحدیث** امرت سر، ۲۵/اپریل **۱۹۳۰**ء، ص ۵، کالم اوّل)

سجاد ظہیر

دُلاری

گو کہ بچپن سے وہ اِس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولہویں سترھویں برس میں تھی کہ آخر کار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے۔ گھرانے میں ماشاءاللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ بیگم صاحب بھی بقیدِ حیات تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دُلاری خاص اُن کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں اور مامائیں آتیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں اس کے بعد ذرا سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں اور چلی جاتیں۔ مگر دلاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دُلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیوں کے مقابلے میں اس کی حالت اچھی ہی تھی۔ مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اُس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سُنتی : ''میں تیری طرح لونڈی تھوڑی ہوں۔'' اِس کا دُلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

× × × ×

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بی بیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ یہ تو سب خدا کا کیا دھرا ہے، وہی جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا؟ دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اس کی عمر کو وہ زمانہ آیا جب لڑکپن کا ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، اور دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی۔ لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اُسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سِن بڑھتا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کیونکہ شریف تھیں ان کا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے، میں صرف ہونے لگا۔ دُلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی۔ وہ خوبصورت تھی، کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم۔ مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اُس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ اپنے رکھاؤ کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی، یا اگر کبھی شاذ و نادر اُسے بیگم صاحبہ یا

صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اُسے صاف کپڑے پہننے ہوتے۔

× × × ×

شب برات تھی۔ دُلاری گڑیا بنی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے نوکر چاکر کھڑے تماشہ دیکھتے۔ بچّے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحب انھیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انھیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ اکثر پرانی رسموں کے خلاف تھے مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھیں پیاس لگی، اور اُنھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کہا: ''امّی جان پیاس لگی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا: ''بیٹا شربت پیو۔ میں ابھی بنواتی ہوں۔'' اور یہ کہہ کر دُلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے: ''جی نہیں امّی جان۔ اُسے تماشہ دیکھنے دیجئے۔ میں خود اندر جا کر پانی پی لونگا۔'' مگر دُلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل دی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دُلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چُن رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہونچ کر رکے۔

دُلاری نے مڑ کر پوچھا: '' آپ کے لئے کون سا شربت تیار کروں؟'' مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دُلاری کو آنکھ بھر کے دیکھا، دُلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے ایک بوتل اُٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دی اور اُسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تن من کو اُس کی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکا یک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزؤں کے ساحل پر آ گئے۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جا رہے تھے۔

× × × ×

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ شادی کے دن آ گئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دُلھن آ جائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دُلاری ایک دن رات کو غائب ہو گئی، بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شُبہ تھا، لوگ کہتے تھے کہ اُسی کی مدد سے دلاری بھاگی اور وہی اُسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دُلاری اُسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلّہ

میں دیکھا۔ بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دُلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے وہ راضی ہو گئی۔ بُڈھا سمجھتا تھا کہ اُسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچے گی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جُھکائے، سر سے پیر تک ایک سفید چادر اوڑھے، پریشان صورت، اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑے ہو کر اُسے دیکھتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے انھیں جب معلوم ہوا کہ دُلاری واپس آ گئی ہے، تو وہ باہر نکلے، جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصّہ لیتے تھے: انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ دُلاری کو دُور سے پکار کر کہا ''بے وقوف اب ایسی حرکت نہ کرنا!'' اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دُلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں، اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ دلاری کے ساتھ کھیلی ہوئی تھیں۔ دُلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر، بہت ترس آ رہا تھا، مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُسکی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلّت یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اُس کی حالت بہتر کیسے ہوئی؟ دُلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا، جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اس کی اُسے کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہ گاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اُس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لئے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لئے۔ کسی نوکر سے اُس کی شادی کر دی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ نرم لہجے میں کہا: ''دُلاری یہ تو نے کیا کیا؟'' دُلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لئے اپنے بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اُسی طرح سر جھکا لیا۔ حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آ گئیں۔ ان کے چہرہ پر فاتحانہ مُسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چُپ گردن جُھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اُسے ڈانٹنا شروع کیا:

''بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نا، مگر منہ کالا کر کے۔ سارا زمانہ تجھ پر تُھڑی تُھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے.........'' مگر باوجود اِن سب باتوں کے بیگم صاحبہ اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دُلاری بھاگی تھی گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے، سب گھر والے بیگم صاحب اور دُلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز، ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھ کر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مردار

خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بیکس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں بے جان ہونے کے باوجود بھی اُن کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔ یکایک بغل کے کمرہ سے کاظم اپنی خوبصورت دُلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ اُنھوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصّہ نمایاں تھا۔ اُنھوں نے اپنی والدہ سے دُرشت لہجہ میں کہا: ''امّی خدا کے لئے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اُس کی حالت کیا ہو رہی ہے!''

لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لاسکی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے، جب اُس کے کان پیار کے لفظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اُس کے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش، اسی بے دلی نے اُسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا، اور اب یہ حالت کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے! اس روحانی کوفت نے دُلاری کو اُس وقت نسوانی حمیّت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پر شکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن، رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

☆☆☆

اس میں شک نہیں کہ جب کوئی تحریک یا رجحان فیشن کی طرح مقبول ہوتا ہے تو اصل اور نقل کا فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کتنے ہی لوگ صرف نقادوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند بن بیٹھے تھے یہی کچھ ساٹھ کے بعد بھی ہوا لیکن ستر میں محاسبہ کرنے والے ستّر کے بعد کے لوگ ہی نہیں خود ساٹھ کی دہائی کے اچھے لکھنے والے بھی اپنا محاسبہ کر رہے تھے، پھر یہ کہ خارجی منظر نامہ میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ موضوعات کے حوالے سے اور وہ کہانی جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بالکل خارجی اور ساٹھ کی دہائی میں ردعمل کے طور پر باطنی ہوگئی تھی، ستّر میں مجموعی طور پر خارج اور باطن کے امتزاج کی صورت ظاہر ہوئی اور صرف ستّر کے بعد کے لکھنے والوں کی سوچ نہیں تھی، خود ساٹھ کے لکھنے والے جواب مستحکم ہوگئے تھے اور عجز فن کی منزل سے بھی نکل آئے تھے، اس تبدیلی کے محرک تھے۔ انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین اور منشا یاد کی ساٹھ اور ستّر کی کہانیوں میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے، اس لیے یہ دعویٰ کہ یہ تبدیلیاں ستّر کی نسل کی دین ہیں، درست نہیں، انہیں کسی ایک نسل کی بجائے مجموعی اور عصری ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ (**ڈاکٹر رشید امجد** کے مضمون سے اقتباس

مطبوعہ کتابی سلسلہ **عکاس** اسلام آباد، کتاب نمبر ۴۔ ص ۲۸)

ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)

جوگندر پال سے گفتگو

سوال: اردو افسانے کی روایت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اردو افسانہ ہی نہیں بلکہ ہر سماج کا افسانہ دراصل بولے ہوئے لفظ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور بولا ہوا لفظ دراصل سنانے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی پہلے جو روایت شروع ہوئی تھی وہ داستانوں سے وابستہ ہے۔ داستانوی دور یہ تھا کہ جو باتیں عام زندگی میں نہیں ہو پاتیں، داستانوں میں طلسم کے توسط سے یا کہانی کے سنانے والے کی مرضی میں، اگر ایسا ہو تو، اس کی خواہش سے وہ بن جاتی تھی۔ زندگی میں تو نہیں بن پاتی تھی اور اس لیے جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا تو ہم نے محسوس کیا کہ کہانی میں واقعیت ہونی چاہئے۔ یعنی Realism آنا چاہئے، کہانی زندگی کے مانند ہونی چاہئے۔ جب آدمی بھولا تھا بہت تو کہانیوں میں طلسم کو پسند کرتا تھا، کائیاں ہو گیا تو حقائق کی طرف آنے لگا، تو آج ہم دیکھتے ہیں ہم نے طلسم سے باہر آکے کہانی کو جتن کیا۔ یوں تو اول میں درسیّت حائل رہی۔ لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ کہانی سے کوئی سبق ملے۔ یہ اگرچہ کہ نیک خواہش ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ کہانی کو شعوری طور پر درسیّت سے ہی جوڑا جائے۔ دلچسپیاں بھی چاہئے، حقائق کو اس طرح پیش کرنا کہ سننے والا پڑھنے والا کہانی سے اپنے نتائج خود اخذ کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس طریقے سے کہانی کی شکل بدلتی چلی گئی۔ روایت جو تشکیل پاتی ہے، دھیرے دھیرے اپنی شکل اختیار کرتی ہے۔ یوں بھی نہیں کہ فوری طور پر یہ کہہ کر روایت کو ختم کرنا ہے۔۔۔ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ہم نے اس طرح لکھنا ہے جو آج سے کئی سال پہلے لکھا کرتے تھے، یا سو سال پہلے لکھا کرتے تھے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ کہانی بھی اپنی شکل بدلتی چلی گئی اور کہانی جو ہے وہ زندگی کی نمائندگی کرے۔ بلکہ ہمیں کہانی کو زندگی کی متوازی سطح پر دیکھنا چاہئے، یعنی زندگی کا نعم البدل سمجھے کہ اس کو پیش کرنا ہے۔ تاکہ کہانی کار کی طرح پڑھنے والا اس کو پڑھ کر جیئے اور جی کر نہ صرف اپنے آپ نتائج اخذ کرے بلکہ اس کی ساری راہیں تخلیق کار کی طرح دریافت کر کے آگے بڑھے۔

سوال: پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کو کونسی دشائیں بتلائی ہیں؟

جواب: یلدرم نئی کہانی کے قریب تر ہیں۔ان سے پہلے کہانیوں میں پریوں، دیو کا ذکر ہوتا تھا، یلدرم نے انسانوں کی کہانیاں کہنی شروع کیں۔لیکن جب ہم پریم چند اور یلدرم کی کہانیوں کا سوچتے ہیں تو یلدرم کے یہاں ایک خوابنا کی ہے۔خواب ناک کیفیت ہے جو کہ زندگی کی طرح ہو بہو جبر نہیں برتتی اور اس میں اپنی فکری رو میں بہتے چلے جانے کی زیادہ گنجائش ہے۔لیکن پریم چند کے یہاں جس طرح کی واقعیت آئی، اگر چہ کہ ان کے یہاں بھی ایک آدرش کا پیچھا کرنا، یہ بات بنی رہتی ہے۔ بہت سی کہانیوں میں، اوائل کی کہانیوں میں یہ چیز بہت زیادہ ہے کہ آدرش کہانی کو پیش کرنا۔ پریم چند کی آخری کہانی ''کفن'' نئے دور کی پہلی کہانی ہے۔

سوال:کیا ترقی پسند افسانے نے ملک کے معاشی و معاشرتی حالات و کوائف کو ہی قلم بند کیا ہے یا تخلیقی جہات عطا کیا ہے؟اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: ترقی پسند دور کے ابتدائی حصے کا اگر تجزیہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ ان سے پہلے کہانی آگے پیچھے جا رہی تھی۔اس سے اس کو ایک مہذب تر پیرائے میں بیان کرنا اور زندگی کے ساتھ جوڑ کر پیش کرنا، یہ ناگزیر ہو گیا تھا۔یہ زندگی کے ساتھ جوڑ کر، جبر کو جھیل کر کہانی لکھنے کا ادراک جو ترقی پسند تحریک نے ہمیں دیا وہ قابل ستائش ہے یعنی آپ دیکھئے ''کفن'' میں جو ترقی پسند تحریک نے ہمیں دیا وہ قابل ستائش ہے۔یعنی آپ دیکھئے ''کفن'' میں ترقی پسند عناصر ہیں۔اس کے بعد ''انگارے'' کا آنا۔۔''انگارے'' اس لیے اہم نہیں کہ اس میں Topnoutch کی کہانیاں تھیں۔ایسا نہیں ہے، ''انگارے'' میں کئی کہانیاں ڈھلی ہیں، لیکن ''انگارے'' کا اہم تر حصہ یہ ہے کہ اسباب تو ہیں، واقعاتی، اس سے وسعت پیدا ہوئی۔واقعات میں بڑی دلفریب وسعت ہے۔کسی بھی موضوع کو لے کر جو زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، آپ اپنی کہانی بُن سکتے ہیں۔تو یہ رنگا رنگی عنوانات کی، کہانیوں میں یہ ''انگارے'' سے آئی۔منٹو کرشن چندر کو ترقی پسند تحریک کا دولہا کہتے ہیں، کیونکہ اس نے مسائل کا عام طور پر راست تذکرہ کیا۔اس سے فائدے اور نقسانات جتنے پہنچ سکتے ہیں وہ سب کرشن چندر کے یہاں ہیں۔مثلاً ''اَن داتا'' میں بنگال کے قحط کا ذکر روا رکھا تھا جو اس وقت ہر بنگالی کے ساتھ بیتی تھی۔دراصل بڑا فنکار وہ ہوتا ہے جو اپنے دور کو بھی پیدا کرتا ہے اور اپنے دور کی پیداوار بھی ہوتا ہے۔تو کرشن چندر اپنے دور کی پیداوار بھی تھا۔اُس زمانے میں سب سے بڑا با کمال فنکار سعادت حسن منٹو تھا۔اُپندر ناتھ اشک کے یہاں بھی کہانی کا ادراک کسی حد تک ملتا ہے لیکن اس میں بے کلی (منٹو جیسی) اس حد تک دکھائی نہیں دیتی۔عصمت چغتائی کے یہاں عورت کے مسائل تھے، وہ قابل ستائش ہیں۔ترقی پسند دور میں ہمیں بہت سی اچھی کہانیاں ملیں۔اس وجہ سے اس وقت اردو کہانی نے زندگی سے جوڑنا سیکھا۔جوڑنے کے بعد بڑی معصومیت سے شخصی کہانیاں جو ہیں، اس نئے جبر سے گزر گزر کر بنتی چلی گئیں، ٹھیک تھا۔لیکن جب وہ تبلیغ پر اتر آئے، کہانی انحطاط کا شکار ہونے لگی۔تحریک میں زوال آ گیا۔اس کے

بعد پھر جدیدیت پسند لوگ آ گئے۔

سوال:کیا ترقی پسند تحریک ،اشتراکیت کے منشور کے تحت ہی کام کرتی رہی ہے ،کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے زوال کے اسباب یہی ہیں؟

جواب: ترقی پسند تحریک میں زیادہ تر لوگ اشتراکی تھے۔لیکن تحریک اشتراکیت کا راست ذریعہ بن گئی تو کہانی انحطاط پذیر ہونے لگی۔کہانی کسی سلوگن کا نام نہیں ہے۔یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ میں نے کہانی لکھی ہے، کہانی پڑھ کے قاری اپنے نتیجے آپ اخذ کرے تو صائب ہے وہ بات میں۔لیکن اگر میں راست اسے نعرہ بنا کر پیش کر رہا ہوں اور خواہش رکھتا ہوں کہ آپ اس نعرے میں شامل ہو جائیں تو سیدھا ہی سیاسی پارٹی کا ممبر بن کر اس کا کام کیوں نہ کیا جائے۔کہانی کا رول کیا ہے یہ سارے اسباب پیدا ہونے لگے، جو ترقی پسند تحریک کی بعض سچائیاں، بعض قدریں تھیں ان سے ہٹ کر فنی طور پر افادیت تھی اور وہ مشکوک ہونے لگی۔

سوال:کیا جدیدیت رجحان سے تحریک میں تبدیل ہو گئی؟

جواب: ہم جدیدیت کو تحریکی عمل کہہ سکتے ہیں۔ان دنوں آپ کے سر پر ایسا بھوت سوار کیا گیا تھا کہ آپ نعرہ لگا کے کہانی میں، کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو پیش کیجیے۔سیاسی عمل میں شامل ہو کر کہانیاں لکھئے، جو غلط تھا۔اس کے خلاف تحریکی عمل کی ضرورت تھی۔ جب جدیدیت پردے پر نظر آنے لگی بہت سے لکھنے والے خوش ہوئے۔چلئے اس سلوگن کو روکنے کا ایک عمل شروع ہوا ہے۔جدیدیت اصل میں ایک رجحان ہی ہے۔یعنی کہ میں کہتا ہوں کہ میں نے نجی طور پر زندگی کو بھوگا ہے۔کسی سچائی کے لیے۔وہ سچائی میری زندگی کے سیاق میں اس طرح شکل اختیار کر لیتی ہے جو عوامی نعرے میں منتقل نہیں ہو سکتی تو یہ ساری باتیں تو یہ ساریا تیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔جدیدیت تحریکی عمل سے پیدا ہو کر بھی ایک رجحان ہی بنا ہے۔جدیدیت اصل میں ایک رجحان ہی ہے، تحریک نہیں ہے۔

سوال:کیا واقعی مابعد جدیدیت اردو ادب میں اپنی روپ ریکھائیں بنا رہی ہے؟

جواب: آپ کو سوچنا ہو گا کہ مابعد جدیدیت سے آپ کیا مطلب لیتے ہیں۔یعنی پہلے ترقی پسند تحریک، جدیدیت ایک رجحان کے طور پر تو مابعد جدیدیت میں ہم جن باتوں کا ذکر روا رکھتے ہیں وہ دراصل اپنے بنیادوں پر جدیدیت کا حصہ ہیں۔مثلاً کوئی کہانی ہے، نعرہ اس میں نہیں، وارداتیں ہونی چاہئیں۔مابعد جدیدیت کا اصرار ہے کہ کہانی صرف وہی نہیں جو فنکار نے دی ہے، اُس میں قاری شامل ہو جاتا ہے۔قاری اپنے معانی، اس کہانی کو عطا کرتا ہے جو ہو سکتا ہے کہانی لکھنے والے سے یکسر مختلف ہوں۔یعنی میں نے ایک خاص واردات کے تحت کسی کہانی کو رچا ہے، آپ نے اسے پڑھتے ہوئے اپنے تلازموں میں کچھ اس طرح بسا لیا ہے کہ کہانی میں آپ کو اپنے معانی نظر آنے لگتے ہیں۔یہ بھی جدیدیت کا کا صا تھا جسے واضح خطوط میں مابعد جدیدیت نے پیش کیا۔جدیدیت فنکار کی

آزادی کے طور پر آئی تھی تو مابعد جدیدیت کا یہی اصرار ہے کہ پوری آزادیاں روا رکھی جائیں۔قدروں کا پاس رکھنے کے باوجود آپ کسی قدر کو جب جبر کے طور پر برتنے لگے تو وہ فن کا حصہ نہیں بن پائے گی۔یہ ساری باتیں جو جدیدیت کی تھیں مابعد جدیدیت کا جو لیول تھیوری کی سطح پر، عملی سطح پر مابعد جدیدیت میں ان پر اصرار ہونے لگا۔یہ باتیں اپنی بنیاد میں جدیدیت میں بھی تھیں اور کسی حد تک زندگی سے جڑنے پر جو اصرار ہے مابعد جدیدیت میں، کسی حد ترقی پسندوں میں تھا۔لیکن ان ساری چیزوں میں ترمیم واقع کرنے، ایک ایسی ادا سے پیش کرنا کہ پہلے جو کنفیوژن واقع ہو گئے تھے، انہیں صاف کردیا۔مابعد جدیدیت میں جتنی باتیں آرہی ہیں میرا خیال ہے کہ یہ باتیں ترقی پسند، جدیدیت اور کلاسیکی دور کی دین ہیں۔میں سمجھتا ہوں مابعد جدیدیت اس لیے اہم ہے کہ اس نے اولین دور کے طلسمانہ ترقی پسند دور کے نعرے بازی کو دور کیا اور اوڑھے ہوئے مصنوعی رویے جدیدیت کے جو تھے، ان سے بھی فنکار کو باہر لانے کا جتن کیا۔

سوال: آپ نے اپنے فن و فکر کو کس رجحان یا تحریک سے وابستہ کیا ہے؟

جواب: میں اپنے آپ کو کسی تحریک سے وابستہ نہیں سمجھتا۔ترقی پسند دور کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔وہ اس طرح سے کہ انہوں نے زندگی کے اس کو جوڑا۔لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے یہاں بھی تحریکی کھٹ کھٹ پیدا ہونے لگی ہے۔نعرے میں وہ بٹنے لگے ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ میں ان نعروں میں شامل ہونا پسند نہیں کروں گا۔جدیدیت کا دور آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔انہوں نے جو علم بلند کیا ہے نعرہ بازی کے خلاف، اس کو دیکھ کر مجھے ڈھارس سی بندھی۔لیکن انہوں نے بھی علَم اس طرح کھڑا کیا کہ تحریکی لہجہ اختیار کرلیا۔تحریکی لہجہ اختیار کرتے کرتے وہ جو ترقی پسند تحریک میں بعض سطحیں پیدا ہوئی تھیں، جو غیر خوشگوار تھیں، یہاں بھی وہ سطحیں پیدا ہونے لگیں۔میں ذاتی طور پر اپنی آزادیوں کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ایک فنکار کی حیثیت سے میرا یہ اصرار ہے کہ میں خالص واردات پر جانا چاہتا ہوں۔میرا جو ادب ہے وہ زندگی نمائندگی نہیں کرتا۔وہ زندگی کی ایک متوازی شکل ہے، ہو بہو زندگی ہے۔جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ادب زندگی کی نمائندگی کرتا ہے تو آپ ایک کنفیوژن پیدا کرتے ہیں۔ایک رپورٹ پیش کر کے بھی زندگی کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔لیکن میں زندگی کو اس کی پوری دھڑکن سے اٹھا کے اسے متوازی زندگی میں پیش نہ کرسکوں تو مین سمجھتا ہوں کہ زندگی میں پوری طرح مطمئن نہیں ہو پاؤں گا۔میرے یہاں آرٹ ایک متوازی زندگی کی شکل ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر افسانہ ایک نئی تیکنیک کے ساتھ تخلیق ہوتا ہے، کیا یہ سچ ہے؟

جواب: تیکنیک از کود کوئی شئے نہیں ہے۔تیکنیک لا دکر اگر کوئی لکھتا ہے مثلاً بیانیہ، علامتی، تجریدی لکھتا ہے تو اس کا الگ ڈھنگ ہوگا جیسے زندگی میں ساری چیزیں ہو بہو نظر آنے کے باوجود جب آپ بڑے دھیان سے دیکھتے

ہیں تو اپنے آپ کو شامل کرتے ہیں، اس میں کہیں تجریدی بن جاتی ہے، کہیں لگتا ہے کہ اسے بیان کیا جا رہا ہے، کہیں یوں لگتا ہے کہ وہ تصویر ہے پوری، ٹھوس اور صاف صاف نظر آرہی ہے۔کہیں لگتا ہے کہ اشاریہ سا ہے جو بہت دور تک لے جاتا ہے۔تو اسی طرح آپ اپنی کہانی کے فنی تقاضوں کو محسوس کر کے اسے یہ شکل دیتے ہیں۔وہ اصل ہیئت میں آجاتی ہے۔اس کی طبع زاد ہیئت کو دریافت کر لیتے ہیں تو آپ کی کہانی میں آوازیں شامل ہو جاتی ہیں۔وہ بسنے لگتی ہیں۔کہانی میں ہمیں کوئی تیکنیک پیش کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی تیکنیک کے توسط سے کہانی کو بسنا ہوتا ہے۔

سوال: آپ کے افسانے بالخصوص ’بستیاں‘ میں شامل افسانے کھلے ڈلے انداز میں تخلیق ہوئے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ وجہ تو آپ ڈھونڈیں۔میں کوشش کرتا ہوں کہ شروع سے ہی کھلے ڈلے انداز میں لکھوں۔آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ فنکار میں دھیرے دھیرے سوجھ بوجھ نہیں آتی بلکہ یکلخت آجاتی ہے۔میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ آپ کو ایک عمر درکار ہوتی ہے۔سوچنے اور سمجھنے کے لیے، آپ کسی چیز کے اندر گھستے چلے جاتے ہیں۔آپ کے ادراک میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور آپ کو ضرورتیں دریافت کرنے میں وہ دقت شائد پیش نہیں آتی جو پہلے پیش آتی تھی، تو اس دور میں مجھے لگتا ہے کہ سب کچھ واضح خطوط میں نظر آنے لگتا تھا جو شاید کبھی کوشش سے نظر آتا تھا۔فنکار کو اس حوصلے کے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی ناکامیوں کو قبول کرے۔بڑے سے بڑا ’اچیومنٹ‘ بھی اپنی ناکامیوں کے ادراک کی بدولت نصیب ہوتا ہے۔کامیابیاں تو آپ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن اچیو (Achieve) کرنا، ناکامیوں کے ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔یہی ادراک ہر فنکار اپنی آنے والی نسل کو سونپ کر مرتا ہے۔مگر اس نسل کا حاصل بھی وہی ہوگا کہ اگلی نسل کو کچھ دے۔اس طرح سے زندگی کا تسلسل رہتا ہے اور اس طرح زندگی جو ہے خوبصورت تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

سوال: افسانچوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کے افسانچوں کے تین مجموعے ’سلوٹیں‘، ’کتھا نگر‘ اور ’پرنمے‘(۱) منظر عام پر آچکے ہیں آپ مجھے یہ بتائیں کہ افسانچے کو اردو میں کیوں فروغ نہیں مل سکا اور اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟

جواب: پہلی بات تو آپ کا یہ کہنا کہ فروغ نہیں مل سکا، شروع میں یہ سچ ہے کہ لوگ اس طرف متوجہ نہیں ہو پا رہے تھے۔اب میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے لوگ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ان کی سوجھ بوجھ کا حصہ ہے کہ ’اَن کہی‘ کی بدولت وہاں تک پہنچیں جو کہنا چاہتے ہیں۔نئی تنقید کا خاصہ ہے کہ پڑھنے والا بھی تخلیق کار ہوتا ہے۔کہانی کو پڑھ کر کہانی کتاب پر ختم نہیں ہوتی۔کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے پڑھنے

والے کے ذہن میں جہاں سے کتاب میں ختم ہوئی تھی۔تو اگر اس بات کو ذہن میں رکھیں تو افسانچہ کا بہت بڑا رول ہے یعنی افسانچہ میں ساری باتیں تو نہیں کہی جاتیں ،ایک نکتہ پر لا کر فنکار وہ ساری باتیں آپ پر چھوڑ دیتا ہے کہ آگے آپ تخلیق کریں۔افسانچہ نگار جو ہے اس اعتبار سے قاری کو اس کی تخلیق کاری کا پورا موقع عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے تلازموں میں رکھ رکھ کر کہانی کو مکمل کرتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ آنے والے دور میں افسانچہ کی اہمیت بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

سوال:**آپ کے ناول نئی تیکنیک اور نئی فکر کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُترے ھیں،کیا وجہ ھے کہ اردو دنیا نے اس طرح سے نھیں دیکھا جس طرح سے ھندی اور انگریزی والوں نے دیکھا ھے۔ویسے اردو ناقدین نے بھی خوب خوب لکھا ھے مگر قاری نے اس طرف توجہ نھیں دی،کیا وجہ ھو سکتی ھے؟**

جواب:کوئی بھی کتاب اگر ذی جان ہے تو دھیرے دھیرے بڑی ہوتی ہے۔اشتہار کی بدولت جو کتابیں راتوں رات بڑی ہو جاتی ہیں،عام طور پر بہت اہم کتابیں نہیں ہیں۔کلاسیک کا تصور جو ذہنوں میں ہے کہ فلاں کتاب کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئی تو کیونکہ اس کو ایک طویل عرصہ لگا۔بڑی کتاب جو رائٹر کی طرف سے لکھی جاتی ہے اور جسے پڑھنے والے بھی ایک طرح سے لکھ رہے ہوتے ہیں،اپنا شعور اس میں شامل کر کے،تو کلاسیک ہمیشہ بنتے بنتے بنتا ہے۔کوئی بھی اہم کتاب جو ہے اس کا معیار یہ ہے کہ وقت کی خلیج کو پاٹ سکے۔وقت گزرنے کے بعد بھی لوگ اس میں شامل ہوتے چلے جائیں۔شامل ہونے کے ان کے مفاہیم بھی اس میں شامل ہوتے چلے جائیں گے تو وہ کلاسیک کا درجہ اختیار کر کے بڑی کتاب بنے گی۔اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی رائٹر کو حوصلہ مند ہونا پڑتا ہے اور انتظار کرنا پڑتا ہے کہ شاید وہ کتاب اس کی موت کے بعد اہم ہو۔ایک اچھی کتاب لکھنے کے لیے رائٹر کو اچھا ہونا پڑتا ہے۔اسی طرح ایک اچھی کتاب پڑھنے کے لیے ایک قاری کو بھی اچھا قاری ہونا پڑتا ہے۔اچھے قاری بالاتفاق پیدا نہیں ہوتے اور اچھے لکھنے والے بھی بالاتفاق پیدا نہیں ہوتے۔

(ا)اب تک جوگندر پال کے افسانچوں کا ایک اور مجموعہ ''نہیں،رحمٰن بابو'' بھی شائع ہو چکا ہے(ادارہ جدید ادب)

''بسا اوقات جب میں زندگی کے تجربات سے گزرتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کہانی لکھنے کے عمل سے گزر رہا ہوں،اور جب میں کہانی لکھ رہا ہوتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں واقعتاً اس سارے عمل سے گزر رہا ہوں۔''
(**جوگندر پال سے گفتگو** از **سکریتا**۔انگریزی میں ہوئے انٹرویو سے اقتباس بحوالہ'بے اصطلاح')

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

بحرِ تحقیق کا شناور۔مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو ادب کی ایک جامع الحیثیات شخصیت تھے،وہ نقاد تھے،شاعر تھے،کالم نویس تھے،طنز و مزاح نگار تھے،ادبی رسائل کے مدیر تھے،سیاسی تجزیہ نگار تھے،ادب کے اعلیٰ اصناف شناس ہونے کے علاوہ ملک کے متعدد ادبی اداروں کے مشیر اور ادیبوں کے تحقیقی و تنقیدی کام میں ان کے معاون تھے لیکن ان کا فطری رجحان تحقیق کی طرف تھا،''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''مولف طاہر مسعود صاحب کو انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا:

''میرے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم مختلف نوعیت کے علمی و ادبی کام انجام دیتے رہتے تھے،انہیں دیکھ کر میں تحقیق کی طرف مائل ہوا۔بعد میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو پرانی چیزوں میں میری دلچسپی بڑھ گئی،میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے رسائل پڑھتا تھا۔اب بھی یہی کیفیت ہے کہ اگر میرے سامنے ایک پرانا اور ایک نیا علمی و ادبی رسالہ پڑا ہو تو میں پرانے رسالے کو پہلے پڑھتا ہوں،اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مجھے نئی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے یا کم ہے بلکہ بات یہ ہے کہ پرانے رسال کو پڑھتے ہوئے میں خود کو اسی عہد میں سانس لیتا ہوا پاتا ہوں''۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ان کا تعارف طالب علمی کے زمانے میں اس وقت ہوا جب وہ قلمی کتابوں کے مطالعے کے لیے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں جایا کرتے تھے۔ایک دن مولوی صاحب نے اس لڑکے کو جس کا خاندانی نام عبدالحی تھا،دیکھا تو دریافت کیا:

''تم کون ہو؟اور یہاں کیوں آتے ہو؟''

انہوں نے بتایا کہ''میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں سے دلچسپی ہے۔''

بابائے اردو بہت خوش ہوئے اور جب ان کے ارشاد پر کسی قلمی نسخے کے چند اقتباسات درست نقل کر دیے تو بولے:''حیرت ہے تم نے اس دکنی زبان کے مسودے کو بالکل صحیح پڑھ لیا ہے۔''

مشفق خواجہ نے جواب دیا''میں پنجابی ہوں،اس وجہ سے اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔پنجابی اور دکنی زبان میں بڑی مشابہت ہے،اس لیے پنجابی جاننے والوں کے لیے دکنی زبان کو پڑھنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔''

اس کے بعد مولوی عبدالحق انہیں نہ صرف مختلف کام دینے لگے بلکہ جب مراسم گہرے ہو گئے اور وہ جامعہ

کراچی سے فارغ التحصیل ہوگئے تو مولوی صاحب نے ان کا تقرر انجمن ترقی اردو میں کر دیا جہاں انہوں نے اپنی نوجوانی کے ساڑھے چار سال ان کے سایہء عاطفت میں گزارے اور تحقیق کے اس شوق کو پروان چڑھایا جو انہیں اپنے والد مرحوم سے ورثے میں ملا تھا۔ انجمن ترقی اردو میں انہوں نے ماہنامہ ''قومی زبان'' اور سہ ماہی ''اردو'' کی ادارت کی جو بنیادی طور پر تحقیق ادب کے رسائل تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں ''قاموس الکتب'' کا مدیر مقرر کرنے کے علاوہ ان سے ''لغت کبیر'' کی تدوین میں بھی مدد لی۔ خواجہ صاحب راوی ہیں کہ:

''ان (مولوی صاحب) کے پاس لغت کا مسودہ ہوتا اور میرے پاس پرچیاں، جن پر اسناد لکھی ہوتی تھیں...... میں سند پڑھتا اور مولوی صاحب متعلقہ جگہ اسے درج کر دیتے تھے۔ یہ کام بعض اوقات تین چار گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔''

تحقیق کا کام چونکہ بنیادی طور پر حقیقت کی دید و دریافت کا کام ہے اس لیے اس میں دستاویزی شہادت اور سندی ثبوت بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ''لغت کبیر'' کے سلسلے میں ان سے جو ریاض کرایا تھا، اس کے ثمرات مشفق خواجہ نے بعد میں اپنے تحقیقی کارناموں کی صورت میں سمیٹے۔ تاہم اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے اس دور میں جن بزرگ ادیبوں کی مجالس سے فیض اٹھایا ان میں سیّد ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، اور شان الحق حقی کے نام اہم ہیں جن کے قاموسی مزاج میں تحقیق و جستجو کے عناصر بے پایاں تھے، انجمن ترقی اردو کے ساتھ وابستگی، مولوی عبدالحق کی سرپرستی اور موخرالذکر محققین سے تعلق خاطر سے مشفق خواجہ نے بطور محقق اپنی جو مزاج سازی کی وہ اس شعر کے مصداق تھی۔

سودا نگاہ دیدہ تحقیق کے حضور — جلوہ ہر ایک ذرے میں ہے آفتاب کا

تاہم میرا خیال ہے کہ مشفق خواجہ نے اردو کے قدیم سرمائے کی تحقیق جس خضوع و خشوع کے ساتھ کی ہے وہ ذرے میں آفتاب کا جلوہ دیکھنے کا عمل ہی نہیں ہے بلکہ گم شدہ خورشید کی بازیافت کرنے کی کوہ کنی بھی ہے۔

مشفق خواجہ کا پہلا تحقیقی کارنامہ ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' ہے جو ۱۸۴۸ء میں سعادت خان ناصر نے مرتب کیا تھا۔ اس تذکرے کی تحقیق ترتیب و تدوین اور تقابلی تصحیح پر انہوں نے مولوی عبدالحق کے مشورے سے کام کیا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تالیف ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' کے مطابق اب تک اس تذکرے کے چار مخطوطوں کا سراغ لگا ہے جن میں سے ایک خدا بخش لائبریری پٹنہ میں، دوسرا مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں، تیسرا لکھنو یونیورسٹی کے کتب خانے میں اور چوتھا خطی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مشفق خواجہ نے ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' کے مقدمے میں ان چاروں مخطوطوں کی تفصیلات کے علاوہ متون اور شعرا کی تعداد کا فرق بھی واضح کر دیا ہے۔ ان چاروں نسخوں کی روشنی میں اس تذکرے میں شعرا کی تعداد کا تعین ۴۲۸ کیا گیا ہے اور یہ مشفق خواجہ کی تحقیقی ژوف نگاہی کا نتیجہ ہے۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ

گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف، گلدستہ حیدری مولفہ حیدری، انتخاب دواوین مولفہ امام بخش صہبائی اور گلدستہ نازنیناں مولفہ کریم الدین کے بعد یہ تذکرہ پانچواں تھا جو فارسی زبان کے برعکس اردو میں لکھا گیا اور اس میں زیر تذکرہ شاعر کے علاوہ اس کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ شعرا کے حالات حیات کی تفصیل اور ادبی معرکہ آرائیوں کے علاوہ ادبی، سماجی اور معاشرتی فضا اور لطائف و حکایات کا تذکرہ بھی درج ہے جن سے بعد کے تذکرہ نگاروں بالخصوص محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں استفادہ کیا۔ مشفق خواجہ کے بقول

''ناصر نے تذکرے کا نام ''خوش معرکہ'' محض اس بنا پر لکھا تھا کہ اس میں شعرا کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات درج ہیں۔''

میر علی اوسط رشک نے تاریخ اس مصرع سے نکالی:

''تاریخ یہی پائی خوش معرکہ زیبا''

چنانچہ اس کا نام ہی ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' رکھ دیا گیا۔ اس تذکرے میں میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا سے لے کر مولف سعادت خان ناصر تک قریباً ایک صدی کے شعرا کا تذکرہ موجود ہے جس کی تحقیق شدہ دو جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں پروفیسر حمید احمد خان کے دور میں شائع ہوئیں۔ تیسری جلد جو تعلیقات پر مشتمل ہے تا حال شائع نہیں ہوئی اور مشفق خواجہ کی وفات کے بعد شاید کبھی منظر عام پر نہ آئے۔ اس تذکرے پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے رائے دی ہے۔

''مشفق خواجہ اس وقت...... نسبتاً نو مشق اور نو عمر تھے لیکن انہوں نے ذہن کی جس پختگی اور تلاش و توازن کی جس مزاولت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اس کا اندازہ اس تذکرے کے طویل مقدمے اور اس کے ساتھ شامل تحقیق نامے سے ہوتا ہے۔ تعلیقات اور مختلف مسائل اور مباحث پر علمی گفتگو کے لیے ''تحقیق نامے'' کی یہ اصطلاح بھی مشفق خواجہ ہی کی ایک دین ہے۔''

مشفق خواجہ کا تحقیقی نوعیت کا دوسرا بڑا کام ''جائزہ مخطوطات اردو'' ہے جو ۸۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ صرف پہلی جلد ہے جو ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ (حال اردو سائنس بورڈ) لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ جائزہ مخطوطات اردو کا منصوبہ مشفق خواجہ کے ذہن سے ان کے تحقیقی کام کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کے بارے میں انہوں نے طاہر مسعود صاحب کے انٹرویو میں بتایا:

''جب میں تحقیقی کام شروع کیا تو مجھے اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں، مثلاً میں نے کسی شاعر کے حالات جاننا چاہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اس کے بارے میں میں اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے تو مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کسی شاعر کے قلمی نسخے کہاں کہاں دستیاب ہوں گے تو اس سلسلے میں راہنمائی کے لیے کوئی بھی کتاب موجود نہیں تھی۔ لہٰذا یہ سوچ کر کہ تحقیق کرنے میں جو دقتیں مجھے پیش آ رہی ہیں وہ دقتیں یقیناً

دوسروں کو بھی درپیش ہوں گی، میں نے جائزہ مخطوطات اردو پر کام شروع کر دیا۔"

"اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ فرض کیجئے آپ ناسخ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو میری یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ دنیا بھر میں ناسخ کے دیوان کے کتنے قلمی نسخے ہیں اور ان کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ کس دیوان کے کتنے ایڈیشن چھپے ہیں، غرض کہ ناسخ کے بارے میں قدیم تذکروں سے لے کر آج تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان سب کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں مل جائے گی۔ اس طرح میری یہ کتاب محققوں کے لیے تحقیق کی راہ میں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرے گی۔"

جائزہ مخطوطات کی اس پہلی جلد میں دو سو مخطوطات پر ضروری، کارآمد اور مفید معلومات ہی نہیں دی گئیں بلکہ متعدد کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں تحقیقی مسائل بھی چھیڑے گئے ہیں اور مشفق خواجہ نے خود اپنے نتائج اخذ کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ مزید براں مخطوطات کے مصنفین کے سوانح اور ان پر لکھی گئی کتابوں کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ مشفق خواجہ کا یہ منصوبہ دس جلدوں پر مشتمل تھا۔ وہ اس پر اپنے دوسرے ادبی کاموں کے ساتھ ساتھ مسلسل کام کر رہے تھے اور دوستوں کو اس کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے لیکن اب ان کی اشاعت معرض خطر میں پڑ گئی ہے۔ مشفق خواجہ کی وفات سے اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور اعلیٰ ترین کام بھی ادھورا رہ گیا ہے۔ جائزہ مخطوطات اردو کی پہلی جلد پر ممتاز محقق رشید حسن خان نے لکھا تھا:

"بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو بظاہر ایک ادارے کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں دل لگا کر اور نظر جما کر کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اب تک جو کام کیے ہیں وہ ان کی قابل رشک صلاحیت کے شاہد عادل ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو گروہ بندی سے اور ادبی و غیر ادبی جوڑ توڑ اور خفیف الحرکاتی سے دور رکھا ہے۔ وہ حصول دنیا کے سلسلے میں ابھی تک ہوس کے اسیر نہیں ہو پائے ہیں اور علم و ادب کی عظمت اور تحقیق کی صبر آزمائی کے قائل ہیں"۔

دل لگا کر اور نظر جما کر کام کرنے کی ایک اور مثال مشفق خواجہ کی کتاب "غالب اور صغیر بلگرامی" ہے۔ صغیر بلگرامی شاگردانِ غالب میں اس لیے نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ غالب سے ۴۶۸۱ء میں تعلق پیدا ہونے اور صرف دو اڑھائی ماہ کی صحبت غالب سے استفادہ کرنے کے باوجود ان کا معنوی سلسلہ اب تک زیر بحث رہتا ہے۔ ان کے نام غالب کے چھ خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی شخصیت کو "تذکرہ جلوۂ خضر" کے متعدد مبالغہ آمیز اور غلط بیانات نے داغدار کر رکھا ہے۔ مشفق خواجہ نے ان کے پوتے سیّد نور احمد بلگرامی کے صاحبزادے سیّد وصی احمد بلگرامی سے وہ کاغذات، مسودات اور خطوط حاصل کیے جو انہیں وراثت میں ملے تھے۔ وصی بلگرامی کے ذخیرہ کتب کو بالاستیعاب دیکھا اور پھر یہ کتاب تحقیقی ژوف نگہی سے تالیف کی جس سے غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات کی پوری تفصیل سامنے آ جاتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف صفیر بلگرامی کی زندگی کا مرقع ہے بلکہ بقول مالک رام

"غالب اور صفیر بلگرامی کے ذریعے سے کئی چیزیں پہلی مرتبہ منظر عام پر آ گئی ہیں، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ مآخذ میں سے کوئی ایسی تحریر جس سے ان دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو اب غیر مطبوعہ نہیں رہ گئی" یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی کے عرصے میں کسی محقق نے اس کی معلومات میں نیا اضافہ کیا ہے اور نہ اس کی کسی بات کی تردید کی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی مشفق خواجہ کی تحقیق نگاری کی منفرد مثال ہے۔

مشفق خواجہ کی تحقیقی بازیافت کا ایک اور ثمر "اقبال از احمد دین" ہے۔ یہ کتاب مولوی احمد دین نے اقبال کی زندگی میں ۳۲۹۱ء میں لاہور میں چھاپی تھی لیکن اشاعت سے پہلے ہی اقبال نے اس کاوش کو پسند نہ کیا، کتاب نہ شائع کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں اقبال کی بعض طویل نظمیں شامل تھیں جن میں اقبال نے ترمیم و تنسیخ کر دی تھی، انہیں دنوں اقبال اپنا مجموعہ کلام "بانگ درا" مرتب کر رہے تھے چنانچہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر مولوی احمد دین کی کتاب شائع ہوگئی تو اقبال کے مجموعہ کلام کی فروخت پر منفی اثر پڑے گا۔ مولوی احمد دین اقبال کے مداح تھے، انہیں اقبال کے تاثر کا پتہ چلا تو انہوں نے تمام نسخے نذر آتش کر دیے۔ تاہم تین سال کے بعد ۶۲۹۱ء میں کچھ ترامیم کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع کر دیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ دوسرے ایڈیشن کا خاکہ تیار کرنے میں اقبال کے مشوروں یا کم از کم اعتراضوں کو بہت ممکن ہے پیش نظر رکھا گیا ہو۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ پہلے ایڈیشن کے دو نسخے بھی کسی طرح ضائع ہونے سے بچ گئے تھے۔ مشفق خواجہ نے ان دونوں ایڈیشنوں کو بازیافت کیا اور انہیں سامنے رکھ کر ایک نیا نسخہ تیار کیا جو ۹۷۹۱ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا۔ انہوں نے ان تمام تبدیلیوں کی نشاندہی کی جو مولوی احمد دین نے دوسرے ایڈیشن میں کی تھی۔ اردو ادب میں مولوی احمد دین کی شخصیت "سرگزشت الفاظ" کے مولف کی حیثیت میں بہت معروف ہے۔ اقبال کی زندگی میں ان پر تنقیدی کتاب لکھنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ اس وقت تک اقبال پر چند چھوٹے چھوٹے مضامین اور مختصر سی ضخامت کی انگریزی کتاب "مشرق سے ایک آواز" (A Voice From East) چھپ چکی تھی لیکن تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب مولوی احمد دین ہی نے لکھی جو اقبال کی شخصیت کے بھی شناسا تھے۔ مشفق خواجہ کو اس کتاب کی بازیافت اور تدوین نو ہی کا اعزاز حاصل نہیں بلکہ منفرد عطایہ بھی ہے کہ انہوں نے مولوی احمد دین کے مستند سوانح بھی مرتب کیے ہیں جو ان کی تحقیقی دیدہ ریزی کا ایک اور بے مثال نقش ہے۔

مشفق خواجہ کی ایک غیر مدون کتاب "پرانے شاعر۔ نیا کلام" ہے جو رسالہ "غالب" کراچی میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ یہ تذکرہ ان شعرا کا ہے جو زمانے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن اپنے زمانے میں "تازہ گویانِ سرآمد روزگار" میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ فضل علی ممتاز، جسونت سنگھ پروانہ، ولی اللہ محبّ، خواجہ احسن الدین خان بیان، مرزا محمد رضا قزلباش خان امید۔ اردو کے ان کلاسیکی شعرا کا وجود اب تذکرہ میں تو

مل جاتا ہے لیکن ان کے کارناموں کو کسی محقق نے شمار کرنے کی کوشش نہیں کی، مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی اسلوب میں انہیں اس طرح بازیافت کیا کہ بیسویں صدی میں ان کی نشاۃ ثانیہ برپا ہوگئی۔ خواجہ صاحب نے ان پرانے شعرا کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا جو آج بھی پسند کیے جاسکیں۔

''تحقیق نامہ'' مشفق خواجہ کے چھ مضامین پر مشتمل تحقیقی کتاب ہے۔ ان میں سے دو مضامین ''سعادت خان ناصر اور اس کا تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' اور احمد دین (مصنف: اقبال) ان کی مرتبہ کتابوں کے مقدمے ہیں جو ان کتابوں کے ساتھ بالترتیب ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے ان مضامین میں نہ صرف یہ کہ اپنی بعض غلطیوں کی تصحیح کی بلکہ بعض نئے مآخذ کی روشنی میں مباحث کا اضافہ بھی کیا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مشفق خواجہ اپنی تحقیق کو ''حرف آخر'' شمار نہیں کرتے تھے بلکہ نیا مواد سامنے آجاتا تو نہ صرف اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کرتے بلکہ نئے مباحث بھی ابھار دیئے۔ میرزا محمد رضا قزلباش خان امید، مرزا جعفر علی حسرت اور شاہ قدرت اللہ قدرت کو بھی انہوں نے مکمل حوالوں اور نئے مواد سے استفادہ کے بعد پیش کیا ہے۔ ''تذکرہ گلشن مشتاق'' پر مضمون ۱۹۷۴ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی کا تذکرہ ''نشتر مرغ'' شائع نہیں ہوا تھا۔ ''گلشن عشق'' میں اس تذکرے سے استفادہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کو بھی اپنی رائے میں تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوگئی جس کا ذکر انہوں نے اس کتاب کے دیباچے میں کردیا ہے۔ یہ تفصیلی مطالعے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں چلنے والی ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور'' سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی اور اسے برصغیر کے ایک ممتاز محقق کے نام معنون کیا گیا ہے جس سے مشفق خواجہ کی بزرگ شناسی کا زاویہ سامنے آتا اور ان کی عقیدت کا نقش قائم ہوجاتا ہے۔ انتساب یوں ہے:

''نہایت ادب کے ساتھ
محترم مالک رام صاحب
کی خدمت میں
جن کی تحریروں سے میں نے لکھنا سیکھا اور جن سے
مل کر بقول حالی لفظ آدمیت کے معنی معلوم ہوئے۔''

مشفق خواجہ کی زندگی کی آخری تحقیقی کتاب میرزا یاس یگانہ چنگیزی پر ہے جو ۱۹۸۳ء میں اس وقت شائع ہوئی جب علالت کا ایک دور ہسپتال میں گزار کر وہ بظاہر صحت مند ہوکر گھر آ گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرزا یگانہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔ ان کی خوش قسمتی سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انہیں اپنی وفات کے بہت عرصے کے بعد مشفق خواجہ جیسا قدر دان میسر آ گیا جنہوں نے یگانہ کہ نہ صرف ایک مستقل موضوع کی حیثیت میں جزو

حیات بنالیا بلکہ یگانہ کی تحقیق میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیں اور اپنی بصارت و بصیرت کے چراغوں سے وہ کرنیں جمع کیں جو آج یگانہ کی زندگی کو نہ صرف منور کر رہی ہیں بلکہ تحقیق کا ایک ایسا مثالی نقش بھی پیش کرتی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہے۔ یگانہ پر اپنے تحقیقی کام کا آغاز مشفق خواجہ نے کئی برس پہلے اس وقت کیا تھا جب انہوں نے اپنے رسالہ ''تخلیقی ادب'' میں یگانہ پر ایک گوشہ مختص کیا اس کے بعد خواجہ صاحب اپنی تحقیقی فطرت کے مطابق مواد کی تلاش میں سرگرم جستجو ہوگئے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس کتاب کی تکمیل کے لیے مشفق خواجہ نے کتنی دیدہ ریزی کی اور اپنی زندگی کے متعدد ماہ و سال کے علاوہ اپنی صحت بھی اس کتاب کی نذر کردی۔ اس کتاب کی خوبی صرف یہ نہیں کہ اس میں یگانہ کا تمام مطبوعہ، غیر مطبوعہ، مدون اور غیر مدون کلام تحقیقی صحت کے ساتھ جمع کردیا گیا ہے بلکہ ہر تخلیق کا زمان و مکان، اشاعت کا ماہ و سال اور کتاب یا جریدے کا نام بھی دیا گیا ہے جس ادیب سے کتاب کا مواد حاصل کیا ہے اس کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ اہم بات یہ کہ متن کی تصحیح کے ساتھ یگانہ کی فرہنگ بھی پیش کردی گئی ہے۔ جو صرف یگانہ سے مخصوص ہے۔ اس طرح صدہا ایسے الفاظ اس کتاب میں از سر نو دریافت ہوئے ہیں جو خزینہ یگانہ میں مدفون تھے۔ مزید خوبی یہ ہے کہ یگانہ کی سب کتابوں کا پورا متن، خود نوشت حالات، دیباچے اور بعض غزلوں کے قلمی عکس اور سابقہ بعض ایڈیشنوں کے سرورق بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مشفق خواجہ کا معراج کمال اس کتاب کے حواشی میں ظاہر ہوتا ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایسی کتاب ہے جو ایک نظر میں آپ کے دل و نگاہ کو مغلوب و مسحور کردیتی ہے۔ بلاشبہ یہ کلیات یگانہ ہے لیکن اب یہ بجا طور پر ''نسخہ مشفق خواجہ'' بھی معروف ہوگی اور آئندہ جو کام بھی یگانہ پر ہوگا اس کا بنیادی ماخذ یہ کتاب ہوگی۔ میرے دوست نقاد احمد زین الدین نے درست لکھا ہے:

''مشفق خواجہ نے کلیات یگانہ کی ترتیب و تدوین کے اس مشکل ترین اور صبر آزما تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اپنی بقا کا سامان فراہم کردیا اور ہمیں بیگانگی کی ''سحر آسا'' دھند سے نکال کر ''یگانہ آشنا'' کردیا''۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ نے یگانہ پر جن سات مزید نایاب کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا، وہ اب ان کی ناگہانی وفات کی وجہ سے شاید تادیر منظر اشاعت پر نہ آسکیں۔ کیونکہ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو وہ آفتاب تحقیق غروب ہوگیا جس کے تحقیقی کارنامے لوح ادب پر ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ اردو ادب کی صفوں سے ایک بے مثل انسان اپنا رخت حیات سمیٹ کر راہے ملک عدم ہوگیا۔ افسوس، اے وائے افسوس!

''وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کرلیتی ہے۔ وہ کسی بھی مصنف کے لکھے ہوئے مختلف فقروں اور پیراگرافوں اور ان پر رواں رائے زنی سے ایسی خندہ آور تلخیص تیار کرتے ہیں جو زیر نظر تصنیف کو ریزہ ریزہ کرکے رکھ دیتی ہے''
(**مظفر علی سید** مرتب 'خامہ بگوش کے قلم' سے، 'سخن در سخن' اور 'سخن ہائے گفتنی'۔ مشفق خواجہ کے کالم)

ماہیے: خاور اعجاز (ملتان)

اک حد پر رہنا ہے
لیکن دریا میں
مِل کر ہی بہنا ہے

چائے ہے پیالی میں
قیدی ہو گئے ہم
آزاد خیالی میں

کچھ دُور ہی چلنا تھا
اُس بے مہر نے پھر
رستہ تو بدلنا تھا

اندر ہی سسکنا ہے
لیکن کاغذ پر
کچھ بھی نہیں لِکھنا ہے

پیڑا ہے آٹے کا
ظالم سے یاری
سودا ہے گھاٹے کا

وعدے نہ دلاسے پر
ہم مَر مٹتے ہیں
سجنی ترے ہاسے پر

شیرا ہے جلیبی کا
کوئی بھروسہ نئیں
اُس جیسے فریبی کا

گاؤں میں اٹکے ہیں
لیکن کچھ شہری
ہم سے بھی جٹکے ہیں

ہر سمت دھماکے ہیں
کچھ دنیا اتھری
کچھ لوگ لڑاکے ہیں

دل ڈوبا جاتا ہے
ڈھولا تیرے بِن
پہلا جگرا تا ہے

ترے گال پہ تل ماہیا
رکھتے پھرتے ہیں
ہم ہاتھ پہ دل ماہیا

ہم خواب اگر ہوتے
تیری پلکوں کے
سائے میں پڑے سوتے

مہتاب نکل آیا
رات کے ملنے سے
مِرا خواب نکل آیا

تعبیر کے رستے پر
پتھر آن گرا
خوابوں کے بستے پر

پھر چاہے سو جائیں
تیری آنکھوں میں
کچھ خواب پرو جائیں

بے تاب نہیں ہوتے
بچپن سے آگے
پھر خواب نہیں ہوتے

چلنے میں گھاٹا ہے
خوابوں سے آگے
بالکل سناٹا ہے

وہ حد بھی آنی ہے
جس پر اک لغزش
بے حد امکانی ہے

خاور اعجاز

کشتی کے چاؤ میں
بہہ نکلے ہم بھی
دریا کے بہاؤ میں

غم کا انبار لگا
خُوشیوں کا میلہ
بس دن دو چار لگا

شاہوں نہ غریبوں سے
سُکھ والا لمحہ
مِلتا ہے نصیبوں سے

سونا چاندی گھر میں
جذبے رکھتے ہیں
سجنی نے لاکر میں

دل کے دروازے سے
اُس نے جھانکا ہے
کتنے اندازے سے

وعدے پیمانوں کی
کھُل گئی رستے میں
گٹھڑی امکانوں کی

بجھ جائے گی پیاس آؤ
صحرا کہتا ہے
اک دن مرے پاس آؤ

منظر ڈھہ جاتا ہے
لیکن ایک دیا
جلتا رہ جاتا ہے

رستے ہیں خلاؤں میں
مٹی ہے سر پر
اور کرنیں پاؤں میں

دریا کے نیچے سے
صحرا نکلا ہے
پانی کے دریچے سے

اک شکل دکھاتا ہے
پھر آئینے میں
بس دُکھ رہ جاتا ہے

اب طعنے دیتے ہو
جب ہاتھ آتے ہیں
کیوں جانے دیتے ہو

دونوں برباد ہُوئے
ظالم دنیا سے
لیکن آزاد ہُوئے

پکّی تھی ارادوں کی
ٹوٹ گئی لیکن
چوڑی ترے وعدوں کی

کافی یہ اشارہ ہے
اُس کے ہونٹوں پر
اک سرخ ستارہ ہے

منزل ہے نہ رستہ ہے
وہ اک گھاٹی پر
رکھا گلدستہ ہے

پتّہ بھی نہیں ہلتا
مولا دنیا میں
انصاف نہیں مِلتا

صنفوں کا ادب کرنا
ماہیا کہتے ہُوئے
کم ایک سبب کرنا

ماہیے: فراز حامدی

(جے پور)

بھارت کا نواسی ہوں
فضل ترا چاہوں
میں بندۂ عاصی ہوں

غالب بھی ہے قادر بھی
واہ تری قدرت
غائب بھی ہے حاضر بھی

ہر شئے میں تری خوشبو
وقت ترا تابع
دن رات میں تو ہی تو

تو شاہ غنی ہے تو
بندہ ترا سائل
داتا ہے سخی ہے تو

یارب ترا مجرم ہوں
اپنے گناہوں پر
میں واقعی نادم ہوں

کیا کیا نہ صبا لائی
شہرِ مدینہ سے
جب خاکِ شفا لائی

ڈالے ہے حجابوں میں
روز مجھے، آخر
ہے کون حجابوں میں

اب رقصِ جنوں کرلو
ذوقِ محبت کو
کچھ اور فزوں کرلو

انسان کہاں ہوگا
زہر بھری رُت میں
جب بچہ جواں ہوگا

اک نور اترتا ہے
چاند کی کھڑکی سے
دھرتی پہ بکھرتا ہے

لب کھول ذرا بالو
کان ترستے ہیں
کچھ بول ذرا بالو

الطاف کی بارش ہے
بات بجا لیکن
اس میں کوئی سازش ہے

جے پور میں رہتا ہوں
ٹونک وطن میرا
دونوں جگہ اچھا ہوں

پرچھائیں نہ پکڑا کر
اپنے پرایوں کو
برتاؤ سے پرکھا کر

سادھو کی جٹاؤں میں
گیان بھی ہوتا ہے
عاشق کی کتھاؤں میں

کچھ بات تو کر ماہی
میں تری بالو ہوں
دنیا سے نہ ڈر ماہی

دل کچھ نہ سمجھ پایا
راز محبت کا
پوشیدہ نہ رکھ پایا

کس بات کا جھگڑا ہے
دہر میں جو کچھ ہے
تیرا ہے نہ میرا ہے

فراز حامدی

ہر ایک سمسیّا میں
حل بھی ہے پوشیدہ
سب کچھ ہے تپسیّا میں

کہنے کو محبت ہے
ایک کو دوجے سے
دونوں کی ضرورت ہے

لوگوں کی زبانوں میں
زہر بھی ہوتا ہے
شبدوں کی دُکانوں میں

گوکل میں نراشا ہے
کرشنا ترے غم میں
ویاکل تری رادھا ہے

تاثیر میں شبنم ہوں
نام محبت ہے
ہر زخم کا مرہم ہوں

تنہائی کے گھر میں ہوں
ساتھ مرے سوچیں
لگتا ہے سفر میں ہوں

میں لوحِ جہاں پر ہوں
دیکھ مری جانب
میں حرفِ مکرر ہوں

یہ آج کے بیوپاری
فرق نہیں کرتے
غلہ ہو کہ نر، ناری

کیا رِیت تھی گاؤں میں
فیصلے ہوتے تھے
پیپل کی چھاؤں میں

انساں کو مقدر سے
بڑھ کے نہیں ملتا
دولت کے سمندر سے

گم سم ہے، حیراں ہے
آج کا ہر انساں
حیراں ہے، پریشاں ہے

طوفان میں اترو تو
ہوش نہیں کھونا
جب ڈوب کے ابھرو تو

کچھ حق کی بھی بولا کر
برف کے باٹوں سے
اچھائی نہ تولا کر

طوفان میں اترا کر
ڈوبنے والوں کو
ساحل سے نہ دیکھا کر

اے حُسن کے سوداگر!
شہر میں اندھوں کے
آئینے نہ بیچا کر

ہوتا ہے اثر بابا
سانولے رُخ پر بھی
لگتی ہے نظر بابا

پل پل ہے گھٹن بابا
آپسی نفرت سے
جلتا ہے چمن بابا

اچھا ہے جتن بابا
ہوگیا اردو میں
ماہیے کا چلن بابا

ماہیے
ناصر نظامی
(ایمسٹرڈیم، ہالینڈ)

سچائی سزا دے گی
ناصر سے تم کو
منصور بنا دے گی

حالات نے مار دیا
ہم کو غریبی کی
بہتات نے مار دیا

ہالینڈ میں رہتے ہیں
اپنے عزیزوں کی
فرقت کو سہتے ہیں

شطرنج کا کھیل کہو
یورپ کو یارو
اک میٹھی ''جیل'' کہو

شوق اونچی اڑانوں کا
رشتہ کاٹ گیا
دھرتی سے جوانوں کا

ماہیے: اکمل شاکر (پسنی)

غم اوڑھ کے سونا ہے
دکھ تیرا ساجن
اب میرا بچھونا ہے

جہلم کی ہوا بہکی
دور کہیں سجنی
پھولوں کی طرح مہکی

رخسار پہ کالا تل
کیسے بچاؤں دل
ساجن ہے مِرا قاتل

ای میل کیا تھا دل
ساجن کو میں نے
تحفے میں دیا تھا دل

مس کال ہی کر ساجن
اتنا بھی نہ تڑپا
اللہ سے ڈر ساجن

دل ایک موبائل ہے
تیرے ہونٹوں پر
پھولوں سی سمائل ہے

دل روز جلاتا ہوں
دور کہیں جا کر
پھر لوٹ کے آتا ہوں

لفظوں کو پروتا ہوں
یاد تجھے کر کے
دن رات میں روتا ہوں

رکھ ہاتھ ذرا دل پر
نام مِرا لکھ دے
پسنی کے ساحل پر

آنکھیں تری شرمیلی
پیار کی بارش میں
تری آنکھوں سے پی لی

جہلم میں ملو ساجن
پنڈی سے آگے
کچھ ساتھ چلو ساجن

میں پیار کی منزل ہوں
تو میری دھڑکن
اور میں تیرا دل ہوں

ماہیے: سنجئے گوڑبولے (پونہ)

سیلاب ہے یادوں کا
اب بھی نہیں آیا
موسم تیرے وعدوں کا

حالات نہیں لکھتے
کاغذی ٹکڑے پر
جذبات نہیں لکھتے

یہ دل کو دکھاتے ہیں
بچھڑے ہوئے لمحے
صدمات کو لاتے ہیں

بیمار کریں گے وہ
جب بھی محبت کا
اظہار کریں گے وہ

جینے کا سہارا تھا
زخم کے اندر کیوں
نشتر یہ اُتارا تھا

نفرت ہے سیاست ہے
دور تباہی کا
انسان کی وحشت ہے

ارمان تمہارے تھے
خواب میں دیکھا تو
امکان تمہارے تھے

سوچے گا وہ ہر لمحہ
پیسے کے بنا انساں
جیتا ہے تو بس تنہا

ہے روشنی پانی میں
چاند کے جیسا ہے
کردار کہانی میں

کیا چیز جوانی تھی
دیکھ کے لگتا تھا
جذبوں کی کہانی تھی

بادل سے گھنیرے ہیں
بال ترے ساجن
خوشبو کے پھریرے ہیں

ملنے کا بہانا ہے
نظروں کی بارش میں
بس کھل کے نہانا ہے

یہ جشن ہے رنگوں کا
پھول یہ کہتے ہیں
موسم ہے اُمنگوں کا

یہ کیسے نظارے ہیں
تشنہ رہے ہیں وہ
جو دریا کنارے ہیں

ظلمت کا سمندر ہے
دیکھ کے ڈرتا ہوں
کیا موت کا منظر ہے

یہ عزم دکھانا ہے
لاکھ ملے طوفاں
کشتی کو چلانا ہے

کتاب گھر

کتابوں پر تبصرے

تبصرہ نگار: حیدر قریشی

انگلستان میرا انگلستان **مصنف: یعقوب نظامی**

صفحات: 424 **قیمت:** 500 روپے **ناشر:** ادبستان۔۴۳ریٹی گن روڈ۔لاہور

یعقوب نظامی بنیادی طور پر صحافی ہیں تاہم ان کے ہاں ادبی رنگ غالب رہتا ہے۔ برطانوی اردو صحافت میں ’عقاب‘، ’آوازِ ملّت‘، اور ’راوی‘ تک ان کی صحافتی سرگرمیوں کی روداد بکھری پڑی ہے۔ان کی کتابیں ’’پاکستان سے انگلستان تک‘‘ اور سفرنامہ ’’پیغمبروں کی سرزمین‘‘ ادب اور صحافت کے سنگم کا خوبصورت اظہار ہیں۔زیرِ نظر کتاب ’’انگلستان میرا انگلستان‘‘ ان کی تازہ ترین تصنیف وتالیف ہے۔اس کتاب میں انہوں نے برطانیہ میں ایشیائی تارکین وطن کی چارسو سالہ تاریخ کوانتہائی اختصار کے ساتھ پیش کرنے کے ساتھ بریڈفورڈ کے حوالے سے بطور خاص تحقیقی کام کیا ہے۔بیسویں صدی کے نصف اول تک آباد ہونے والے ایشیائیوں کے احوال، ساٹھ کی دہائی میں آ کر بسنے والوں کے خیالات، نئی نسل کے رجحانات، خواتین کے مسائل اور ایشیائی آبادی کے مختلف معاملات کواس کتاب میں بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

تحقیقی لحاظ سے یہ ایک انتہائی مشکل اور جان لیوا کام تھا جسے یعقوب نظامی نے بڑی آسانی سے کرلیا ہے۔اس کتاب میں عزم وعمل کی حیران کن داستانیں بھی ہیں، سیرابی وسرشاری بھی ہے، دکھ، حسرتیں اور احساسِ تنہائی بھی ہے اور مختلف نوعیت کے دلچسپ قصے بھی۔

یعقوب نظامی نے کتاب میں شامل ’’اپنی بات‘‘ میں ایک بڑی سچی بات یوں لکھی ہے:

’’برطانیہ ایسا ملک ہے جہاں ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے۔انسان تو انسان یہاں پرندوں، چرندوں، حیوانوں، عمارتوں، سڑکوں کی تاریخ موجود ہے، اگر کوئی مکین یہ معلوم کرنا چاہے کہ جس مکان میں وہ رہتا ہے کب تعمیر ہوا تھا؟ اُس وقت اس پر کتنے اخراجات آئے تھے؟ اور آج تک کون کون اس مکان میں مقیم رہا؟ تو یہ تمام ریکارڈ دستیاب ہے۔اگر ریکارڈ محفوظ نہیں ہے تو برطانیہ میں آباد ایشیائیوں کا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مزاجاً تاریخ پڑھنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا پسند نہیں کرتے۔‘‘

مغربی ممالک میں فکشن کے نام پر، بالخصوص ثقافتی کشمکش کے حوالے سے جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس میں سے

گنتی کے چند افسانے ہی ایسے ہیں جو تخلیق کی اہم سطح پر پہنچتے ہیں، باقی سب کا بیان محض سطحی واقعہ نگاری سے آگے نہیں جاتا۔یعقوب نظامی کی اس کتاب کا طرزِ تحریر اتنا خوبصورت ہے کہ وہ مغربی ممالک کے ایسے بیشتر مذکورہ افسانہ نگارں کے افسانوں سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔بعض واقعات اور داستانیں اتنی حیران کن ہیں کہ ان میں یہاں کے عام افسانوں سے زیادہ ادبی اظہار ہوتا ہے۔اسی مقام پر مجھے یعقوب نظامی مغربی ممالک کے متعدد افسانہ نگاروں سے کہیں بہتر اور بڑے تخلیق کار محسوس ہوئے ہیں۔انہوں نے تحقیق جیسے کام کو عمومی طور پر تحقیقی دیانت کا دامن چھوڑے بغیر تخلیق کے قریب تر کر دیا ہے۔یہ ان کی شاندار کامیابی ہے جس پر انہیں تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں!

کھلا آسمان (کالموں کا مجموعہ) **مصنف: فیاض ناروی**

صفحات: 384 **قیمت:** 350روپے **ناشر:** میڈیا گرافکس۔A-997، سیکٹر 11-A نارتھ کراچی

فیاض ناروی طویل عرصہ تک، لگ بھگ ۳۵ سال تک پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ریٹائرمنٹ سے لگ بھگ سال بھر پہلے انہوں نے تیکنیکی حوالوں سے کالم نگاری کا آغاز کر دیا تھا تاہم ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں پی آئی اے کے لیے مشوروں کے طور پر متعدد کالم لکھے، پھر ان کالموں میں وسعت آئی اور مشوروں سے بڑھ کر ان میں ان کی یادیں بھی چمکنے لگیں۔زندگی میں جن اہم شخصیات نے انہیں متاثر کیا ان میں سے بعض کے بارے میں تعارفی اور تاثراتی مضامین بھی لکھے، ملک کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر درپیش حالات کی روشنی میں سیاسی نوعیت کے کالم بھی لکھے۔یوں ان کے رنگارنگ کالموں کا مجموعہ ’’کھلا آسمان‘‘ شائع ہو گیا۔

ملکی اور بین الاقوامی صورتحال پر لکھے کالموں میں وطن کی ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہے، شخصی مضامین میں ان شخصیات سے تعلقِ خاطر واضح ہے یادوں کی اپنی چمک ہے۔تاہم اپنے وسیع تجربہ کی بنیاد پر ائر ٹرانسپورٹ کے موضوع پر لکھے ان کے کالم نہ صرف کالم نگاری میں ان کی امتیازی پہچان ہیں بلکہ اس کتاب کا حاصل بھی یہی کالم ہیں۔متعدد شخصی مضامین میں بھی ائر ٹرانسپورٹ کا حوالہ مضامین کا جواز بنا ہے۔ابن صفی اور ڈاکٹر حمید اللہ کے بارے میں شخصی مضامین میں ان شخصیات کی اپنی قوت کارفرما ہے۔ابنِ صفی کے ساتھ فیاض ناروی کا بچپن سے تعلق رہا، سو اس بارے میں انہوں نے جتنا لکھا ہے اس لکھے کی اہمیت ہے۔ممتاز اسلامی اسکالر ڈاکٹر حمید اللہ سے رابطہ ائر سروس کے سلسلہ میں ہی ہوا لیکن ان کی علمی خدمات کے باعث ان پر لکھے مضمون میں ڈاکٹر حمید اللہ کے بارے ’’کچھ نیا‘‘ بھی سامنے آتا ہے۔

فیاض ناروی کی تحریروں میں اسلام سے وابستگی کے ساتھ فکر ونظر میں کشادگی کا احساس ہوتا

ہے۔وہ نہ صرف تنگ نظری کے مخالف ہیں بلکہ اسے پاکستان کے لیے انتہائی نقصان دہ سمجھتے ہیں۔اس کتاب میں سیاسی اوراشرافیہ طبقہ کے بعض کرداروں کے واقعات کے ذریعے ان کی شاہانہ مزاجی کے قصے بھی سامنے آئے ہیں، بین الاقوامی طور پرائرسروس کے کے انداز سے لے کر ہماری قومی ائرلائن کی سروس کے انداز کی کہانیاں ملتی ہیں۔ان میں منفی اور مثبت دونوں شامل ہیں۔بیان کردہ واقعات میں شامل بعض کرداروں کی عبرت انگیز داستانیں ہیں تو بعض کردار عزم وعمل کے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً لاہور کے مائیکل چودھری جوامریکہ میں جابسے اوراب وہاں اٹلس ائر کے مالک ہیں جن کا ہوائی بیڑہ پی آئی اے سے زیادہ ہے۔جرمنی میں مقیم پاکستانی ایم شمیم جوجرمنی میں ایک ائرکرافٹ ہنیڈلنگ کمپنی کے مالک ہیں۔ بقول فیاض قادری ایم شمیم نے نئی ائر لائن ''لفت لائن'' کا لائسنس لے لیا ہے اور جلد ہی چارٹر ائرلائن سروس شروع کرنے والے ہیں۔

فیاض ناروی عدن،فرانس، جاپان اور جرمنی میں پی آئی کے لیے خدمات انجام دے چکے ہیں۔اگر ان کی ایک آدھ بار ناروے میں پوسٹنگ ہوگئی ہوتی تو وہ نارہ کی نسبت سے ناروی ہونے کے ساتھ بین الاقوامی طور پر بھی ناروی ہوجاتے۔

شورِ بادباں(شاعری) **شاعر**:**اکبر حمیدی**

صفحات:112 **قیمت**:100روپے **ناشر**:بٹر پبلشرز، H.2029,St.32,Sect.10/2 اسلام آباد

اردوشاعری میں اکبرحمیدی کا تازہ اورساتواں شعری مجموعہ''شورِبادباں'' پیشِ نظر ہے۔یہ مجموعہ اکبرحمیدی کی غزل گوئی کے سفرکی اب تک کی کہانی سناتا ہے۔پہلے والی روانی کے ساتھ انہوں نے اس بار کچھ ایسے اوزان میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں انہوں نے پہلے غزل نہیں کہی۔اس سے قادرالکلامی تو ظاہر ہوتی ہے لیکن اکبرحمیدی کی غزل کا جوایک مخصوص بہاؤ تھاوہ گائب ہوجاتا ہے۔تاہم ایسی غزلیں کم تعداد میں ہیں۔عمومی طور پر اکبرحمیدی اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل کا سفر طے کررہے ہیں۔اس سفر میں ان کے مزاج کی خوش خیالی اورخیالات کی پرواز دونوں کا ارتقاد یکھا جاسکتا ہے۔چنداشعار سے میری بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

کس روز یہ اصرار ہمارا نہیں ہوتا — کچھ اور بھی، اتنے میں گزارا نہیں ہوتا
غزل گلی سے کئی آسماں گزرتے ہیں — زباں سنبھال کے اہلِ زباں گزرتے ہیں
کچھ اتنی تیز ہے رفتارِ عالم — زمانے بےنشاں ہونے پہ آئے
کہاں تک ذکرقیس و کوہکن کا — بہت ہم نے بھی ٹکریں ماریاں ہیں

جان پیاری ہے تو بس چلتے چلے جاؤمیاں — کیوں کھڑے ہو یہ درِیار نہیں ہے بھائی
زوروزر کا ہی سلسلہ ہے میاں — لفظ کو کون پوچھتا ہے میاں
یہاں تلک بھی ہمیں پائمال ہونا تھا — ہمیں مثال، انہیں بے مثال ہونا تھا
عجیب زاویے اس کی جیومیٹری میں ہیں — کہیں خطوط، کہیں دائرے نکلتے ہیں
عقل بھی، جذبہ بھی، دونوں مِرے ساتھی ہیں مگر — بعض اوقات میں دونوں کو اٹھا دیتا ہوں

سابقہ شعری مجموعوں کے حوالے سے ابھی تک اکبرحمیدی کے ہاں پیش آمدہ صورتحال پر صبروتحمل، دعا، اورایمان کی مضبوطی کا تاثر ملتا تھالیکن اس مجموعہ میں وہ اپنے ان رویوں سے کچھ آگے بڑھے ہیں اور برملا کہنے لگے ہیں:

کب تلک وقت ٹالنا ہوگا — راستہ تو نکالنا ہوگا
عقل بھی عشق کرنا جانتی ہے — خود کو بس اعتدالنا ہوگا
اگلی نسلوں کوکفرسازی کے — چکروں سے نکالنا ہوگا

''شورِبادباں'' میں اکبرحمیدی نے کسی بڑے شاعر،ادیب یا نقاد سے کوئی پیش لفظ یا دیباچہ نہیں لکھوایااوراس سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دیباچے کتاب کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ پھرقارئین دیباچے کےافکارکی روشنی میں ہی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔اکبرحمیدی کا موقف وزن رکھتا ہے۔انہوں نے اپنی وضاحت میں جس نکتے کوابھارا ہے یقیناً غورطلب ہے۔یوں بھی ایک طویل عرصہ تک شاعری کرنے کے بعد اکبرحمیدی اب اپنی شعری عمر کے اس حصہ میں ہیں جہاں ان کا نام ہی ان کی شاعری کا دیباچہ،پیش لفظ ،معتبر حوالہ اورسب کچھ ہے۔ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے اتنا حوالہ ہی بڑا حوالہ ہے کہ وہ اکبرحمیدی کی شاعری کو پڑھ رہا ہے۔

''شورِبادباں'' سے مزید چنداشعارپیش کرکے کتاب کا یہ تعارف مکمل کرتا ہوں۔

ملنا نہیں، رستہ بھی بدلنا ہوا مشکل — اس شہر میں اب گھر سے نکلنا ہوامشکل
جن وقتوں میں انجان تھا، آساں تھا بہلنا — اب جان لیا ہے تو بہلنا ہوا مشکل
جل اُٹھتے تھے ہم آتشیں نظروں سے بھی اکبر — اب آگ دکھاؤ بھی تو جلنا ہوا مشکل
ضد نہ کر آج پہ اتنی اکبر — ورنہ وہ کل سے مکر جائے گا
کچھ سال تو آئین بنانے میں لگے ہیں — باقی کے ترامیم کرانے میں لگے ہیں
ان حربوں سے وہ اونچا اڑا سکتا تھاخودکو — جوحربے اسے مجھ کوگرانے میں لگے ہیں

''شورِبادباں''اکبرحمیدی کی مجموعی شعری شخصیت کے تاثر کومزید گہرا کرتا ہے!

کتاب میلہ   تعارف:حیدر قریشی

ماریشس میں دھنک(سفرنامہ)   **مصنف**:**قمر علی عباسی**

صفحات:184   **قیمت**:200 روپے   **ناشر**:ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹیڈ۔اردو بازار۔کراچی

قمر علی عباسی خوش مزاج اور خوش باش سفر نامہ نگار ہیں۔''ماریشس میں دھنک'' ان کے ماریشس کے سفر کی روداد ہے۔یہ سفر اصلاً ماریشس میں ہونے والی ورلڈ اردو کانفرنس میں شمولیت کے لیے اختیار کیا گیا۔تاہم اس میں ماریشس کے جغرافیائی،ثقافتی اور تاریخی احوال کو اتنی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ ماریشس کے عوام کے لیے بھی شاید یہ علم میں اضافہ کا موجب بنے۔اردو کانفرنس کا احوال جتنا بیان کیا گیا ہے،کافی حد تک درست بیان کیا گیا ہے لیکن چند ایک خامیوں کا احساس ہوا ہے۔مثلاً عام طور پر مقررین اور مقالہ نگاروں میں فرق کی وضاحت نہیں کی گئی۔کانفرنس کے بعض اہم شرکاء کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔کشور ناہید،احمد فراز اور ندا فاضلی کے ذکر کے بغیر روداد منصفانہ نہیں کہی جا سکتی۔ان کا ذکر نہ کرنے کا جو پس منظر ہے،میں اس ناراضی میں قمر علی عباسی کو حق بجانب سمجھتا ہوں،لیکن ان سب کا ذکر کرنے سے رپورٹ ایماندارانہ ہونے کے ساتھ خود قمر علی عباسی کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی بن سکتی تھی۔اپنی اہلیہ اور ایک زمانہ کی معروف ٹی وی اداکارہ نیلوفر عباسی بھی کانفرنس میں نہ صرف شریک تھیں بلکہ انہوں نے کئی مواقع پر عمدہ تقاریر کی تھیں۔ان کا بھی کہیں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔
ان چند خامیوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر یہ کتاب ایک عمدہ اور مزے کا سفر نامہ ہے۔جسے قارئین پسند کریں گے۔

سفید جنگلی کبوتر(خاکے،تاثرات)   **مصنف**: **منوّر رانا**

صفحات:223   **قیمت**:200 روپے   **ناشر**:مژگاں پبلی کیشنز۔ J-85 ٹوپسیا روڈ،کولکتہ،انڈیا

منوّر رانا خوش فکر اور تازہ کار شاعر ہیں۔''سفید جنگلی کبوتر'' ان کے خاکوں اور تاثرات کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ان کی نثر میں بے لاگ اور کھرا سچ،شعریت میں گندھ کر سامنے آتا ہے لیکن اس میں خطابت کا آہنگ بھی محسوس ہوتا ہے جو ظاہر ہے ان کی بیان کردہ سچائیوں کا اثر ہوتا ہے۔جن شخصیات کے خاکے لکھے گئے ہیں ان کے بارے میں قاری ایک واضح تاثر قائم کر لیتا ہے۔منوّر رانا نے جو تاثراتی مضامین لکھے ہیں انہیں انشائیہ قرار دیا ہے۔یہ مضامین انشائیے تو نہیں ہیں لیکن ان مضامین کی خوبصورتی اور ادبیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ادبی تحریریں ہیں اور قاری اسے پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔منوّر رانا کو اپنی خوبصورت شاعری کے ساتھ ایسی نثر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ادب کے نام پر بوریت اور اکتاہٹ طاری کرنے والے موجودہ ماحول میں ایسی رواں نثر ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح ہے۔

تین ترقی پسند شاعر(مضامین)   **مصنف**: **علی احمد فاطمی**

صفحات: 160   **قیمت**: 150 روپے   **ناشر**:ادارہ نیا سفر۔68 غالب روڈ۔الہ آباد

پروفیسر ڈاکٹر علی احمد فاطمی معروف ترقی پسند نقاد ہیں۔ترقی پسندی سے ان کی وابستگی تو گہری ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس تحریک سے بعد کی ادبی صورتحال کو نظر انداز نہیں کرتے۔جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک ان کی نظر ہے۔ان سب سے استفادہ کے بعد وہ علمی طور پر ترقی پسند رویوں کو مزید تقویت دیتے ہیں۔''تین ترقی پسند شاعر'' ان کے مضامین کا نیا مجموعہ ہے۔اس میں ترقی پسند تحریک کے تین ممتاز شعراء علی سردار جعفری،مجروح سلطانپوری اور کیفی اعظمی کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔ان تینوں شعراء میں بعض دلچسپ مماثلتیں تھیں۔ مثلاً تینوں یوپی کے صوبہ سے تعلق رکھتے تھے،تینوں نے یوپی سے بمبئی کا رُخ کیا اور وہیں مستقل قیام کیا۔تینوں کی پیدائش دو تین سال کے وقفے سے آگے پیچھے ہوئی اور وفات میں بھی اتنا ہی وقفہ رہا۔تینوں ترقی پسند تحریک سے گہرے طور پر وابستہ رہے۔علی احمد فاطمی نے ان تینوں شعراء کے حوالے سے اپنے ان گیارہ مضامین میں علمی،ادبی اور تاریخی وتہذیبی طور پر ایک عہد کی داستان لکھ دی ہے۔

جب ایسا ہو(افسانے)   **افسانہ نگار**: **سید ظفر ہاشمی**

صفحات:240   **قیمت**:100روپے   **ناشر**:العصر پبلیکیشنز۔آمین سوسائٹی۔سرکھیج روڈ۔احمد آباد

سید ظفر ہاشمی ادبی رسالہ گلبن کے مدیر ہیں۔صاف گوئی اور بے باکی ان کا وصف خاص ہے۔اردو ادب کے ایک کم از کم معیار کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ان کا زیادہ زور اردو زبان کی بقا کے لیے کیے جانے والے اقدامات ہیں۔ادارت کے ساتھ نثر میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔''جب ایسا ہو'' ان کے افسانوں کا ایک انتخاب ہے۔یہ افسانے معروف معنوں میں جدید نہیں ہیں لیکن اپنے عہد کے سماجی اور اخلاقی مسائل اور معاملات پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ان افسانوں میں غم وغصہ،محبت،نفرت،عبرت اور عقیدت کا احساس نمایاں ہے۔ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش داخلی وخارجی سلگتے مسائل کو ان میں بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔سید ظفر ہاشمی کے مزاج کی عمومی پہچان کی طرح یہ ۲۸ منتخب افسانے بھی ان کی حق گوئی اور جرأت مندی کے غماز ہیں۔

خوابِ خوش رنگ(شاعری)   **شاعر**: **سعید روشن**

صفحات:144   **قیمت**: 150 روپے   **ناشر**:نرالی دنیا پبلیکیشنز۔نئی دہلی

سعید گل خان گلزی کا قلمی نام سعید روشن ہے،بسلسلہ روزگار کویت میں مقیم اردو کے شاعر ہیں۔ان کا گھر بار راجستھان میں ہے۔''خوابِ خوش رنگ'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔اس میں حمد،نعت،غزلیں،نظمیں اور دوہے شامل ہیں تاہم اس مجموعے کی اصل پہچان ان کی غزلوں سے ہوتی ہے۔محسن احسان اور باقی احمد پوری کے تاثرات کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں مناسب تعارف ہیں۔باقی احمد پوری نے دعا کی ہے''میں ان کی کامیابی وکامرانی کے لیے صدق دل سے دعا گو ہوں''۔۔۔۔ہم باقی احمد پوری کی اس دعا میں شامل ہو کر آمین کہتے ہیں۔

آپ کے خطوط اور ای میلز

جدید ادب پڑھ رہا ہوں۔رسالہ خوبصورت چھپا ہے۔جوگندر پال جی کا گوشہ اچھا ہے،تاہم دوسرے تنقیدی مقالات کا حال پتلا ہے۔آپ اور نذر خلیق کے کتابوں پر مضامین بہت اچھے ہیں۔ایک افسوسناک خبر ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا انتقال ہو گیا ہے۔لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صدیق جاوید کی کتاب کو سہہ نہیں سکے۔خدا ان کی مغفرت کرے۔

ناصر عباس نیر۔پنجاب یونیورسٹی۔لاہور

میں تو جدید ادب کو ایک قیمتی تحفہ سمجھتا ہوں برادرم! آپ نے تو ادبی تحریروں کا ایک خزینہ یکجا کر دیا ہے۔میرا مضمون شائع کر کے آپ نے جو مجھے اعزاز بخشا ہے،اس کا بے حد شکریہ۔اپنے مضمون کی دوسری قسط جلد ہی ارسال کروں گا۔

احمد ہمیش۔کراچی

گوشہ کے سبھی مضامین بڑی محنت اور محبت سے لکھے گئے ہیں۔صرف یہی نہیں،تم نے ان صفحات میں بعض پرانے مضامین کے تراشے بھی بڑی ترتیب سے جوڑ کر اختصار میں بھی فراواں سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔۔۔تمہارا پرچہ پہلے شمارے سے ہی مجھے بھا گیا تھا۔اب پانچویں شمارے تک آتے آتے اور بھی گاڑھا اور گھمبیر ہو گیا ہے۔میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ کوئی اچھا ادبی رسالہ کئی اعتبار سے کسی یونیورسٹی کے شعبۂ ادب سے بھی اہم تر رول انجام دیتا ہے۔خدا تمہیں اس نہایت اہم کی ہمت اور ذرائع کرتا رہے۔

جوگندر پال۔دہلی

آپ کا کام لائقِ تحسین ہے،اسے جاری رکھیں اور مخالفین کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔میری رائے ہے کہ اس سے آپ کے تخلیقی کام پر اثر پڑے گا اور مخالفین آپ کو اسی لئے الجھانا چاہتے ہیں۔

سیف اللہ سیفی۔ایمسٹرڈیم،ہالینڈ

جدید ادب ملے،میں نے ان میں سے ایک کاپی زہرہ نگاہ کو پڑھنے کو دی،دوسری عدیل صدیقی کو اور تیسری کاپی ڈاکٹر بدر منیر نیویارک لے گئے۔۔۔رسالہ دلچسپ ہے اور پڑھنے کے لیے کافی مواد ہے۔یہ کیا کہ جوگندر پال پر مضامین تو پڑھنے کو ملے مگر ان کی کوئی کہانی شامل نہیں؟۔۔۔۔۔۔
دوسری بات یہ ہے بھائی کہ کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے فائدہ! آپ اپنا کام کرتے جایئے۔کیوں ناحق ان چوروں اچکوں پر اپنا لہو جلاتے ہیں؟

مصطفیٰ شہاب۔لندن۔انگلینڈ

I have seen the new shumara of Jadeed Adab and enjoyed the most because all the time you present something new. please accept my mubarakbad.

آپ کی بات بھی درست ہے کہ جعلی شعراء کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔یہاں بھی کچھ ایسا ہی حال ہے مگر آپ کس کس کو روکیں گے؟ بہت بڑا پروجیکٹ ہے اور لگتا ہے کہ اس میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے۔خدا ہی حافظ ہے !

پرویز مظفر۔برمنگھم۔انگلینڈ

جدید ادب کا تازہ شمارہ نمبر ۵ دیکھا جس میں میری غزلیں بھی شامل ہیں۔غزلوں کی اشاعت کے لیے شکریہ قبول فرمایئے۔کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے میری پہلی غزل کے آخری شعر کا پہلا مصرعہ یوں شائع ہو گیا ہے۔
سچ ہے اس نے قسطوں پر ہی مجھ کو ٹھگا۔۔۔جبکہ مصرعہ اس طرح ہے۔ سچ ہے اس نے مجھ کو قسطوں میں ٹھگا
تازہ شمارے کی بیشتر تحریریں قابلِ مطالعہ ہیں۔نثری حصہ زیادہ جاندار ہے۔'گوشۂ جوگندر پال' کے تحت لکھے گئے مضامین پسند آئے۔بھئی جدید ادب کا جوگندر پال نمبر شائع ہونا چاہیے۔آپ کا مضمون ''چند وضاحتیں اور اصل ادبی مسئلہ''بغور پڑھا۔نام نہاد شاعر و ادیب کیسی کیسی گھٹیا حرکتیں کر رہے ہیں۔خدا انہیں عقلِ سلیم سے نوازے۔اور کیا کہہ سکتا ہوں۔خدا کرے آپ تمام بلاؤں سے محفوظ ہوں۔

کاوش پرتاپ گڑھی۔دہلی

کل جدید ادب کا تازہ شمارہ ۵ ملا،اس بار بھی رسالہ قابلِ ستائش ہے،بہت پسند آیا۔اس میں شامل معیاری تحریروں نے متاثر کیا۔''ادب دوست''میں چھپنے والے نازیبا مواد کے جواب میں آپ نے مناسب طریقے سے صورتحال واضح کر دی ہے۔''ادب دوست''میں مواد چھپوانا جعلی شاعروں کی حرکت تھی۔میں اس معاملہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ایسے جعلی شاعروں کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔

اکمل شاکر۔پسنی۔بلوچستان

جدید ادب کا پانچواں شمارہ مل گیا۔اب کے پرچہ پہلے سب شماروں سے بہتر ہے گویا جدید ادب خوب سے خوب تر کا سفر تیزی سے طے کر رہا ہے۔احمد ہمیش صاحب کا مقالہ بڑا علمی ہے،ان کے اندازِ تحریر کی سطح بہت بلند ہے،سلطان جمیل نسیم نے مشفق خواجہ صاحب پر بھرپور مضمون لکھا ہے جو بہت پُر لطف بھی ہے اور معلوماتی بھی۔خواجہ صاحب کے کئی نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔خواجہ صاحب سے میرا بھی اچھا تعلق تھا۔میری سب کتابوں کی نہ صرف رسید بھیجتے تھے بلکہ دو چار جملے تعریف و ستائش کے بھی لکھتے۔ایک مرتبہ لطیفہ ہو گیا۔میرا پنجابی غزلوں کا مجموعہ ''بکّی غزل پنجاب'' شائع ہوا تو میں نے خواجہ صاحب کو بھیجنا چاہا۔تب نظیر صدیقی صاحب حیات تھے۔میرے ذہن میں تھا کہ خواجہ صاحب پنجابی نہیں،اس لیے شاید پنجابی غزلوں سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔نظیر صدیقی صاحب خواجہ صاحب کے بھی دوست تھے اور میرے بھی۔چنانچہ میں نے صدیقی صاحب سے پوچھا کیا مشفق خواجہ صاحب پنجابی جانتے ہیں؟ انہوں نے بے خبری کا اظہار کیا۔تب میں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا اور

پوچھا کہ کیا آپ پنجابی زبان جانتے ہیں؟ ان کا خط آیا ”میں پنجابی زبان اتنی ہی جانتا ہوں جتنی نظیر صدیقی اردو“۔ میں نے صدیقی صاحب کو خط پڑھوایا تو وہ بھی اس سے محظوظ ہوئے۔ سردیوں کی ایک رات جب بارش ہو رہی تھی، رات کے دس بجے بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں جلدی سے اٹھا کہ معلوم کروں کہ ایسے موسم میں کون ہو سکتا ہے۔ دیکھا تو مشفق خواجہ صاحب اور نظیر صدیقی صاحب چھتریاں تانے موسلا دھار بارش میں کھڑے ہیں۔ خواجہ صاحب بولے ”حمیدی صاحب ہم کچھ دوست صدیقی صاحب کے ہاں بیٹھے ہیں، سوچا آپ کو بھی بلا لیں“ میں اندر سے اپنی چھتری لے کر آیا، ہم اکٹھے صدیقی صاحب کے ہاں پہنچے۔ دیکھا تو وہاں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور انتظار حسین صاحب بیٹھے تھے۔ خاصی دیر ہم خوش وقت ہوتے رہے۔ یہ وہی سال تھا جب نظیر صدیقی صاحب کو ایک ترجمے پر ایوارڈ ملا تھا۔ یہ جیوری کے حضرات تھے۔ بات اکادمی کے ایوارڈوں کی طرف مڑ گئی۔ تب خواجہ صاحب نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا: آپ کو تو پچھلے سال ایوارڈ مل گیا تھا نا؟ میں نے انکار میں جواب دیا تب خواجہ صاحب حیرت بھری نظروں سے کتنی ہی دیر میری طرف دیکھتے رہے، مگر کچھ بولے نہیں۔

میرے محترم دوست جوگندر پال کا خصوصی گوشہ چھاپ کر آپ نے مجھے نہال کر دیا۔ علی احمد فاطمی، نگار عظیم، ثروت خان، ممتاز عالم، حیدر قریشی کے لکھے مضامین ایسے عمدہ ہیں کہ ایک سے بڑھ کر ایک۔ پال جی کا نام اردو فکشن میں امر ہو گیا ہے، وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ غزلوں کا معیار اس مرتبہ خاصا بلند ہے تاہم ابھی اور توجہ دیں۔ نظموں میں جہاں میرا جی اور وزیر آغا جیسے شاعر ہوں، اس کی امارت کا کیا ٹھکانہ۔ برادرم منشا یاد کا انٹرویو بھی اس شمارے کی خصوصی چیز ہے۔ منشا صاحب نے اپنے اور اپنے فن پر اچھی باتیں کہی ہیں۔ کتاب میلہ بھی خوب ہے۔ غرض ایک بہت اچھا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ **اکبر حمیدی**۔ اسلام آباد

جدید ادب انٹرنیٹ پر پڑھنے کو ملا تو یقیناً بہت مزہ آیا لیکن کاغذ پر چھپی ہوئی تحریر کی بات ہی اور ہوتی ہے لہٰذا پرچہ ملنے پر ہی تسلی ہوئی۔ اس شمارے میں حضرت صبا اکبر آبادی مرحوم کی غزل پڑھ کر اپنے گریبان میں جھانکنا پڑا کہ ”ہر کم نظر یہ کہتا ہے پردہ اُٹھا تو ہے“ کہیں ہمیں تو اپنی لپیٹ میں نہیں لے رہا۔ بہت خوب شعر ہے۔ عاکف غنی کا جوانی کا نوحہ اب جوان تر نسلوں کا نوحہ بنتا جا رہا ہے، پتہ نہیں کیوں، یا شاید ہمیشہ سے یونہی رہا ہو۔ جمال اویسی کا ”ہونٹوں پر بربادی کے نغمے نسل ہماری مرثیہ خواں ہے“ بھی شاید یہی سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ شموئل احمد کا ”سراب“ یوں تو دو طبقوں کی کہانی ہے مگر یہ کہانی آج کے دور میں طبقوں سے نکل کر پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہے جہاں میری نسل کے کئی لوگ طبقاتی کشمکش میں نہ ہونے کے باوجود بدلتی ہوئی دنیا کے ”جیلانی“ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر بلند اقبال کا ”شکوہ“ دیوانِ غالبؔ کے پہلے شعر کی اچھی تصویر کشی ہے، وہ سوالوں کی کدال لئے ہمیشہ مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ رؤف خیر کی نظم ”بونوں کا خواب“ شاید ہم سب کو دعوتِ فکر دیتی

ہے۔ سلطان جمیل نسیم صاحب کی یادداشتیں دلچسپ ہیں۔ منشا یاد صاحب کا انٹرویو بہت اچھا تھا، منشا یاد صاحب جیسے ادیبوں کا دم غنیمت ہے جو اوروں کی طرح ظاہری معاملات میں الجھ کر بے اصول ضابطوں کے غیر قانونی تسلّط کا جواز ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ نصرت ظہیر کا ”ادبی معمے“ بہت دلچسپ ہے اور نسرین نقاش کا ماہیا ”دیوانی سی لگتی ہوں“ پرانے خیال کے باوجود خوشگوار تاثر لئے ہوئے ہے۔ آپ کے دم سے ہم لوگ سردیوں میں جدید ادب کی گرمی کا لطف اُٹھا رہے ہیں‘ آپ بھی نظر کرم کرتے رہیے‘ ہم بھی آپ کے سائے میں بیٹھے رہنے کی دعائیں مانگتے رہیں گے۔ **فیصل عظیم** (امریکہ)

سلطان جمیل نسیم نے مشفق خواجہ کی یادنگاری کا فریضہ بخوبی نبھایا۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین کا مقالہ ”سابق ریاست بہاول پور کا پہلا اہم نثر نگار“ تحقیق کے نئے باب کھولتا ہے۔ ابتدائی پیرا میں انہوں نے شہر کی بناء کا سن ۱۷۴۸ء کی بجائے ۱۸۴۸ء تحریر کیا یہ سہو ہے جو صفحہ نمبر ۳۲ کی عبارت سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سید نصیر الدین نصیؔر کی شاعری پروردان احمد کا وردان داد چاہتا ہے۔ شاعر موصوف کی ترجیع بند غنائیت کا مرقع ہے۔ صفحہ نمبر ۵۱ پر کمپوزر نے لفظ پوربی کو یورپی کر دیا ہے کیا کہوں؟ نصیؔر کی منقبت در شان علی کرم اللہ وجہہٗ کی تراکیب اور بندش یقیناً شعریت سے بھرپور کلام ہے، مگر لفظ دیوی کا استعمال نظر ثانی کا تقاضہ کرتا ہے۔

علی احمد فاطمی کی نگارش ”چار جنموں کا مسافر“ جوگیندر پال کے حوالے سے متاثر کن ہے۔ نگار عظیم شخصیت نگاری میں اچھا اضافہ ہیں جبکہ ثروت خان نے ”پار پرے“ پر مبسوط رائے تحریر کر کے ناول کا اچھا تعارف کرا دیا۔

منشا یاد سے انٹرویو ہماری معلومات میں گراں قدر اضافے کا موجب بنا۔ نصرت ظہیر کا فکاہیہ انہیں اچھے طنز و مزاح نگاروں میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کا یہ جملہ خاص طور پر مزہ دے گیا۔ ادب کی تعریف بھی فی زمانہ یہی ہے کہ جو زیادہ سمجھ میں نہ آئے وہ ادب ہے اور جو بالکل سمجھ میں نہ آئے وہ اعلیٰ ادب کہلاتا ہے۔ حیدر قریشی کے خامۂ خاص سے ”چند وضاحتیں اور اصل ادبی مسئلہ“ پر یہی عرض کر سکتا ہوں کہ بہت اچھا کیا جو بیک وقت دو جعل سازوں کو بے نقاب کر دیا۔ ماہیوں میں اقبال حمید اصل پنجابی ماہیا سے بخوبی واقف نظر آئے، رفیق شاہین نے تیسرے ماہیے میں احمد ندیم قاسمی کا وہ مضمون سادگی سے دہرایا: ؎

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا۔ نسرین نقاش کا آخری ماہیا تغزل سے مملو ہے۔

اکبر حمیدی کی نگارش ’چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں‘ کا یہ جملہ نقل کے لائق ہے ”خاکہ نگاری کو میں خاک ڈالنا یا خاک میں ملانا نہیں سمجھتا، بلکہ خاک سے اٹھانا خیال کرتا ہوں“۔ غزلیات میں بطور خاص صبؔا اکبر آبادی ’کاوشؔ پرتاب گڑھی‘ آفاقؔ صدیقی، خورشید اقبال، ترنم ریاض نے متاثر کیا رضیہ فصیح احمد کی دوسری غزل کا مزاج نظم مسلسل جیسا لگا، میں انہیں نثری حوالے سے جانتا تھا......شاعری سے تعارف خوشگوار رہے۔ شموئل احمد نے قدیم

موضوع پر اچھی نگارش بہ شکل افسانہ سے نوازا۔ان کے یہاں بہار کا مخصوص لہجہ نمایاں ہے۔حمایت علی شاعؔر کی نظم وحدہ لاشریک سے علم ہوا کہ وہ محبت میں توحید کے قائل ہیں۔فیصل عظیم کی نظم ''جمود'' روانی اور سلاست کا شاہکار ہے۔ محمد فیروز شاہ کی نظم ''اپنے اپنے دکھ'' قابل تحسین ہے۔شہناز نبی کی نیند کی ماتی کا خیال اور پیشکش اثر انگیز ہونے کے باوجود نظم ادھوری محسوس ہوئی۔منیر ارمان نسیمی نظم وغزل سے زیادہ گیت میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

حیدر قریشی کا متعارف کردہ ڈاکٹر رشید امجد کا مقالہ ''میرا جی،شخصیت اور فن'' اہل ذوق کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے۔خطوط کے ضمن میں اپنے بزرگ حمایت علی شاعر سے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ محض ماہیا یا دیگر نوزائیدہ اصناف سہ مصرعی کی بات نہیں، ہائیکو کے زیر اثر آپ نے اپنی ثلاثی پر دوبارہ دل جمعی سے نظر فرمائی جس کے لیے بندہ بہت پہلے کبھی خواستگار ہوا تھا ورنہ آپ کے کلام بلاغت نظام (ثلاثی) کے نئے نمونے ہمیں دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔ **سہیل احمد صدیقی** (کراچی)

جوگندر پال کا گوشہ اس شمارہ کی خصوصی پہچان ہے۔مضامین قابلِ توجہ ہیں لیکن ان کے ساتھ درج اقتباسات بھی مضامین جیسی اہمیت لیے ہوئے ہیں۔یوں بھی جدید ادب میں اقتباسات کی پیش کش میں جس سلیقے سے کام لیا جاتا ہے اس کے اچھے اثرات دوسرے ادبی رسائل میں بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔یہ شمارہ پہلے سارے شماروں سے زیادہ معیاری اور خوبصورت ہے۔اس کی داد بھائی نذر خلیق کو دی جانی چاہیے۔نصرت ظہیر کا فکاہیہ اور اقبال حمید، رفیق شاہین، نسرین نقاش اور شاہدہ ناز کے ماہیے مجھے بہت اچھے لگے۔اپنی تمام ترسستی اور نا اہلی کے باوجود اپنے ریکارڈ میں موجود آپ کے سارے پرانے مضامین تلاش کرنے میں لگا ہوا ہوں۔کافی سارا کام نمٹا لیا ہے۔امید کرتا ہوں کہ اب آپ کے مضامین کے مجموعہ ''حاصلِ مطالعہ'' کی اشاعت میں میری وجہ سے تاخیر نہیں ہو گی۔ **سعید شباب** (خانپور)

جدید ادب کا شمارہ:۵ اس بار پروفیسر نذر خلیق صاحب پاکستان کے توسط سے موصول ہوا۔۔۔۔ہر شمارہ کی طرح اس بار بھی جدید ادب اپنی پوری رعنائی کے ساتھ نکلا ہے۔تمام مضامین نثر و نظم کا انتخاب آپ بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ایک تخلیق بھی اس شمارہ میں ایسی نہیں جس کو جدید ادب کے مزاج سے ہم آہنگی نہ ہو۔آپ حضرات جس طرح غیر اردوداں طبقہ میں اردو کے چراغوں کو روشن رکھے ہوئے ہیں وہ آپ کا ہی حوصلہ ہے۔اللہ ان چراغوں کو تمام آندھیوں سے بچائے۔**رئیس الدین رئیس**۔علی گڑھ

جدید ادب میں اس بار بھی دلچسپ مواد ہے۔آجکل حسبِ معمول بہت مصروف ہوں۔اگلی چھٹیوں میں تفصیل سے

لکھوں گی۔ **ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ**۔ہائیڈل برگ، جرمنی

مائی ڈئر قریشی صاحب! یقین مانئے ''گو میں رہی رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہی'' یہ سال عجیب وغریب دوڑ دھوپ اور سفروں کا سال رہا۔مارچ میں پاکستان عالمی اردو کانفرنس کے لیے گئی، ایک مہینہ وہاں رہی۔اسلام آباد، لاہور اور کراچی کی یونیورسٹیوں اور طرح طرح کے ادبی اداروں میں کم از کم آٹھ دس لیکچرز، تقریریں، گفتگو ہوئی۔اگست میں کینیڈا میں سجاد ظہیر سیمینار میں شرکت کی اور ٹورنٹو وغیرہ میں کوئی بیس دن رہی تھی۔آج ہی ہندوستان سے ڈیڑھ مہینوں بعد آئی ہوں۔ابھی تک سامان کھولا نہیں۔بھارت میں بھی کئی کانفرنس اور سیمیناروں میں شرکت کی اور مقالے بھی پڑھے۔بیچ بیچ میں یہاں بھی امّی کے پاس پیٹرس برگ جایا کرتی تھی۔اس طرح آنے جانے، مقالوں کی تیاری کرنے اور سامان باندھنے اور کھولنے میں تقریباً پورا سال نکل گیا۔ابھی تھوڑا بہت ہوش میں آؤں گی اور ایک دو روز میں آپ کو لکھوں گی۔سجاد ظہیر پر ایک مقالہ کینیڈا میں پڑھا تھا۔اس کی بنا پر ایک مضمون بھی تیار کیا تھا۔اس کے علاوہ فیضؔ پر اردو میں کچھ لکھا ہے۔دو ایک روز میں آپ سے رابطہ کروں گی۔بہترین تمناؤں کے ساتھ **ڈاکٹر لڈمیلا واسلویا**۔ماسکو روس

جدید ادب کا تازہ شمارہ نمبر ۵ (۲۰۰۵ء) موصول ہوا۔پروین شیر نے سرورق دلکش بنایا ہے۔پروین اپنی پدھری شاعری کی طرح فنِ مصوری میں بھی کمال و جمال دکھا رہی ہیں۔آپ کا جدید ادب جدیدیت سے مالا مال تو ہے ہی، لیکن شمارے کے آغاز میں حصہ حمد ونعت میں ''انا بعد العسر یسرا'' شائع کر کے آپ نے اپنی جدیدیت اور قریشیت کا بھی ثبوت دے دیا ہے۔

مجھے ''انا بعد العسر یسرا'' کے اشعار نے عجب سرشاری عطا کی ہے۔یہی سرشاری مجھے ''نہج البلاغہ'' کی قرات کے دوران ملی تھی۔یہی سرشاری جدید ادب کے صفحہ اوّل سے ادبی حظ اٹھاتے ہوئے محسوس ہو رہی ہے۔اوّل کی تخلیق صفحہ اوّل پر ہی اچھی لگتی ہے۔شاہِ مردان کے اس عربی شہ پارے پر آپ اعراب بھی ڈال دیتے تو عام قاری کے لیے تلفظ کی ادائیگی میں آسانی رہتی۔

جوگندر پال پر سبھی لکھنے والوں نے متاثر کیا ہے۔معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اس بار ایک آدھ شعری تخلیق کے سوا حصہ شعری خاصا کمزور اور پھیکا ہے۔شعری انتخاب میں معیار کا خیال رکھیں۔جدید ادب کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ورنہ۔۔؟

محمد حامد سراج کا افسانہ ''طاعون کی چونچ'' اچھا ہے۔سراج جی! طاعون کی وبا اب ادب میں بھی پھیل گئی ہے بلکہ ادب کو طاعون کی چونچ لگ گئی ہے۔اگر آپ افسانے کے کرداروں میں سماجی طاعون کے ساتھ ''ادبی

طاعون'' کو بھی لے لیتے تو افسانہ اور جاندار ہو جاتا۔ افسانہ میں ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق اور دیگر جن مقتول صاحبان کے قتل کا ذکرِ خیر ہوا ہے کہ ان کے قاتل نامعلوم تھے، بھائی میرے! ان سبھی حضرات کے قاتل جانے پہچانے ہیں۔ حامد سراج کو اتنا بے خبر تو نہیں ہونا چاہیے۔ عارف حسینی سے لے کر محسن نقوی تک کے قتل کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ ان کے قاتل کون تھے؟ اسی افسانے میں سے مل جائیں گے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے ''بانجھ لمحے میں مہکتی لذت'' نے مٹھڑی لذت سے نوازا۔ تفصیلی مطالعہ میں اکبر حمیدی، سرور راز، پروفیسر نذر خلیق اور حیدر قریشی کی تحریریں قابلِ مطالعہ ہیں۔ شمارے میں کہیں کہیں کمپوزنگ کی اغلاط کھٹکتی ہیں۔ اس عیب سے کہیں کہیں الفاظ اور جملے غلط سلط ہو گئے ہیں۔ پھر بھی رسالہ اپنے سجرے پن سے مالا مال ہے۔

خانپور کی زرخیز زمین سے جدید ادب کا اُگنے والا پودا جدیدیت کے سات سمندر پار کر کے جدید جرمنی آ پہنچا ہے۔ اب یہ پودا پھل پھول کر سایہ دار شجر بن چکا ہے۔ اس برف پوش کی برفابی چھاؤں تلے بیٹھ کر کتابی اور انٹرنیٹ پر جدید ادب کو جرمنی سے برابر شائع کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ حیدر قریشی یہ ادبی کام خانپور کی یادوں کو اپنے سینے میں رکھتے ہوئے خوب نبھا رہے ہیں۔ خانپور کی یاد میں حیدر قریشی کا ماہیا قارئین کی نذر ہے:

یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

برف پوش **افضل عباس** (اوسلو، ناروے)

''ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ، عصر کا مطالعہ اور آفاقی اقدار کا مطالعہ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن کی یہ رائے مجھے جرمنی سے شائع ہونے والے معتبر ادبی جریدہ جدید ادب کے مطالعہ سے یاد آئی۔ حیدر قریشی اور نذر خلیق کی ادارتی محنتوں نے جسے اپنے زمانے کا آئینہ بنا دیا ہے۔ تخلیقی اسرار آفاقی اقدار کی رفاقت میں اپنے عہد کی صداقت کا اشاریہ بن کر ظہور کرتے ہیں۔ ظاہر پرست دنیا میں تخلیقی آدمی کی لگن اندر کی روشنی کو ایک اور طرح سے نافذ کرتی ہے کہ ظاہر و باطن بیک وقت جگمگا اٹھتے ہیں۔

حیدر قریشی اور جدید ادب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب خان پور کے دور آباد مگر تخلیقی سطح پر شاد آباد علاقے سے ایک پرعزم آواز کی صورت میں ان کا ظہور ہوا تھا۔ ویسے بھی دور آباد علاقوں کی ذہانتیں سرما کے یخ بستہ موسموں میں چاندنی بانٹتے تنہا مگر دلیر چاند کی طرح ہوتی ہیں جن کی ملائم رفاقتوں سے بے نیاز لوگ گرم لحافوں کی آسائشوں میں مگن، بے خبر، اپنی آرائشوں کے تصنع میں محصور پڑے ہوتے ہیں اس حقیقت سے قطعی لاعلم کہ ان کے صحنوں کے آسمان پر کیسے کیسے خوبرو منظر تخلیق پا رہے ہیں اور ان کی زمین کی آغوش میں کیسی دلنواز تخلیقی رتیں نور و سرور تقسیم کر رہی ہیں۔

کون اٹھ کر دیکھتا آنگن میں پھیلی چاندنی
ہم دسمبر کی شب یخ بستہ کے مہتاب تھے

مگر یہ بھی ایک آفاقی حقیقت ہے کہ چاندنی کی مسلسل دستک سے دلوں کے بند دروازے بھی کھل جایا کرتے ہیں کہ سدا سے کامرانی استقامت اور استقبال کی ہم معنی رہی ہے چنانچہ حیدر قریشی اور نذر خلیق کی محنتیں بھی رنگ لائیں اور ان کے کام کی روشنی میں ان کے نام کو بھی اجالے سے بھر گئی۔ جو نام اپنے کام سے دوام پاتے ہیں ان کی اہمیت کم نہیں ہوا کرتی اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ سچی محنتیں اور محبتیں کبھی رائیگاں نہیں جایا کرتیں ''جدید ادب'' ادب کا اعتبار ایک تخلیقی وقار کی رفاقت میں بشارت کی طرح چمک رہا ہے۔ رب کرے کہ یہ لوگ اسے ہمیشہ قائم رکھ سکیں۔

ماضی پرست نہ ہونے کے باوجود گئے دنوں کی روشنیوں سے چراغ لانا کبھی کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے یادوں کے اجالوں کی بھی تو اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے جو میں نے آپ کے دامن میں لا ڈالی ہے اب آیئے آج کی طرف جدید ادب کا زیرِ نظر شمارہ (جولائی دسمبر 2005ء) سنجیدہ ادب کے قاری کو تخلیقی مہک رکھنے والے لکھاری نے بڑے اہم مسئلہ کی نشاندہی کی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔'' اپنی قوم اور معاشرے کی خیر خواہی کا جذبہ رکھنے والے چینلز کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مختلف کمرشل پروگراموں کے ساتھ معیاری اردو ادبی پروگرام بھی شروع کریں۔ میڈیا کر شاعروں اور ادیبوں والے پروگرام نہیں بلکہ واقعتاً تخلیقی ادب کی تازہ ترین صورت حال کی عکاسی کرنے والے پروگرام شروع کریں۔''

ہمارے چینلز جس بری طرح اقربا پروری حلقہ بندی اور دوست نوازی کی مثالیں پیش کرتے چلے جا رہے ہیں اور بار بار دیکھے دکھائے چہرے اور رٹے رٹائے اشعار دکھا سنا کر سامعین کو بور کر رہے ہیں، اگر عدل پسند آنکھ رکھنے والا کوئی صاحب اختیار ان میں ہو تو شاید صورت حال کچھ بہتر ہو ورنہ اسی تنخواہ پر گزارا ہوتا رہے گا، کے مصداق لکیر کے فقیر لکیریں پیٹتے رہیں گے۔ جدید ادب کے اس شمارہ میں باب مدینۃ العلم کی نظم، احمد ہمیش کا مضمون ''برائے کہانی ناگزیر فتویٰ'' جس پر کئی فتوے لگائے جا سکتے ہیں، مشفق خواجہ کی یاد میں سلطان جمیل نسیم کا مضمون آواز نہیں ہوتی۔ جوگندر پال کی 80 ویں سالگرہ پر خصوصی تحریریں، صبا اکبر آبادی، تاجدار عادل اور آفاق صدیقی کی غزلیں محمد حامد سراج اور سہیل احمد صدیقی کے افسانے میرا جی، وزیر آغا اور حمایت علی شاعر کی نظمیں اور منشا یاد سے انٹرویو خاصے کی چیزیں ہیں اور سرورق پر ایک ماہیا!!!

میں اک ازلی، راہی
ساتھ نہ ہو یونہی
پھر سوچ لے چن ماہی

محمد فیروز شاہ (میانوالی) **مطبوعہ روزنامہ ''پاکستان'' ۲۰/اکتوبر ۲۰۰۵ء**